شام کنارے

فاخرہ جبیں



ں لفظ

تخلیق کا عمل آسان تو نہیں البتہ اطمینان بخش ضرور ہوتا ہے۔ ''شام کنارے''
ی سب سے لاڈلی کتاب ہوگی۔ اس لئے کہ یہ میری پہلی کتاب ہے اور اس لئے
ں کہ اس میں شامل کہانیوں کو میں نے تب لکھا جب میرے دل نے کوئی چوٹ کھائی،
ئی درد سہا، کسی سے متاثر ہوا، کسی خواب کو حقیقت میں بدلتے اور کسی خیال کو مجسم
رت میں دیکھا۔

اور ان کہانیوں کے کردار تو دل کے بہت ہی قریب ہیں۔ معاشرتی عدم مطابقت کا
ار رفاقت حسین چودھری، شام کنارے کی وہ اَن چھوئی سی لڑکی، غم کا بوجھ اٹھانے سے
صر کا کا جان، منی خالہ اور نور۔ ان سب کرداروں کو میں نے بڑی چاہت سے لکھا۔

اُمید ہے آپ بھی اسی چاہت سے ان سے ملیں گے۔

راس تنویر اور علی بھائی! شکریہ! کہ آپ لوگوں کی بدولت ہی یہ بھولی بسری کہانیاں
یک بار پھر کتابی صورت میں منظر عام پر آئیں۔

دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

فاخرہ جبیں

فہرست

شام کنارے...................... 7

ریزہ ریزہ ہوئے پھول...................... 14

دل کے موسم...................... 94

ہم جو کہلائے طلوعِ ماہتاب...................... 164

ہم ہیں تہی داماں لوگو!...................... 242

بخت آور...................... 299

پیاسے سات سمندر...................... 333

شام کنارے

وسط جولائی کی طویل دوپہر بارش میں بھیگتے رہنے کے بعد اب گلابی ہو چلی تھی۔ فٹ پاتھ املتاس کے زرد پھولوں سے اٹا ہوا تھا، کچھ بچے ان زرد پھولوں میں دفن مردہ تتلیوں کے رنگین پروں کو کھوج رہے تھے۔ ان کے عقب میں کتابوں کی ایک دکان تھی، جس کے شیشے لگے دروازوں پر کلوز کے حروف سرخ رنگ اداسی میں ڈوبے دروازے سے باہر جھانک رہے تھے۔

کچھ بے حد پرانی خستہ صفحات والی کتابیں، جن کی کہانیاں اب اپنے مفہوم کھو چکی تھیں۔

کچھ ڈھکی جلدوں والی کتابیں...... جنہیں محبت آشنا ہاتھوں نے سینکڑوں بار پڑھا اور انہیں معتبر کر دیا تھا۔

کچھ بالکل نئی...... ان چھوٹی کتابیں جن کے سیاہ حروف بڑی تمکنت سے سفید کاغذوں پر جگمگا رہے تھے۔

میلے کاؤنٹر پہ کھچڑی بالوں والا سر رکھے، بڑی دیر سے اونگھتے بوڑھے کتب فروش نے اپنا سر اٹھا کر ایک لمبی سی جمائی لی اور غائب دماغی سے اپنے اطراف میں دیکھنے لگا۔ بوسیدہ دکان میں بارش کی نمی نئی و پرانی کتابوں میں چھپی بیٹھی تھی اور نہایت اونچی چھت کی کڑیوں سے پھوٹتی تاریکی پنکھوں کی سرسراہٹ کے ساتھ ساری دکان میں چکراتی پھر رہی تھی۔

اپنے اسٹول پہ سیدھا ہوتے ہوئے اس کتب فروش نے اپنی گدلی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کچھ ادھورے خواب اپنی بوڑھی پلکوں سے جھاڑے اور پھر اسٹول سے اتر کر کاؤنٹر سے باہر نکل آیا۔ اس کی چال میں غنودگی کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

شیشے لگے دروازے کے دونوں پٹ کھول کر اس نے Close کی تختی الٹ دی۔

Open کے شرارت بھرے حروف نے کتنے ہی راہ چلتے لوگوں کو آنکھیں مار کر اپنی طرف

متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر لوگ مگن تھے۔ کسی نے بھی خاص توجہ نہ دی تھی۔

بوڑھے کتب فروش نے باہر آنے والی تیز نم آلود ہوا کو لمبی سانس کے ذریعے اپنے پھیپھ میں بھرا اور پھر مایوسی سے سر ہلا دیا۔

''بے محبتی کے احساس نے شہر کی فضاؤں کو بنجر کر دیا ہے۔ پھولوں کی خوشبو مردہ ہوگئی ہے پرندوں کی بولیاں مٹھاس سے عاری ہیں''۔

زیرلب بڑبڑاتے ہوئے بوڑھا کتب فروش پلٹا اور ایک بار پھر اسی اسٹول پر بیٹھ کر با پاتھ پہ کھڑے لڑکے کو دیکھنے لگا' جس کے ہاتھوں میں پکڑے گجروں کے پھول کملانے لگے تھے۔

''اس بے وفا صدی نے لوگوں سے محبت کا اعتبار چھین لیا ہے۔ رشتوں میں چاہت چاہت میں خلوص ناپید...... بناوٹ، مادیت اور جھوٹی اداؤں کے نوکیلے پنجوں کا زہر دلوں کو آلو گیا ہے۔ کتنے دن ہوگئے، یہ کتابیں محبت بھرے لمس کے انتظار میں ہیں۔ ان میں چھپے کردار ہونے کا ثبوت مانگتے ہیں مگر۔'' بوڑھے کتب فروش نے مایوسی سے الماریوں میں بھری کتاب دیکھا، جن میں چھپے حروف اپنے معانی کھوجنے والی آنکھ کے انتظار میں گم صم بیٹھے تھے۔

ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اس نے سر جھٹکا اور کاؤنٹر پہ پڑی کتابیں اپنے قمیص کے دامن جھاڑ جھاڑ کر الماری میں سجانے لگا۔

تب ہی کھلے دروازے سے چنبیلی کی خوشبو دبے پاؤں اندر چلی آئی۔

بوڑھے کتب فروش نے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جس' کا لمبا سراپا سیاہ رنگ لبادے میں چھپا ہوا تھا۔ سیاہ دوپٹے ہالے میں اس کا سپید چہرہ پرسکون اور خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ پیروں میں سیاہ ڈوری چپل۔ جیسے سفید نوخیز کبوتروں کو بڑی محبت سے سیاہ جال میں مقید کر رکھا ہو۔

قریب آکر اپنے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر دھرتے ہوئے اس نے بوڑھے کتب فروش کو مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا اور پوچھنے لگی۔

''کیا یہ کچھ کتابیں دیکھ سکتی ہوں۔''

مخملیں ہاتھوں پہ سجی فالسئی رنگ کی نیل پالش سے نگاہ ہٹاتے ہوئے کتب فروش نے اثبا میں سر ہلایا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

کتابوں کی جھاڑ پونچھ کے دوران وقتاً فوقتاً نگاہ اٹھ کر اس لڑکی کو بھی سرسری نگاہ سے دیکھ لی تھا' جو بے آواز قدم اٹھاتی، ہر کتاب کو اس محبت سے چھو رہی تھی' جیسے وہ کوئی مقدس صحیفے ہوں۔ کچھ

دیر میں وہ لڑکی انہی کتابوں سے نکلا ہوا کوئی کردار محسوس ہوتے ہوئے اس دکان کی بوسیدگی کا بن گئی تو بوڑھا کتب فروش اسے بھول کر پھر سے کتابوں کی ترتیب درست کرنے لگا۔ اس کام ے فارغ ہو کر اس نے اپنی جیب سے کشمش کے چند دانے نکالے اور انہیں دیر تک چباتے رہنے بعد مٹی کا پیالہ پانی سے بھرا اور گھونٹ گھونٹ پانی پیتے ہوئے اپنے خیالات میں غرق ہوگیا۔

کھلے دروازے کے اوپر دکان کی دیوار پہ ٹنگے بدرنگ کلاک کی متحرک سوئیوں نے شام کے انچویں گھنٹے کی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں میں پورے تیس منٹ کرا دیئے، تب اس بوڑھے دکاندار کو بھولی وئی لڑکی کی یاد آئی' وہ لڑکی کتابیں دیکھتے دیکھتے کاؤنٹر کے قریب آچکی تھی۔

بوڑھے کتب فروش نے اس لڑکی کے زردی مائل سپید چہرے پر سجی سیاہ آنکھوں کو دیکھا' جن کے زریں کنارے بے خوابی کے سرخ رنگوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہلکا براؤن رنگ کسی خواب انگیز لمحے کی مانند اس کے پپوٹوں پہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے پلکیں اٹھا کر کھلے دروازے سے باہر دیکھا اور پھر بوڑھے کتب فروش کو دیکھ کر ذرا سا مسکرا دی۔ گلابی ہونٹوں پہ ابھرنے والی مسکراہٹ کا حسن دائمی تھا۔

''شاعری کی نئی کتاب آئی ہے ''محبت کی ایک نظم'' آپ کے پاس ہوگی؟'' اس لڑکی کی آواز میں کسی کلاسیکی شاعر کی غزل جیسا رچاؤ اور سادگی تھی۔

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں'' بوڑھا کتب فروش اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پلٹا۔

تب ہی دکان کے کھلے دروازے سے کوئی سایہ سا اندر داخل ہوا۔ بھیگی ہوا کا جھونکا بھی ساتھ ہی چلا آیا تھا۔

کتب فروش نے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو پلٹ کر اس جوان کو دیکھا' جو اپنے گھونگھریالے بالوں میں اٹکے پانی کے شفاف قطروں کو بڑی بے دردی سے جھٹک رہا تھا۔ اس کا لباس قدرے گیلا تھا اور جوتے کیچڑ میں لت پت۔ لمبی ڈوری والا براؤن تھیلا اس کے کاندھے سے لٹک رہا تھا۔

''بارش دوبارہ شروع ہوگئی ہے۔''

لڑکی اور کتب فروش دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اس نوجوان کو مگر وہ کسی سے بھی خاص طور پر مخاطب ہوئے بغیر کاؤنٹر پہ پڑی کتابوں سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔

کتب فروش نے ''محبت کی ایک نظم'' نکال کر لڑکی کے سامنے رکھی۔ سرخ گلابوں سے سجے سرورق کو بہت اپنائیت سے چھوتے ہوئے اس لڑکی نے کتاب کھول کر چند اوراق دیکھے اور پھر کسی گہرے دھیان میں گم ہوگئی۔

بوڑھا کتب فروش اپنی جگہ سے اٹھ کر دکان کی بتیاں روشن کرنے لگا تھا۔

"میں اس پر کچھ لکھنا چاہتی ہوں' مگر میری لکھائی اتنی اچھی نہیں۔ کیا آپ؟"

بوڑھے کتب فروش نے اپنے عقب میں وائلن کے سروں جیسی میٹھے درد میں لبریز آواز
جانے کیوں باقی بتیاں جلانا بھول کر ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

وہ لڑکا ریک میں لگے چند ادبی رسالے دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کی بات پر اس نے کند
اچکائے اور اس کے قریب چلا آیا۔ اپنی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے کے بعد اس کا ہاتھ بش شرٹ
اوپری جیب میں رکھے قلم سے ٹکرایا تو وہ خوامخواہ ہی ہنس دیا۔

"ضرور...... کیوں نہیں۔"

خوبصورت سا قلم ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے کہا تو نوجوان کی ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو
چھپا تل کھل کر مسکرا دیا تھا۔

کتاب اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے اس نوجوان نے قلم سے ٹپکتی سرخ روشنائی کو ایک
خوشبودار رومال میں جذب کیا اور قلم کی نوک کتاب کے پہلے صفحے پر رکھ دی۔

"لکھیے۔" لڑکی کاؤنٹر کے سامنے پڑے اسٹول پر ٹک گئی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔
سیاہ دوپٹہ سر پر سے ڈھلک گیا تھا اور سیاہ بالوں کے بیچ نکالی گئی شفاف مانگ جگمگا ر
تھی۔

فضا میں جیسے کوئی خوشبوؤں کا رقص جاگا ہے
سنہری تتلیاں پھر سے گلابوں کے لبوں کو چھو کے آئی ہیں
درختوں کی کھلی بانہوں میں سائے بات کرتے ہیں
اداسی اشک آنکھوں میں لیے اب دور نکلی ہے

لڑکے نے قلم ذرا سا روکتے ہوئے ترچھی نگاہوں سے اس لڑکی کی جانب دیکھا اور اس لڑکی
کے چہرے پہ سرخی یوں پھیلی تھی' جیسے کسی نادان نے مٹھی بھر غازہ اپنے چہرے پر مل لیا ہو۔

اسی ڈھلتے ہوئے دن کی منڈیروں پر
میرے آنچل کے کونے سے وفا' ایک لمحہ باندھ دیتا ہے
میرے صحن ہنر میں حرف و معنی کی تلاوت سانس لیتی ہے

بوڑھا دکاندار کسی ان جانی' پراسراری خوشبو کے زیر اثر بندھا کھڑا تھا۔ قدیم رومانوی ناولوں
کے راجہ جیسا وہ لمبا تڑنگا نوجوان اپنی سحر انگیز آنکھوں میں تبسم کی لہر لیے اپنے قلم کو مصور کے برش کی

چلاتا لفظوں کی تصویریں بناتا چلا جا رہا تھا۔

اور

وہ لڑکی......

کسی محبت کدے کی سرمئی دیواروں پہ ٹنگی تصویر کی مانند مبہوت و بے خود بیٹھی تھی۔ سہ پہر رنگ
میں ڈھلی اس کی آواز طویل راہداریوں میں سرگوشیاں کرتی ہوا کی سرسراہٹوں جیسی تھی اور کتابوں
کی مخصوص باس میں گھل مل سی گئی تھی۔

کوئی روشن ستارہ آسمان پہ مسکراتا ہے
سمندر گیت گاتا ہے
کمال عہد مستی ہے
جہاں پر موسم بھی بہت حیران لگتا ہے
کوئی چہرہ میرے دل کے بدن سے آن لگتا ہے
یہی چپکے سے کہتا ہے
"مجھے تم سے محبت ہے"
"مجھے تم سے محبت ہے"

لڑکی خاموش ہوگئی تھی۔

بوڑھے کتب فروش نے جیسے گہری نیند سے بیدار ہو کر اس لڑکی کو دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی پہ سیاہ
تل جگمگا رہا تھا اور سکون آشنا چہرہ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔

لڑکے نے قلم اور کھلی کتاب اس لڑکی کی طرف بڑھا دی۔

اس لڑکی نے قلم کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے لبوں سے ذرا سا چھوا۔

"ان لفظوں کی خوشبو سے تو قلم بھی مہکنے لگا ہے۔" اس نے جیسے خود سے سرگوشی کی۔

پھر کھلی کتاب پہ لکھی نظم کے آخر پہ لکھا۔

"کائنات عبدالرحمٰن۔"

یہ چند ستارے تھے' جو اس نے روشنائی کے سرخ دھاگے کے کتاب پر کاڑھے تھے۔

"کتنے روپے؟" بند کتاب کاؤنٹر پہ رکھتے ہوئے اس نے بوڑھے کتاب فروش سے پوچھا۔

"ایک سو اسی روپے۔"

اس لڑکی نے سیاہ بیگ کھولا اور ایک طرف بہت احتیاط سے رکھے گئے روپوں میں سے ایک سو

اسی روپے نکال کر بوڑھے کتب فروش کے سلوٹ زدہ ہاتھوں میں دیئے پھر ہاتھ میں پکڑا قلم بیگ میں رکھا اور خدا حافظ کہتے ہوئے ہوا کے سبک خرام جھونکے کی مانند دکان سے باہر نکل گئی۔

بوڑھے کتب فروش نے روپے دراز میں رکھے اور کاؤنٹر کی طرف پلٹا پھر ایک پل کو ٹھٹک سا گیا۔

وہ لڑکی اپنی کتاب کاؤنٹر پر ہی بھول گئی تھی۔

"ارے......وہ......یہ......" کتب فروش بری طرح ہکلایا۔

تب ہی شیشے سے باہر گرتی بوندوں پہ نگاہ جما کر کھڑا وہ لڑکا ذرا سا چونکا اور کاؤنٹر کی طرف کھڑے متحیر کتب فروش کو دیکھا۔

بوڑھے کتب فروش نے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ نوجوان پہلے ہی مسکرا دیا۔ بوڑھے کتب فروش نے بغور دیکھا۔ اسے لگا اس لڑکے کی مسکراہٹ میں وہی لڑکی چھپی بیٹھی ہے، جو اب سے کچھ دیر قبل بوندوں میں املتاس کے پھولوں کو اپنے قدموں تلے آنے سے بچاتی ہوئی ان دونوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

اس لڑکے نے کاؤنٹر پہ پڑی کتاب دونوں ہاتھوں میں یوں احتیاط سے تھامی جیسے اس پہ بنے گلابوں کی پتیوں کے بکھر جانے کا ڈر ہو، پھر اس کتاب پہ ایک طویل بوسہ ثبت کرتے ہوئے اسے اپنے تھیلے میں رکھا۔ اس تھیلے کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹے کسی قیمتی متاع کی طرح سینے سے لگائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا دکان سے باہر نکل گیا۔

بوڑھا کتب فروش بے اختیار قدموں سے اس کے پیچھے چلتا ہوا شیشے لگے دروازے تک آ کھڑا ہوا۔

وہ نوجوان فٹ پاتھ پر اپنے ہی قدموں کو گنتا چلا جا رہا تھا۔

گہرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا اور شام میں سرمئی رنگ گہرا ہونے لگا تھا۔

املتاس کے زرد پھولوں کی بارش میں وہ نوجوان بوڑھے کتب فروش کو اپنی گزشتہ عمر کے کسی گمشدہ حصے کی مانند لگا تھا۔

وہ کسی ننھے بچے کی طرح شیشے سے ناک چپکائے باہر جھانکتا رہا پھر پلٹ کر اپنے کاؤنٹر پہ آیا اور مسکراہٹ خود بخود اس کے ہونٹوں پہ بکھر گئی۔

اس نے اپنی دراز کھول کر آج کی واحد کمائی نکالی۔

ایک سو اسی روپے۔

اس نے الماری سے ایک بکس نکال کر کھولا۔

یہ بکس محبت کی چند نشانیوں کو اپنی کوکھ میں جنموں سے لیے بیٹھا تھا۔

اس میں چند خشک پھول اور ان کی حنوط شدہ مہک تھی۔

کسی کتاب کے صفحے پہ لکھا کوئی اجنبی ٹیلی فون نمبر تھا۔

تاریخ کی کتاب سے نکلا کوئی بھولا ہوا محبت نامہ

سرخ روشنائی سے بنا دل اور دل میں گڑا سیاہ تیر

مور کا ایک پر۔ جس پر لفظ "محبت" کے ہجے ابھی بھی روشن تھے۔ لہو سے لکھا گیا ایک سیاہ پڑتا لوہ۔

اور......یہ......

ایک سو اسی روپے

بوڑھے کتب فروش نے بڑے احترام سے وہ روپے بکس میں رکھے اور اسے پھر سے الماری میں بند کردیا اور کاؤنٹر پہ سر رکھ کر دوبارہ سے اونگھنے لگا۔ دکان کی پچھلی دیوار سے بارش کا پانی رسنے لگا تھا۔ دکان کے بند روشندان پہ کسی بھیگے پروں والے پرندے نے آ کر چند ٹھونگیں ماریں اور پھر وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ کتابوں کی سیلن زدہ مہک آزاد ہو کر پوری دکان میں چکرانے لگی تھی۔ باہر بارش تیزی سے برسنے لگی تھی۔ آسمان کے سرمئی کنارے سیاہ پڑ گئے تھے۔ فٹ پاتھ پر املتاس کے زرد پھولوں کے ننھے کتبے بن گئے تھے جس میں دفن مردہ تتلیوں کے رنگین پروں کو کھوجنے والے بچے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے۔



ریزہ ریزہ ہوئے پھول

کتنے دن ہیں ہم دست قضا کے ہاتھوں
کیا گزرتی ہے محبت پہ جفا کے ہاتھوں
کیسی بے درد ہوا چلتی ہے گلشن میں کبھی
باغ اجڑ جاتے ہیں اس تند ادا کے ہاتھوں
جن کی خوشبو سے مہکتا تھا کبھی صحن چمن
ریزہ ریزہ ہوئے وہ پھول خزاں کے ہاتھوں
ڈھونڈتی پھرتی ہے بچھڑے ہوئے گل کو بلبل
خون ہو جاتا ہے دل اس کی صدا کے ہاتھوں

"آہ......!" وہ درد نہیں، کوئی تیر نشتر تھا' جو اس کے پورے بدن کو پل بھر میں سرتا پا کا
گیا تھا۔ اس کے لبوں سے سسکاری نکلی تو پھر ضبط کا یارا نہ رہا۔ بے اختیار اس کے حلق سے دکھ
تکلیف سے لبریز بے معنی آوازیں، نکلتی چلی گئی تھیں۔

اسے لگ رہا تھا، بدن میں ہزار ہا انیاں دل میں پیوست ہیں اور دل ہر سانس کے ساتھ
پناہ دکھ اس کی شریانوں میں انڈیلتا چلا جا رہا ہے۔

جسم کا ہر عضو حرکت سے عاری ہے تو پھر یہ درد کیوں انگلیوں کی پوروں تک دوڑا چلا جا
ہے۔

اپنی کراہیں تھم جانے کے بعد اس نے خود کو مزید بے دم محسوس کیا' لیکن ذہن پہ چھایا غبار
ہی آہ و بکا سے ایک لمحے کے لئے چھٹتا سا محسوس ہوا تھا۔

اس نے لب بھینچ کر بے تحاشا اذیت کے ان لمحوں سے زندگی کشید کرتے ہوئے بمشکل سانس
ہینچ کر اپنے کھوکھلے سینے میں بھری اور باہم پیوست پلکوں کو بہ دقت تمام ایک دوسرے سے جدا
رتے ہوئے باہر کے منظر کو کھوجنا چاہا۔ سامنے اندھیرا تھا۔

گہری رات۔

گھور تاریکی۔

زندگی کو نگل لینے والی بھیانک دلدوز تاریکی، مہیب سناٹا۔

قرب و جوار میں کوئی آواز نہ تھی ...... جو زندگی کا پتہ دیتی۔ صرف اپنی ٹوٹی پھوٹی سانسوں کی
جاری سرسراہٹ تھی' جو اس کے نیم بے ہوش ذہن کو چونکا ...... جاتی تھی۔

اس نے اپنی آنکھیں کچھ اور کھولیں۔

منظر تب بھی نہ بدلا تھا۔

دل و دماغ کے کونے کھدروں میں چھپی دہشت کسی مکار گدھ کی طرح اس پہ ٹوٹی اور رہے
ہے حوصلوں کو اپنی مکروہ چونچ سے چھیدنے لگی۔

"اتنا اندھیرا ...... اتنا گہرا اندھیرا کیوں ہے ......؟ میں کہاں ہوں اور یہ بوجھ کیسا ہے' جو
میرے بدن کو چٹخائے دے رہا ہے۔"

اس نے محسوس کیا کہ اس کی زبان خشک ہے اور اکڑ چکی ہے۔

"میں زندہ ہوں ......؟" اس کا دماغ اس کی سوچوں کا ساتھ دینے سے قاصر تھا اور دل ......
جیسے رک رک کر دھڑک رہا تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ، اپنے پیروں کو جنبش دینے کی کوشش کی' مگر درد کی تیز لہر اسے ساکت رہ
جانے پر مجبور کر گئی تھی۔

"آہ ......" یہ تکلیف اس کے تصور، اس کے حوصلے سے بڑھ کر تھی ...... نیم جاں بدن کے کسی
عضو کو حرکت دینا اس کے بس میں نہیں تھا ...... وہ ڈھیلے جسم کے ساتھ مفلوج سی درد کی کربناک
لہروں کے تھم جانے کا انتظار کرتی رہی ...... ہلکی ہلکی غنودگی اس کے احساسات کو ایک بار پھر منجمد
کرنے لگی تھی۔ حلق میں کانٹے اگے ہوئے تھے اور آنکھ کی ذرا سی جنبش سے باریک، مہین مٹی کے
ذرات اسے اپنے پورے چہرے پر برستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

تب وہ ذرا سا چونکی۔

اسے اندازہ ہوا کہ وہ منوں مٹی تلے دفن ہے۔ اس کے نتھنے مٹی سے بھرے ہوئے ہیں اور منہ

میں خون کا ذائقہ۔

"کیا میں مر چکی ہوں......؟ یہ قبر......کیا یہ میری قبر ہے......؟ نن......نہیں۔ میں ز
ابھی میں زندہ ہوں وہ اپنی بچی کھچی توتوں کو مجتمع کر کے چلائی تھی۔"

"میں جی رہی ہوں......میری سانسیں آجا رہی ہیں......یہ درد، یہ تکلیف میرے ج
ریشہ ادھیڑ رہی ہے۔ میں محسوس کر رہی ہوں۔ میں جی رہی ہوں۔ مجھے نکالو، یہ قبر میری نہیں
نکالو خدارا، خدا کے لئے مجھے نکالو۔"

دکھ اور خوف کی شدت سے وہ ٹوٹ کر روئی تھی۔

مگر ایک آنسو بھی اس کی آنکھ کی دہلیز پار نہ کر سکا۔

آواز کے ساتھ ساتھ دل بھی ڈوبتا چلا گیا تھا۔

اس نے سینے میں اٹکی ہوئی سانسیں کھینچنے کی کوشش کی، مگر وجود میں دم نہ تھا......ہمت ز
چکی تھی۔

نڈھال ہوتے ہوئے اس نے خود کو اس اندھیری قبر میں نیچے بہت نیچے گرتے ہوئے
کیا تھا۔



پڑھتے، پڑھتے دل اچاٹ ہو گیا تو ساری کتابیں، فائلیں بند کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی
لاپروائی سے کندھوں پہ بکھرے بالوں کو سمیٹ کر کلپ میں مقید کرتے ہوئے اس نے کھڑکی
باہر جھانکا۔

دھوپ ڈھلنے کے قریب تھی۔

فضا خاموش، درخت اداس اور مغموم۔

پرندوں کی بولیاں چہکار سے عاری۔

گیٹ پر کھڑا چوکیدار بندوق کی نال پر ٹھوڑی ٹکائے جانے کس سوچ میں غرق تھا۔ جان
کیاریوں میں سر جھکائے مسلسل گوڈی کیے جا رہا تھا۔

مخلوق خدا کی بے چارگی و بے بسی کا احساس شدت سے دل پر حاوی ہوا تو وہ بوجھل قدمو
سے اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔

"اس سانحے نے دلوں سے گویا زندگی کی رمق ہی چھین لی ہے۔" گھر میں پھیلی خاموشی
خائف ہو کر اس نے تائی امی کے کمرے کا رخ کیا، مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔

"اماں کے تو سونے کا وقت تھا۔ تائی اماں خدا جانے کیا کر رہی ہوں گی۔" اس نے مایوس ہو
سوچا۔

عام طور پر وہ اس وقت باورچی خانے میں زور و شور سے افطاری کی تیاریوں میں مصروف ہوا
تھیں۔

آثار ان کے قریب بیٹھا دہائیاں دیا کرتا۔

"اتنا کم وقت رہ گیا۔ ابھی تک چولہا نہیں جلا۔ پکوڑوں میں آلو کم کیوں ہیں؟ فروٹ چاٹ
ں کیوں نہیں اور یہ کاہل لڑکی کہاں پڑی سو رہی ہے؟ ملک شیک کون بنائے گا......؟"

تایا ابا تسبیح روک کر کبھی اسے ڈانٹتے کبھی بس مسکرائے چلے جاتے۔

ٹی وی پر درس و تدریس کے پروگرام اونچی آواز میں جاری رہتے...... برآمدے میں دسترخوان
نے کی تیاریوں میں مصروف ملازم اپنے اپنے کام نمٹائے بھاگے چلے آتے ہیں۔ ان کی افطاری
الوں سے پہلے ان کے دسترخوان پر پہنچتی تھی۔

ذی وقار اسکول سے واپسی پر سارا وقت سو کر روزہ پورا کرتا تھا۔ ایسے وقت میں بی بی نیرا سے
وضو کرائے اپنی گود میں لئے بیٹھی ہوتیں...... وہ لمبے قد کا چودہ پندرہ سالہ نوجوان ننھے بچے کی
لاڈ اٹھواتا تھا اس سے۔

مگر آج تو منظر ہی کچھ اور تھا۔

ساری چہل پہل ندارد...... سارے ہنگامے سرگزشتہ روز آنے والے زلزلے نے جو قہر برپا
ا۔ وہ دلوں کو خوف خدا کے ایسے حصار میں جکڑ گیا تھا، جہاں توبہ استغفار کے سوا کچھ اور سجھائی
ے رہا تھا۔

آثار امدادی فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے صبح کا نکلا اب تک نہ لوٹا تھا۔

ذی وقار اسکول میں تھا جب زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے گئے۔ بھگدڑ مچی تو زین العابدین اسی
اسے اسکول سے جا کر لے آئے تھے۔ وہ تب سے اب تک جائے نماز پر تھا۔

زمین بھی تو ایک پل کے لئے یوں دہلی تھی، گویا کسی چیز کو اس کے مقام پر رہنے نہ دے گی۔

بڑے کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا۔ اس نے راہداری سے گزرتے ہوئے یونہی اندر جھانکا۔

تایا ابا کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح ساکت تھی......شدت ضبط سے سرخ آنکھیں ٹی وی اسکرین پر
چپک سی گئی تھیں۔

ایک سے بڑھ کر ایک دلدوز منظر۔

کرچی کرچی مکانات۔

خستہ حال بدن۔

بے گوروکفن لاشیں۔

"تایا ابا کی بوڑھی آنکھوں میں یہ سب دیکھنے کی تاب کہاں......؟"

نین تارا نے اس کے لرزتے ہاتھوں سے تسبیح چھوٹتے دیکھی اور اگلے ہی پل وہ ہچکیاں
ہوئے سجدے میں گر گئے تھے۔

"توبہ استغفار......توبہ استغفار......توبہ استغفار، رحم کر میرے مالک، رحم کر میرے
رحم کر ہم گناہ گار آزمائے جانے کے لائق نہیں......معاف فرما دے میرے مولا......بخش
ہمارے گناہوں کو۔ تو رحیم ہے پروردگار، تو کریم ہے۔ ہم پر رحم فرما۔" ان کا ناتواں وجود خدا
جبروت سے خائف لرز لرز گیا تھا۔

نین تارا کے لئے اپنے پیروں پہ کھڑے رہنا دوبھر ہو گیا۔

"تایا ابا کا حوصلہ تو چٹانوں کو مات دیتا تھا......آج کیوں کمزور پڑ گئے؟" اس نے
انہیں کاندھوں سے تھام کر سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس وقت اپنے آپ میں کہاں تھے

"تایا ابا......حوصلہ سے کام لیں۔ پلیز تایا ابا۔" اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا، تسلی اور د
کے کون سے بول کہے جو اس پل ان کی ڈھارس بندھا سکیں......ٹیلی ویژن پر کسی پرائیویٹ
کے ذریعے متاثرہ علاقوں کی دکھائی جانے والی براہ راست رپورٹ اب بھی جاری تھی۔ اس۔
وی کا سوئچ آف کرتے ہوئے عجلت میں پانی کا گلاس بھرا......اور پھر واپس رکھ دیا۔ تایا ابا ر
سے تھے۔

"اس طرح تو ان کی طبیعت مزید بگڑ جائے گی۔" اس نے فکر مندی سے سوچا اور پھر بڑ
انہیں اٹھانے میں کامیاب ہو سکی۔

ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ رنگت پہلے سے زرد اور جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"آپ لیٹ جائیے تایا ابا......" تخت پر چادر اور تکیہ درست کرتے ہوئے وہ دھیرے دھیر
ان کا ہاتھ سہلانے لگی۔

"سانحہ بہت بڑا ہے تایا ابا......مگر آپ دعا کیجئے، خود کو پرسکون رکھیں......"

"یہ سب ہمارے ہی گناہوں کا نتیجہ ہے بچی! جو اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہوا ہے۔ ا
کی رحمت بے سبب ہو سکتی ہے......اس کا غضب بے وجہ نہیں ہو سکتا۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو اب بھی رواں تھے۔ بہت دیر بعد جا کر وہ پرسکون ہو سکے۔ زیر لب
یات کا ورد کرتے کرتے وہ نیم غنودگی میں چلے گئے۔ تب ہی وہ وہاں سے اٹھ سکی۔ دل پہ بھاری
جیسا کوئی بھاری بوجھ آن پڑا تھا۔ آس پاس گھٹن محسوس کرتے ہوئے وہ طویل راہداری عبور کر
ے باہر نکل آئی۔

چوڑے ستونوں والے گول برآمدے کی چقیں اٹھائے بی بی نیر قرآن پاک کی تلاوت کئے جا رہی
یں۔ ان کی بھیگی، پرسوز آواز دل پہ کیسی رقت طاری کرتی تھی۔ وہ وہیں ان کے پہلو میں پاؤں
میٹ کر بیٹھ رہی۔

بی بی نیر نے اس کی خواہش جان کر بلند آواز میں تلاوت شروع کر دی۔

بی بی نیر کی آواز ان کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ لب دھیرے دھیرے کانپنے لگے تھے۔
انہوں نے قرآن کو جزدان میں لپیٹ کر سینے میں بھینچ لیا تھا۔ چپ کی گود میں کتنے ہی لمحے ایک ایک
کر کے گرتے چلے گئے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیئے خدا سے رحم کی بھیک مانگتی رہی۔

کچھ دیر بعد بی بی نیر کا دل تھما۔ تب کہیں جا کر بول پائیں۔

"ایک تمہارے پھوپھا جان کی موت نے ہی مجھے ساری عمر دکھ کی صلیب پر گاڑے رکھا ہے۔
وہ لوگ جو اپنا گھر بار، بہن بھائی، بچے، ماں، باپ لٹا بیٹھے ہیں، ایک ہی جھٹکے میں وہ کیونکر پائیں
گے نین تارا......؟"

ان کے لہجے میں بے قراری حد سے سوا تھی۔

وہ چپ ہو رہی، اس کے سارے لفظ تو کہیں کھو چکے تھے۔

"ابا کی وفات......پھوپھا کی جواں مرگی، دادی کی رحلت۔ صدمے تو ان لوگوں نے بھی کم نہ
دیکھے تھے، مگر یوں حال سے بے حال تو کبھی کوئی نہ ہوا تھا۔"

تب ہی گیٹ پر مخصوص ہارن سنائی دیا تھا۔

وہ چونک اٹھی۔

"یہ زین العابدین کی آمد کا وقت تو نہیں پھر......؟"

گرے کرولا سرخ روش پر دوڑتی ہوئی گیراج میں جا رکی تھی۔ زین العابدین عجلت بھرے
انداز میں برآمدے کی دو، دو، تین، تین سیڑھیاں پھلانگتے اس کے قریب سے ہو کر جالی دار
دروازے سے اندر داخل ہو گئے تھے۔ جانے کس دھیان میں تھے کہ اسے دیکھ کر بھی نہ دیکھ پائے۔

ان کی انتہائی پریشانی کی علامت۔

جس نقطے پر ذہن مرکوز ہوتا اس کے سوا کوئی چیز انہیں اپنی طرف کھینچ ہی نہ پاتی تھی۔

نین تارا چپل پہن کر کنیز کو افطاری کے لئے کہتی بڑے کمرے میں آئی تو وہ تایا کی پیشا
ہاتھ رکھے، ان پر جھکے ہوئے تھے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ابا!"

"ہاں بس وقتی طور پر دل سہ نہیں پایا...... اب ٹھیک ہوں، بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" وہ پھیک
مسکراہٹ لبوں پہ سجائے کمزور لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے ابا...... اپنا حوصلہ مت کھویئے...... آزمائشیں انسانوں ہی کے لـ
ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں ان کا ہاتھ تھامے کہتے رہے۔

تایا ابا کچھ کہے بغیر سرد آہ بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔ آنکھ کے گوشے میں
البتہ یونہی چمکتی رہی۔

"ابا! ڈاکٹرز کی ایک ٹیم متاثرہ علاقوں میں روانہ کی جا رہی ہے...... مجھے بھی جانا ہوگا۔ آپ
کی اجازت درکار تھی۔ سو چلا آیا ہوں۔"

وہ ڈی ایچ کیو میں گزشتہ پانچ سالوں سے مسیحائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ انتہا
مستعد، فعال، ہمدرد ڈاکٹر...... اپنے فرض کی ادائیگی میں خون پسینہ ایک کر دینے والے۔ ایماندا
و جانثاری کا یہ وصف اپنے پرکھوں سے ملا تھا انہیں۔

"اجازت ہی اجازت ہے بیٹا...... تم اپنی ماں سے رخصت لو......" تایا ابا نے ایک ثانیے
بھی دیر نہ کی تھی۔

"تارا! آثار کے موبائل پہ رابطہ کرو...... اس سے کہو مجھ سے گھر کے فون پر ابھی بات ک
لے......" انہوں نے کہتے کہتے عجلت میں آستین ہٹا کر گھڑی پر نگاہ کی۔

"روزہ کھلنے کو ہے۔ میرے لیے ایک کپ چائے بنوا دینا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہو
اسی وقت باورچی خانے میں چلی آئی۔

"وہ جا رہے ہیں...... معلوم نہیں کتنے دنوں کے لئے۔"

اسے خوامخواہ ہی بے قراری سی محسوس ہونے لگی۔

مرغی کے ابلے ہوئے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو سیاہ مرچ کے ساتھ مکھن میں مکس
کرتے ہوئے وہ اپنے دل میں ہوتی پکڑ دھکڑ سے بخوبی واقف ہو گئی تھی۔ سینڈوچ میکر کا بٹن آن

کرتے ہوئے اس نے ایک پلیٹ میں کھجوروں سے گٹھلیاں نکال کر رکھیں پھر کنیز کے ہاتھوں ٹرے
زین العابدین کے کمرے میں بھجوا کر وہ بڑے کمرے میں فون کے پاس آ بیٹھی...... یہاں افطاری
بنانے کے لئے موجود تائی امی نے اس سے کچھ کہا، مگر وہ نجانے کس سوچ میں الجھی ہوئی تھی کہ ان
کی بات سن ہی نہ پائی۔ وہ اسے دوبارہ پکارے بغیر خود ہی اس کام سے اٹھ گئی تھیں۔

آثار کا فون نمبر ملاتے ہوئے بھی اس کا ذہن برق رفتاری سے اپنا کام کرتا رہا تھا۔ دوسری
طرف مسلسل بیل جا رہی تھی، مگر آثار جانے کہاں مصروف تھا۔ کوئی پانچویں بار ملانے کے بعد بھی
اس سے رابطہ نہ ہو سکا تو وہ ریسیور پٹخ کر اٹھ گئی۔

زین العابدین کے کمرے تک آئی تو وہ اپنے سیل فون پہ موجود مصروف تھے۔

"آپ کو پتہ ہی ہے سڑکیں بلاک ہو چکی ہیں۔ وہاں تک رسائی فضائی ذرائع کے سوا ممکن ہی
نہیں۔ جی، جی ڈاکٹرز، نرسز، پیرا میڈیکل اسٹاف، جی شکریہ میں انتظار کروں گا۔"

"آثار سے بات ہوئی......؟" بات ختم کرتے ہی وہ اس کی طرف پلٹے۔

"نہیں...... وہ فون ریسیو نہیں کر رہا۔"

"کوئی بات نہیں۔ وہ مصروف ہوگا تم یہ سب بیگ میں رکھو۔" انہوں نے الماری سے چند
جوڑے نکال کر بیڈ پہ پھینکے۔ پھر دراز سے کچھ ضروری اشیاء نکال کر دیتے ہوئے خود غسل خانے میں
چلے گئے۔

والٹ، ٹوتھ برش، ان کی پرسنل ڈائری بیگ میں رکھتے ہوئے اس نے دیکھا۔ ٹرے جوں کی
توں بھری پڑی تھی۔ بس چائے کا کپ ہی خالی ہوا تھا۔ گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے بیگ کی
زپ بند کر دی تھی۔

"ابا کی طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی...... فی الحال انہیں ٹی وی اور اخبارات سے دور ہی
رکھنا۔ کھانے کے بعد دوا بھی ضرور کھلا دینا۔" وہ نہا کر نکلے تو اسے تاکید کرنے لگے تھے۔ بال بنانے
کا بس فریضہ ہی ادا کیا تھا۔

"آپ جا کہاں رہے ہیں......؟"

"مظفر آباد...... وہاں سارا نظام درہم برہم ہے، ہو سکتا ہے کچھ دنوں تک رابطہ نہ کر سکوں اس
لیے نہ خود پریشان ہونا اور نہ دوسروں کو ہونے دینا۔" وہ جوتا پہن کر ہاتھ دھونے واش روم تک
گئے۔ واپس آ کر بیگ اٹھایا تو وہ ایک دم ہی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"وہاں تو بہت سے لوگوں کی ضرورت ہوگی نا......؟"

"ظاہر ہے......"

"تو پھر میں بھی تو جا سکتی ہوں نا......؟" اس نے خود کو اس نتیجے پر پہنچتے محسوس کیا تو
میں دیر نہ کی تھی۔

"تم......؟" انہوں نے قدرے الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ ان دنوں ہاؤس جاب کر رہی تھی۔

"ہاں...... میں......"

وہ لب بھینچے پرسوچ نگاہوں سے کچھ لمحے دیکھتے رہے۔

"وہاں بہت کچھ سہنا اور دیکھنا پڑے گا...... بھوک، سردی، بے آرامی اس کے علا
برداشت کرسکو گی؟" وہ غالباً اس کے ارادے کی پختگی جانچنا چاہ رہے تھے۔

"کیوں نہیں۔ آخر میں تو ایک ڈاکٹر ہوں بالکل آپ کی طرح۔" اس نے پورے اعتماد
تھا۔ اس کے لیے تو صرف یہی کافی تھا کہ وہ بھی وہاں ہوگی جہاں زین العابدین موجود ہوگا۔

اس کے آس پاس، اس کے آگے پیچھے، اس کے قریب اس کی ہر مشکل ہر بے آرامی بھی
حصہ دار۔

زین العابدین نے اس کی آنکھوں سے عیاں خود اعتمادی کو پڑھتے ہوئے خود بخود ہی اثبات
میں سر ہلا دیا تھا۔

◆❖◆

بتا اے شہر!
تیری نیم روشن، تنگ
بل کھاتی ہوئی گلیوں میں
یہ کیسا تعفن بھر گیا ہے
مکانوں کی بجھی آنکھوں میں
کالا موتیا اترا ہوا ہے
کوئی چھت پر نہیں جاتا
فلک سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے
ڈری سہمی ہوئی مخلوق
دیواروں کے اندر چھپ گئی ہے
کوئی آواز تک آتی نہیں ہے

وہ سناٹا
جسے تو نے کبھی گلیوں میں آنے کی
اجازت تک نہیں دی تھی
مکانوں کی بجھی آنکھوں کے رستے
چہکتے بولتے کمروں کے اندر آگیا ہے
بتا اے شہر! تیرے تن بدن کو
یہ کیا بیٹھے بٹھائے ہو گیا ہے

◆❖◆

بہت خوب صورتی سے سجا ہوا کمرہ تھا۔

ہلکے نیلے پھولوں والا گہرا نیلا دبیز قالین پورے کمرے کے فرش کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ بیڈ پر ہلکے نیلے رنگ کی چادر اور جالی دار پردے جو ہلکی ہوا میں ہلکورے لے رہے تھے۔

داہنی دیوار کے ساتھ لگے بیڈ کے عین سامنے ایک خوب صورت بک شیلف تھا' جس میں زیادہ کتابیں شاعری کی تھیں...... اور باقی چند ناول اور گنے چنے سفرنامے اس کے ساتھ پڑے رائٹنگ ٹیبل پہ کرسٹل کی گڑیا اپنی لہریئے دار فراک فضا میں لہرائے ایک پاؤں زمین پہ ٹکائے دھیرے دھیرے گھومتی تھی۔ یہاں کچھ خوب صورت ڈیزائنوں پر مشتمل رائٹنگ پیڈ پڑے تھے' جن پہ بکھرے موتی سے لفظوں سے خوشبو پھوٹتی تھی۔ قلم کھلا رکھا تھا' جس کی نوک پر خشک ہوتی روشنائی میں ابھی سینکڑوں ان کہی باتیں مچل رہی تھیں...... کچھ خطوط تھے' جن پہ درج تحریر کی چمک بار بار پڑھے جانے کے باوجود ماند نہ پڑتی تھی۔ ایک موبائل فون تھا' جس کے ان باکس میں ایک نیا میسج بیپ دے رہا تھا اور اس کے صفحات کو الٹ پلٹ کر بے ترتیب کر رہی تھی۔

اسی رائٹنگ ٹیبل کے اوپر دیوار پر لکڑی کے خوب صورت فریم میں جڑی ایک جوان لڑکے کی تصویر تھی۔

انتہائی خوب صورت اور واضح تصویر۔

شہد رنگ' آنکھوں پر گہرے بھورے بالوں والے اس نوجوان کے عنابی ہونٹوں پہ پھیلی دلکش مسکراہٹ کے ہزار معنی نکلتے تھے۔

مغرور تیکھے نقوش۔

مگر جذبے لٹاتی آنکھیں محبت کی تاجدار تھیں اور اسی تصویر کے سامنے وہ کھڑی تھی۔

ہلکے آسمانی رنگ کا لباس زیب تن کیے۔ ساکت وصامت۔

اس کی نظریں تصویر کے ایک ایک نقش کو چھو کر مزید پیاسی ہو جاتی تھیں۔

تب ہی کمرے کا بند دروازہ ہولے سے چرچرایا۔

اس کی محویت کا عالم ابھی تک وہی تھا...... تب ہی کسی نے اسے پیچھے سے آ کر ڈرا دیا۔

''ہاؤ......!''

''آ......'' وہ ذرا سا کپکپائی تو حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی تھی۔ آنکھیں ایک جھ کھلیں۔

غیر ارادی جنبش سے مٹی ایک پھوار کی صورت میں اس کے چہرے پر برس گئی تھی۔ ا سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

گرد آلود سانس پھیپھڑوں میں بھرتے ہی اسے زور سے کھانسی آ گئی...... یہ بلائے

اس کی جان پہ دوہرا عذاب تھی۔ جھٹکے کھاتے جسم کے ہر بن مو میں دکھن جیسے سوئیوں کی طر تھی۔

سانس بے طرح پھول گیا اور دل جیسے ربڑ کی گیند کی طرح سینے کی دیواروں سے ٹکرا بے جان ہوتے ہوئے پلکیں گرد کا بوجھ اٹھانے سے قاصر۔

''کاش...... اے کاش، میں اس گرد کو آنکھ کے پپوٹوں سے ہٹا سکتی‘ جو میری آنکھوں کو جا رہی ہے۔'' بے بسی کے شدید ترین احساس نے اسے رلا دیا تھا۔ پچھلے کئی پہروں سے وہ پڑی تھی۔

ہوش سے بے ہوشی اور شعور سے لاشعور کے رابطے ٹوٹتے، بحال ہوتے رہے تھے۔ بہ یاد آ رہا تھا، بہت کچھ بھول چکی تھی۔

ممی...... پاپا...... دادی...... زریاب! ایک ایک کو پکار کر دیکھ لیا‘ مگر خاموشی تھی کہ اس بازگشت کو نگل کر پھر سے دم سادھ لیتی تھی۔

اور اب تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ ان کی شکلیں بھی بھولتی جا رہی ہے۔

''اور میں...... میں۔'' اس نے خود کو یاد کرنے کی کوشش کی۔

''میرا چہرہ...... میرا رنگ...... میرا نام؟'' سوچتے سوچتے دماغ شل ہو گیا تو اس نے ڈھیلا چھوڑ دیا۔

کتنی بار خود کو مردہ سمجھنا چاہا تھا‘ مگر زندگی کسی حقیر کیچوے کی طرح اس کی آنکھوں میں

لگتی تھی۔

''زندگی اور موت کے بیچ میں اب فاصلہ ہی کتنا ہے؟''

بہت دیر بعد اس نے پھر سے پلکوں کو حرکت دینے کی کوشش کی۔

خود کو محسوس کرنا چاہا۔

''اگر میں زندہ ہوں تو اس اندھیری قبر سے مجھے کوئی کیوں نہیں نکال رہا؟'' اس نے حد درجہ بے چارگی سے سوچتے ہوئے اپنے ہاتھ کی پوروں سے آس پاس کی جگہ چھونے کی کوشش کی۔

بایاں ہاتھ کہاں تھا......؟ کس حالت میں تھا......؟ اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کی مرضی سے ہل رہی تھیں اور ہتھیلی تلے پھیلی بھربھری ریت کو چھو رہی تھیں۔ کلائی سے اوپر تک کا حصہ کسی بھاری چیز کی زد میں تھا...... اٹھانا ممکن تھا نہ کھینچ لینا۔

کئی بار انگلیوں پر محسوس ہونے والی چپچپاہٹ اب غالباً خشک ہو کر اکڑ گئی تھی۔

ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو نئے سرے سے کوشش پر آمادہ کرتے ہوئے نیم وا آنکھوں کو مزید کھولا۔

کئی بار پلکیں جھپکنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ قبر اتنی تاریک نہیں رہی تھی...... کہیں کوئی درز روشنی کی کھلی تو تھی...... کوئی سوراخ جہاں سے نم مٹی کی بھیگی باس اندر آ رہی تھی۔

اور کوئی آواز بھی تو تھی......

کیسی آواز......؟ اس کے ساعتیں چوکنا ہوتیں۔

ترپ...... ترپ......

''پانی......؟ پانی......؟''

پپڑی زدہ، خون آلود ہونٹوں پر خشک زبان پھیرتے ہوئے اس نے خون کا ذائقہ اور بہت سی گرد اپنے معدے میں اتار لی تھی۔

''ہاں پانی چاہیے...... پیاس بہت ہے...... میرے حلق میں صحرا اگ آیا ہے۔ مجھے پانی دو اور روٹی چند لقمے صرف چند لقمے اور کچھ گھونٹ صرف چند قطرے اور کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آنسو گرم سیال کی مانند اس کی دھڑکتی ہوئی کنپٹیوں کو بھگو رہے تھے۔

''ممی پلیز آؤ...... پاپا...... دادی ماں! آ جاؤ...... کوئی تو آؤ...... زریاب! کوئی تو آؤ......''

اس کی آواز چیختے چیختے پھٹ گئی تھی اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے اس

کی آواز بے دم ہوتی چلی گئی تھی۔ پوری طرح کھلی آنکھیں انجانے بوجھ تلے دب گئی تھیں
ہونٹوں پر لرزش بہت دیر تک طاری رہی۔ خاموش آنسو لکیروں کی صورت بہتے بہتے تھم گئے۔
ذرا دیر بعد سانس معمول سے بھی دھیمی رفتار میں چلنے لگی تھی۔ دماغ پہ چھائی ہلکی ہلکی
گہری نیند میں بدلنے لگی۔

تب ہی ڈرائنگ روم سے چمچوں، پلیٹوں کے کھنکنے کی آواز آنے لگی تھیں...... گلاس میں
سے پانی انڈیلا جا رہا تھا۔

"پتا نہیں آج کھانے میں کیا بنا ہوگا......؟" وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

"لاجور! آ رہی ہو یا نہیں......" دادی کی آواز۔

وہ بری طرح چونکنے کے ساتھ کراہی۔

نیند کا، مدہوشی کا وقفہ بس...... اتنا سی...... اس کی حیران آنکھوں نے خود کو ایک بار پھر ا
کے نیچے پا کر سوچا۔ کندھے پہ ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہلکی سی جھرجھری لی
یہ سرسراہٹ بڑھتے بڑھتے اس کی گردن تک آ گئی تھی۔

"کیا ہو سکتا ہے یہ......؟" وہ پوری طرح سوچ بھی نہ پائی تھی، جب کسی سفاک چیونٹے نے
بڑی بے رحمی کے ساتھ اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑ دیئے تھے۔



کون کہے گا کہ یہ خانماں برباد بستی کبھی ہنستے کھیلتے، خوش باش، بے فکرے لوگوں کی آرزوؤں،
امنگوں، تمناؤں کا محور و مرکز ہوا کرتی تھی۔ اس کی گلیوں میں اترتی صبح بچوں کی کھلکھلاہٹوں سے
ہوا کرتی تھی اور شام کا آنگن رنگین آنچلوں، چوڑیوں کی کھنک سے بھر جاتا تھا۔

کسے خبر تھی اس دھرتی پہ سینہ تان کر چلنے والے اس کے اپنے بیٹے۔

اس کے سینے پہ اپنی پیشانی ٹیکنے والے اس کے اپنے بزرگ۔

اس کی اپنی بیٹیاں جو اس کے بدن سے پھوٹنے والے شعلہ رنگ قرمزی پھولوں سے گھر
کے گھر سجایا کرتی تھیں، آج یوں بے گور و کفن لاشوں، مٹی کے ڈھیروں کی صورت اسی دھرتی کے
مشفق سینے پہ بے یار و مددگار پڑے ہوں گے۔

یہ غم و دکھ سے نڈھال مرد۔

گریہ کناں عورتیں۔

روتے، بلکتے...... سکتے میں آ جانے والے پھول سے بچے۔

"اے مالک! ان کے دکھ کا کوئی مداوا ہے بھی کہ نہیں......" وہ ششدر سی اپنی جگہ رہ گئی تھی۔
انہیں یہاں آئے کچھ زیادہ وقت نہیں بیتا تھا۔ کیمپ لگ چکا تھا...... اور وہاں مریض درجنوں،
سینکڑوں نہیں، ہزاروں کی تعداد میں تھے قیامت کی چیخ و پکار تھی۔

مرنے والے چپ چاپ آنکھیں پھیر گئے تھے۔

جینے والوں پہ ایک نہیں کئی عذاب تھے۔

ان سوختہ جانوں کی آہ و بکا وہ تھی کہ آسمان بھی لرز لرز گیا تھا۔ یہ سب اس کی سوچ سے بھی
بہت زیادہ تھا۔ اس کے تصور سے کہیں آگے۔ اس کے اندازے سے کہیں بڑھ کر۔

"وہ اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں۔ ہر چیز گھر، مکان، مال جانیں ان کے پاس کچھ بھی باقی نہیں
حتیٰ کہ ہمت، حوصلہ برداشت بھی۔ وہ قیامت ٹوٹی ہے ان پر کہ ہم لاکھ دکھ محسوس کریں۔ ہمارے
ایسے ان کی طرح پھٹ پڑیں گے، نہ ہماری آنکھیں ان کی طرح لہو بہائیں گی...... ہم ان کے لئے
کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف اتنا کہ انہیں اپنے حوصلوں کی چھت دے دیں...... ان کو ہمت کی
بیساکھیاں تھما کر ایک بار پھر سے اٹھ کھڑا ہونے کے لئے سہارا دیں۔ ان کے گرد صبر کی دیواریں
کھڑی کر دیں۔ ان کے مسمار ارادوں کی تعمیر نو کریں اور اس سب کے لئے ضروری کہ ہم پہلے سے
خود کو ہر قسم کی غیر متوقع صورت حال کے لئے تیار رکھیں...... اپنے دلوں کو موم اور دماغوں کو پتھر کر لیں۔

"خیال رہے کہ ہمارے قدم ڈگمگانے نہ پائیں کیونکہ ہمیں بہت سے لوگوں کا سہارا بننا ہے۔"
سینیئر سرجن ڈاکٹر احسن لغاری کی آواز میں کیسا جادو بھرا تھا کہ نین تارا کو اپنی زائل ہوتی توانائیاں
ایک بار پھر سے بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

اس نے اپنے آس پاس پھیلے زخمیوں بچوں، عورتوں پر نگاہ ڈالی۔

انہیں درد کی دوا چاہیے تھی۔ زخموں کا مرہم...... ڈوبتے ابھرتے ذہنوں کے لئے گھڑی بھر کا
سکون...... ان کی ملتجی نگاہیں آنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم سب کو میری ضرورت ہے اور میں اس ضرورت کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں
گی......" وہ ایک نئے ارادے سے اٹھی اور ڈاکٹر عائشہ کے ہمراہ ہولی۔



سفر ستارہ
کہیں ورائے نظر کھلا ہے
ہواؤں نے بادبان میں گرہیں ڈال دی ہیں

ہتھیلیوں پہ لکھی عبارت
کسی بشارت کی منتظر ہے
پرندے چپ ہیں
کوئی نظارہ!
کوئی اشارہ!
سر نظر حرف وصل اترنے کے دن نہیں ہیں۔



ادھ کھلی آنکھیں بہت دیر سے ایک ہی نقطے پر مرکوز تھیں۔

وہ چہار جانب کئی بار نظریں گھما چکی تھی، مگر ایک ہی منظر چاروں اور محیط تھا۔ اس کے اوپر چند انچ کے فاصلے پر لکڑی کا بھاری دروازہ اٹکا ہوا تھا۔

اس قدر قریب کہ اگر وہ سر ہلانے کی سکت رکھتی تو ذرا سی جنبش سے اس کی ٹوٹی ہوئی کے نوکیلے بھالے اس کے چہرے اور سر میں پیوست ہو چکے ہوتے۔ سینے سے ذرا نیچے تک بھی جانے تھا یا نہیں ...... وہ اب کچھ بھی محسوس نہ کر پا رہی تھی...... بس اس کا دایاں پاؤں کہ جگہ پڑا تھا جہاں سرد ہوا آ کر اس سے ٹکراتی اور سن کر دیتی تھی۔

پلکوں کو خفیف سی جنبش دے کر اس نے ایک بار پھر اپنے اوپر گرے ہوئے ملبے کو دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہی۔ سب کچھ تو یاد آ گیا تھا سب کچھ...... اور اب کچھ بھی بھولا نہ جا رہا تھا۔

وہ دادی ماں کے کمرے کا دروازہ تھامے کھڑی تھی ...... سرخ اور اورنج رنگ کے دھکتے والا سوٹ زیب تن کیے، جی بھر کے خود کو سجا رکھا تھا۔ ملبوس سے کئی خوشبوئیں ایک ساتھ اٹھ رہی تھیں...... آج تو خود اپنے آپ پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا...... دادی ماں تھیں کہ اسے چھیڑے رہی تھیں۔

ممی کے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا گلدستہ تھا۔

زریاب آ رہا تھا...... آج نکاح کے بعد وہ اس سے پہلی بار ملنے والی تھی۔

ممی نے اسے پکارا تھا...... وہ ان کی بات سننے کے لئے اپنی جگہ سے ہلی ہی تھی کہ ایک کے لیے زمین پیروں تلے سے کھسک گئی ہے...... اس نے گھبرا کر دروازے کا پٹ تھاما۔

"یہ کیا ہوا ہے......؟" اس نے پلٹ کر دادی سے پوچھنا چاہا، مگر اگلے ہی لمحے جیسے آسمان اپنے اپنے مقام پر گھوم گئے تھے۔

تڑاخ کی زوردار آواز سے کوئی چیز تڑخی ...... چھن سے شیشے ٹوٹے ...... باہر کہیں کوئی زوردار کا ہوا تھا...... اس نے دادی ماں کو تخت پر بری طرح ہچکولے کھاتے اور پھر ان کے ہاتھ میں کی تسبیح زمین پر گرتے دیکھا تھا۔

اس نے بھاگ کر دادی کو اپنی پناہوں میں لینا چاہا، مگر اسی پل زور کا ایسا دھماکا ہوا تھا کہ اس لبوں سے نکلتی چیخ وہیں پہ دم توڑ گئی تھی۔

خبر نہیں ...... وہ چھت اس پر آن پڑی تھی جو آتے جاتے موسموں میں اس کو اپنے شفقت کے ئے میں لئے رکھتی تھی یا وہ زمین جو اس کے بچپن کی اٹکھیلیوں سے لے کر جوانی کی گرمجوشی تک کے پیروں تلے اپنی ہتھیلیاں بچھاتی تھی ...... اور کیا خبر ......؟ یہ وہ دیواریں ہی ہوں جنہیں وہ سہیلیاں جان کر ہر دکھ انہیں کہہ سناتی تھی۔

اور یہ دروازہ وہی دروازہ ہو جو کسی آنے والے کے قدموں کی مانوس چاپ پر اس کی بے ںیوں کا راز گھڑی بھر میں عیاں کر دیا کرتا تھا۔

ہوا کا تیز جھونکا اس کے درد سے بے حال بدن کو مزید ٹھٹھرا کر چلا گیا تھا۔

"اور زریاب کہا کرتا تھا۔ اس شہر میں ایک ایسی لڑکی بستی ہے جس کا وجود صندل میں گندھا، اندنی میں ڈھلا ہے۔ جس کی نیلگوں آنکھوں میں کئی سمندر ایک ساتھ بپھرتے ہیں اور جس کے نرم لبوں کے سامنے گلاب کی سرخی بھی ماند پڑتی ہے۔"

"ارے زریاب! کہیں ہو؟ تو آؤ ...... اور دیکھو میں کن حالوں میں پڑی ہوں۔ میں لاجور ریاب ......! جو پورے تفاخر سے اس دھرتی کے سینے پہ اپنے قدم رکھتی تھی ...... جو اپنا تعارف آپ ی...... ہزاروں میں اپنا آپ شناخت کرا لینے والی۔ راہ کے پتھروں کو ٹھوکروں سے اڑا دینے الی...... تسخیر کرنے والی ...... جو ہزارہا ننھی مخلوق کو اپنے پاؤں تلے روند کر اس پہ ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی ...... جو مفلوج بدنوں، اپاہج فقیروں کو دیکھ کر آنکھیں پھیر لیا کرتی تھی ...... زعم تھا ذ کس پر......؟ اس وجود پر جسے آنے والی چند راتوں میں کیڑے نوچ کھائیں گے۔" گردن کے زخم میں جیسے مرچیں سی بھر گئی تھیں۔

"یہ ہی اصلیت تھی۔ یہ ہی حیثیت یہ ہی دقعت ......؟"

اے اللہ......! اے اللہ......! تو اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت رکھتا ہے تو مجھ پر رحم فرما...... زندگی نہ دے۔ موت تو دے دے ...... سب رابطے ایک جھٹکے سے ختم کر دے ...... سب کچھ چھین لے۔

تیرے بس میں کیا نہیں۔

لاچار...... بے بس...... مفلوج تو میں ہوں یارب!

تو تو قادر مطلق ہے...... زمین کو شق کر دینے والا۔

آسمان کو ڈھا دینے والا۔

تو بس اتنا کر دے میرے لئے۔

اپنی پناہوں میں لے لے۔

سکون دے دے...... یا اللہ!

سکون دے دے...... اے اللہ، اے اللہ۔

اس کی آنکھوں کا نور دم بدم گھٹتا جا رہا تھا۔



اور آج انہیں یہاں آئے ہوئے 72 گھنٹے گزر چکے تھے...... ان 72 گھنٹوں میں ا
سے کون تھا جو ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ سو پایا ہو...... جس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہو...... نیند
ہے؟ بھوک کیسے لگتی ہے......؟ انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ اپنے ساتھ لائے جوڑوں میں سے ان کے
صرف وہی کپڑے بچے تھے جو ان کے تن پر تھے...... دریدہ بدن...... زخموں سے چور...... ا
سامنے پڑے ٹھٹھرتے تو کس میں ایسا حوصلہ تھا کہ اپنے تن پر کوئی گرم کپڑا یا سویٹر رہنے دیتا۔
مریض بہت زیادہ تھے اور ان لوگوں کی تعداد محدود...... بھوک بے انتہا تھی...... خورا
ہونے کے برابر۔ رہی سہی کسر کل شام کو آسمان پر چھا جانے والے سرمئی بادلوں نے پوری ک
تھی...... ملبے تلے دفن لاشوں کو نکالتے، اپنے پیاروں کو کھوجتے لوگوں کی شکوہ کناں آنکھوں نے
رحم آسمان سے رحم کی بھیک مانگی تھی۔

مگر یہ وقت شاید دعا کی قبولیت کا تھا ہی نہیں۔

رات گئے برسنے والی بارش کے سرد قطروں نے زخمیوں کی الم انگیز کراہوں میں اضافہ
تھا۔ نوحہ کناں مخلوق کی ٹھٹھرتی آوازیں بارش کے شور میں دب کر رہ گئی تھیں۔

بے سروسامانی کے ایک نئے امتحان کا آغاز۔

خیمے کہاں سے آئیں......؟ مریضوں کو بستر کیسے فراہم کیا جائے......؟ اور وہ جن کے بر
جسم کھلے آسمان تلے اکڑ کر تختہ ہو گئے تھے۔ ان کی طرف تو دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا کہ اس
زندگی کی حرارت سے گرم وجود زیادہ اہم تھے۔ اس خراب موسم کے سبب وہ جو ایک امید تھی

یوں کو لے جانے والا ہیلی کاپٹر واپس آ کر مزید دم توڑتی جانوں کو حیات کا مژدہ سنائے گا، بجھ
لی تھی۔ منہدم عمارتوں سے نکلنے والی لکڑی کے تختے، ٹین کی چادریں بچھا بچھا کر وہ لوگ موم بتیوں،
بیٹنوں کی مدد سے مریضوں کو بارش سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چارپائیوں پر پہلے ہی سے
ئی زخمیوں کو ایک ساتھ لٹایا گیا تھا۔

"یہاں سردی بہت ہے...... لوگ دم توڑ رہے ہیں...... ہماری ساری محنت اکارت جائے
ی...... ملبے سے بچ نکلنے والوں کو یہ موسم مار دے گا...... کچھ کیجئے ہمیں خیمے چاہئیں بستر بھجوائیں،
گرم کپڑوں کی ضرورت ہے......" رضا اپنے موبائل میں منہ دیئے پوری قوت سے چلا رہا تھا اور پھر
غالباً دوسری طرف سے کوئی رابطہ نہ ہونے پر اس نے موبائل ایک جھٹکے سے کسی درخت کی کھوہ میں
دے مارا اور خود دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وہیں کسی پتھر پہ ٹک گیا تھا۔

"زین العابدین......! رضا کو دیکھیں جا کر...... وہ مجھے صبح ہی سے ڈپریسڈ لگ رہا ہے۔"

ڈاکٹر احسن نے زین العابدین کو فوری طور پر رضا کی طرف متوجہ کیا اور خود سید اصلاح الدین شاہ کی
طرف بڑھ گئے۔

سی ایم ایچ کے کمانڈنگ آفیسر...... جو اپنی دو بیٹیوں کی موت کا غم بھلائے دوسروں کے درد کا
درماں کرتے ہوئے خود اپنی ذات کو بھی فراموش کر گئے تھے۔

ایک ایسی چٹان' جو اپنے اندر ہونے والی تمام ترٹوٹ پھوٹ کو چھپائے دوسروں کو بس مضبوطی
کا ہی تاثر دیتی تھی۔

ڈاکٹر احسن انہیں کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی، آرام کی تاکید کر رہے تھے۔

"میں کیسے آرام کر سکتا ہوں احسن! یہ منوں ملبے تلے دفن مدد کیلئے پکارتی آوازیں مجھے چین
نہیں لینے دے رہیں...... وہ دیکھو اس عورت کو جو اپنے مردہ بچے کی لاش بانہوں میں سمیٹے بیٹھی ہے
...... کہ اسے بے گور و کفن نہیں چھوڑے گی...... یہ لاشیں جو مسلی ہوئی چیونٹیوں کی طرح ہر طرف
بکھری پڑی ہیں۔ بتاؤ احسن! تم نے دیکھی ہے کبھی ایسی ارزانی......؟ ہمیں کہاں جاؤں......؟ کس
گوشے میں جا کر آرام کروں۔ جہاں یہ سب مجھے دکھائی نہ دے...... یہ سب میری طرف دیکھتے
ہیں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے کیا کرنا ہے، میرے بس میں کیا ہے؟" انہوں نے اصلاح
الدین کو بری طرح بکھرتے دیکھا تو بے اختیار آگے بڑھ کر انہیں اپنی بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔

"سوائے صبر کے اور چارہ ہی کیا ہے......؟ ہم وہ تو کر ہی رہے ہیں جو کر سکتے ہیں۔ قدرت
کو ہمارا امتحان مقصود ہے شاید...... صبر سے کام لیں۔"

''نہیں معلوم امتحان مقصود ہے...... یا یہ روز جزا ہے اور ہمیں ہمارے اعمال نامے دکھائے گئے ہیں۔''

وہ انہیں ایک طرف ہٹاتے ہوئے تھکے تھکے سے قدم اٹھاتے دوسری جانب چل دیئے تھے۔

◆❖◆

ہچکیاں لیتا رہا نالہ شب گیر میرا
آہ دم توڑ گئی سینے میں ذرا پہلے
زندگی موت کی بانہوں میں چھپی جاتی ہے
گرفت سانس بھی لاغر ہوئی جاتی ہے
چراغ بجھ گئے، بس جلتا دھواں باقی ہے
اب آئے ہو!
کہ برفاب بدن میں کسی امید کی
اک ذرا سی گرمی بھی کہیں باقی نہیں
اب آئے ہو کہ کھیل ختم ہوا چاہتا ہے......!
اب آئے ہو کہ شب انتظار بیت چلی......!
اب آئے ہو!
کہ جب...... کھو جانا میرا لازم ٹھہرا

نیم وا آنکھ میں ٹھہری پتلیوں نے جانے کیسا منظر دیکھا تھا کہ وہیں کہیں اٹک کر رہ گئیں۔ کوئی چیز اس کے عین سامنے لہرائی تھی یا شاید کوئی سایہ ابھرا تھا۔

جامد و ساکت پانیوں میں ذرا سی ہلچل۔

اس تمام تر عرصے میں کوئی پہلا متحرک منظر...... مگر جو اس کے جسم میں مفقود زندگی کو ذرا سی تحریک نہیں دے سکا تھا۔

اس کا ذہن مردہ ہو چکا تھا اور حسیات دم توڑ چکی تھیں...... ادھ کھلی آنکھیں پچھلے کئی گھنٹوں سے روشنی کی ایک لکیر پر اٹک کر رہ گئی تھیں...... زندگی محض اس کی آنکھوں کے نیلگوں دائروں تک محدود ہو گئی تھی۔

سانس آرہی ہے یا نہیں...... دل دھڑک رہا ہے یا بند ہو چکا ہے......؟

کھلے ہونٹوں پر دیر ہوئی کوئی سرگوشی نہ ابھری تھی...... کوئی آہ، کوئی فریاد، کوئی پکار نہیں......

میں دوڑتا خون شاید چلتے چلتے منجمد ہو گیا تھا...... کلائی پر ہلکورے لیتی نبض کی رفتار تھمنے کو تھی۔

اس کے آس پاس، اوپر نیچے، پھیلی ہوئی کائنات، اگر تھی تو اب تھم چکی تھی۔ ہوا کا نام و نشان فضا میں پھیلا تعفن بھی معلق ہو کر رہ گیا تھا۔

قیامت کا سناٹا تھا۔

مگر پھر

زمین ہولے ہولے سانس لینے لگی تھی...... بہت گہری نیند لے کر جاگی تھی۔ شاید باندھ رکھی کو آزاد کیا گیا تو وہ سرد ٹھوکریں مارتی بلا تاخیر اس پر حملہ آور ہو گئی' مگر وہ تو سارے ہتھیار پھینک تھی۔

روشنی کی ایک لکیر کئی لکیروں میں بدلی تھی۔ لحہ بہ لحہ پھیلتی ہوئی روشنی مگر اب چاہ کسے تھی......؟

سوا نیزے پہ آفتاب چمکے یا اماوس کی رات اترے...... کیا فرق پڑتا تھا......؟

اب تو واپسی کا سفر طے ہونے کو تھا۔ کتنا وقت مزید درکار تھا......؟

کچھ پل۔

چند گھڑیاں۔

گنی چنی ساعتیں۔

ایک آدھ لمحہ۔

پھر تو آرام ہی آرام تھا...... چین ہی چین...... ابدی سکون۔

نہ کوئی دکھ...... نہ تکلیف۔

مہربان فرشتے اپنے نرم گرم پروں میں اٹھا کر اس اندھیری قبر سے دور لے جائینگے۔

روشنی کی ننھی لکیر ایک بڑے سوراخ میں بدل رہی تھی۔

فضا انجانی بھنبھناہٹوں سے بھر گئی تھی۔

''ارے کون گستاخ ہیں یہ...... جو خاک نشینوں کو مدھ بھری نیند سے جگانے جا رہے ہیں۔''

اس کے اوپر موجود ملبہ ایک پل کے لیے گرجا تھا...... کئی چھوٹی چھوٹی کنکریاں اس کے آس پاس گریں۔

تب ہی روشنی کے اس دائرے میں دو انسانی پیر ابھرے تھے۔

پھر...... کوئی دو زانو ہو کر جھکا...... کوئی انسانی چہرہ۔

انسان جو اس کے خیال میں اس روئے زمین پر ناپید ہو چکا تھا۔

کوئی آدھے دھڑ کے ساتھ اس روشنی کو پاٹتا اندر آیا تھا...... انسانی چہرہ...... اجنبی چہرہ
کے قریب تر تھا اس نے جھک کر کھلی لیکن ساکت آنکھوں میں جھانکا۔
پلکیں ذرا سا لرز کر جھکیں اور...... پھر اٹھی تھیں تو اس میں اس کے شعور کا کوئی عمل دخل
"زندہ ہے......" انسانی چیخ ابھر کر اس کی سماعتوں سے یوں ٹکرائی تھی جیسے آسمانی بج
قوت سے کڑکڑائی ہو۔
اس کے پورے بدن میں ہلکی سی سرزش پھیلتی چلی گئی تھی۔



ایک اور بچے کے پھول سے وجود پر موت کی چادر اوڑھاتے ہوئے اس نے اپنے
بند، بند میں بے تحاشا تھکن اترتے ہوئے محسوس کی۔ دل بھی عجب آندھیوں کی زد میں تھا......
اعصاب بکھرتے ہوئے محسوس کر کے وہ ڈاکٹر عائشہ سے کہہ کر کچھ دیر کے لیے ایک سایہ دار د
کے نیچے پتھر پہ آبیٹھی۔
"کس قدر مشکل ہے ایک ماں کی امید کے آخری چراغ کو بجھتے دیکھنا...... اور ماں بھی
اپنے جگر گوشے کو کھوجتی اپنے شوہر کی موت پر گریہ وزاری کرنا بھول گئی تھی۔ جس کے نازک
پر پتھر ہٹاتے ہٹاتے اتنے گہرے گھاؤ لگے تھے کہ انگلیوں کی ہڈیاں تک دکھائی دینے لگی تھیں
قیامت برپا ہوگی اس کے دل میں...... اور اب وہ خود کیونکر جی پائے گی......؟"
وہ سپاٹ چہرہ لیے بڑی بے دھیانی سے اپنے سامنے پتھریلی زمین پر لیٹے ایک زخمی کو
رہی جس کے پاس بیٹھی بوڑھی عورت کپکپاتے ہاتھوں سے پانی کے چند قطرے اس کے حلق
انڈیل رہی تھی۔
"موت کی فراوانی انسان کو کس قدر بے حس بنا دیتی ہے...... پہلا حادثہ دل میں خوف طا
کرتا ہے، دوسرا سانحہ توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد زندگی میں آنے والے ایسے صبر
ہیں یا شاید بہادر بنا دیتے ہیں۔"
اس نے طویل سانس لے کر نگاہوں کا زاویہ بدلتے ہوئے اس آدمی کو دیکھا جس کی
قمیض لہو سے رنگین ہو چکی تھی۔ جس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے پچیس، تیس لاشوں کو قبر
اتارا تھا اور اب انہی ہاتھوں سے چاولوں کے لقمے اٹھا اٹھا کر اپنے منہ میں رکھتا جا رہا تھا۔
"ہاں بھئی...... دنیا کے کام کہاں رکتے ہیں...... موت ایک اٹل حقیقت ہے تو بھوک اس
بڑھ کر سفاک سچائی ہے......" ٹین کی چادر کو مختلف سہاروں سے کھڑا کر کے چھت بنا لیا گیا تھا

دھوئیں کے سرمئی مرغولے مسلسل وہاں سے چکراتے ہوئے نکلتے اور فضا میں مدغم ہوتے جا رہے
"مس نین تارا......!" کسی کے پکارنے اور پھر ہلائے جانے پر وہ بری طرح چونکی۔
"سوری......" آنے والا احمد تھا...... ایک رضا کار جو حال ہی میں یہاں کے امدادی کاموں
میں حصہ لینے آیا تھا۔
"میں بہت دیر سے آپ کو پکار رہا تھا......" وہ کندھے اچکاتا، جھجکتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا۔
"ڈاکٹر احسن آپ کو کھانے پر بلا رہے ہیں......" اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس
نے عجلت میں وضاحت کی۔
نین تارا نے گھڑی بھر کے لیے سوچا لیکن فی الوقت کھانے کی طلب ذرا بھی نہ تھی۔
"مجھے بھوک نہیں ہے...... جونہی دل چاہا۔ میں خود سے کھالوں گی......" یہ تیسری بار تھا کہ وہ
کھانے سے انکار کر رہی تھی۔
"انہوں نے کہا ہے...... میں آپ کو ضرور ہی لے کر آؤں۔"
"نہیں کھا سکوں گی میں ابھی کچھ بھی...... پلیز اصرار مت کرو۔ میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتی
ہوں۔" اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔
گزشتہ روز رک جانے والی بارش سے کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ شدید نوعیت کے
زخمیوں کو راولپنڈی منتقل کر دیا گیا تھا...... اس کے علاوہ ملکی و غیر ملکی ہیلتھ ورکرز کی آمد سے دو مزید
میڈیکل ریلیف کیمپ قائم کیے جا چکے تھے۔
پوری طرح تو نہ سہی، مگر کسی نہ کسی حد تک بنیادی ضروریات کے پورا ہونے کی امید بندھ چکی
تھی...... لیکن موسم کی شدت کو کون روک سکتا تھا......؟
تند ہوا کی ٹھنڈک میں آنے والے دنوں کے بے شمار خدشے چنگھاڑتے سنائی دیتے تھے۔ زرد
چہروں پہ پھیلی سراسیمگی بتاتی تھی کہ آئندہ چند دنوں تک برف باری کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔
"اور پھر یہ خیمے ہمارے برفاب جسموں کو کیسے گرمائیں گے......" ان لوگوں کی پرسوچ
نگاہوں میں پریشانی ہلکورے لیتی نظر آتی۔
"اے کاش! ایسی مشکل نہ پڑے کہ حیات بوجھ محسوس ہونے لگے......" اس نے اپنے ہاتھوں
سے اپنے دونوں کندھوں کو ذرا دباتے ہوئے آس پاس نظر دوڑائی۔
اتنے دنوں بعد آج پہلی بار فرصت کی یہ چند گھڑیاں ملیں تو بے اختیار ہی اسے زین العابدین

کا خیال آ گیا۔

''اتنا ہمت و حوصلہ کہاں سے آ جاتا ہے......؟'' اس نے کافی فاصلے پر زین العابدین
اپاہج بچے کے ساتھ خیمے سے باہر نکلتے دیکھا...... بڑے سبھاؤ سے اسے اپنے دونوں بازؤ
سمیٹے کیمپ کے اندر لے جا رہے تھے۔

اور اگر ڈاکٹر احسن اور زین العابدین جیسے لوگ ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو کیا ہم لوگ
پاتے جتنا آج کر رہے ہیں...... ہر موقعے پر سنبھالا دیا ہے انہوں نے اپنے ڈاکٹرز کو......
چوبیس، چوبیس گھنٹے کام کرنے کے باوجود ان کے ذہنی سکون میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ شرو
دنوں میں رضا کتنا اپ سیٹ رہا...... زین اس کو ٹریٹمنٹ نہیں دیتے تو شاید اب تک وہ اپنا
توازن ہی کھو چکا ہوتا...... وہ دور رہی دور سے انہیں مختلف مریضوں کے ساتھ مصروف دیکھ رہی تھی۔

''جب سے آئے ہیں ایک بار بھی ان کو ڈھنگ سے دیکھا نہیں اور میرا خیال تھا میں
انہی کے واسطے یہاں آئی ہوں......'' اسے اپنی سوچ پر شرمندگی سی محسوس ہوئی۔

''کبھی کبھی انسان واقعی بہت خود غرض ہو کر سوچتا ہے...... لیکن تب یہ اندازہ ہی کہاں
اور بھی غم ہیں محبت کے سوا۔'' اس نے ایک گروہ کی صورت میں دور سے آنے والے لوگوں کو دیکھا
ایک جیپ بھی ساتھ ہی پہاڑی راستے پر اچھلتی کودتی چلی آ رہی تھی۔

''درد کا ایک اور قافلہ......'' اس نے سر جھٹک کر اپنے دماغ کو کسی انجانے بوجھ سے آ
کرنے کی کوشش کی اور پھر فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔



کس سختی سے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے زین العابدین اسے ہاتھ سے پکڑ کر یہاں تک
آئے تھے۔

''یہاں بیٹھو اور کھانا شروع کرو......'' تحکمانہ انداز...... خود ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے
سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔

''زین پلیز! بالکل بھی خواہش نہیں ہو رہی...... ایک لقمہ بھی شاید ہی میرے حلق سے نیچے
سکے۔'' اس نے بے چارگی سے ہاتھ ملے۔

''بچوں کی طرح بی ہیو مت کرو نین تارا! بغیر کھائے پیئے تم یہاں کتنے دن تک چل سکو گی......
کھانا اس وقت ہماری خواہش نہیں، ضرورت ہے۔ دل و دماغ کو اس کی چاہ ہے یا نہیں۔ جسم کی
طلب ہے تو ہے ناں...... اور کیا کھایا ہے تم نے صبح سے۔ سحری میں آدھا کپ چائے کا اور افطاری میں

مجبوریں......'' وہ مزید برہم ہوئے ''ہمیں اس وقت بہت زیادہ ایکٹو ہونے کی ضرورت ہے......
بھی ڈاکٹرز کی کمی یہاں بیسیوں جانوں کا زیاں ہو گی۔ تم لے سکتی ہو اتنے خون اپنی گردن پر......؟
اٹھاؤ یہ پلیٹ اور جلدی سے کھانا شروع کرو...... میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔''

''آپ چلے جائیں۔ میں کھا لوں گی......'' اس کی آواز بمشکل نکلی تھی۔

''میں تم سے کہہ رہا ہوں پلیٹ اٹھاؤ اور کھانا شروع کرو۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر
بولے۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے' لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ ذرا سی نرمی پر وہ بالکل ہی ہاتھ
چھوڑ بیٹھے گی۔

آنکھوں میں آئی نمی بمشکل دھکیلتے ہوئے اس نے اپنے سرد ہوتے ہاتھوں میں پلیٹ تھام لی
...... سامنے پڑے کھانوں پر نظر دوڑائی۔

ابلے ہوئے چاول، دال، نوڈلز اور تیار شدہ سوپ کا پیالہ

اس نے ذرا سے چاول پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس پر سوپ انڈیلنا چاہا پھر ایک دم رک
گئی...... سوپ کا پیالہ گاڑھے خون کی مہک سے بھرا ہوا تھا اس نے بڑی بے بسی سے لب بھینچ کر
زین العابدین کو ایک نظر دیکھا' مگر ان کے سپاٹ چہرے پر کوئی گنجائش نظر نہ آ رہی تھی...... قدرے
توقف کے بعد اس نے دال کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور چند چمچ دال، چاولوں پر ڈال لی۔

''یا اللہ! یہ یہاں سے اٹھ کیوں نہیں جاتے۔ ان حالات میں میرا یہ ناپختہ عمل انہیں ذہنی
پریشانی اور چڑچڑے پن کے سوا اور کیا دے سکتا ہے؟'' ضبط کی تمام حدوں کو چھوتے ہوئے اس نے
چمچ بھر کر اٹھایا لیکن پھر بدک کر پیچھے ہٹا دیا۔

''تارا! پلیز پیٹ بھر کر نہ سہی۔ چند لقمے کھا لو، صرف چند لقمے......'' کرسی پر آگے کی طرف
جھکتے ہوئے انہوں نے نرم لہجے میں اصرار کیا۔

''دال میں سے بو آ رہی ہے زین! میں نہیں کھا سکتی۔''

اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''بو......؟'' انہوں نے از حد حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''ہاں...... آپ خود چیک کر لیں...... میں نہیں کھا سکتی۔''

انہوں نے بغیر کچھ کہے اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے حلقے اور اضطراب کو دیکھا۔

''یہ تو مجھے حد سے زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار لگ رہی ہے۔''

انہوں نے فکر مند ہوتے ہوئے سوچا۔ تبھی ایک دم کسی نے خیمے کا پردہ اٹھایا۔

"ڈاکٹر احسن آپ کو کال کر رہے ہیں...... ایک لڑکی کو آج آٹھویں روز ملبے سے زندہ نکالا گیا ہے۔" آنے والے نے پھولی ہوئی سانس میں بعجلت انہیں بتایا تو وہ فوراً سے پیشتر اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

جانے سے قبل ذرا توقف کرتے ہوئے انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا' مگر وقت کی کمی نے انہیں کچھ کہنے نہ دیا۔ چند سیکنڈز میں وہ خیمے سے باہر تھے۔

نین تارا کے سر سے گویا عذاب ٹلا تھا...... ہاتھ میں پکڑی پلیٹ پٹخ کر وہ بھاگتی ہوئی خیمے سے باہر نکلی اور کھلی فضا میں زور زور سے سانس لینے لگی پھر ایک دم سے چونک کر ٹھہر گئی۔

"کہاں نہیں ہے یہ بو...... ہر طرف، ہر چیز متعفن ہو رہی ہے...... منوں ملبے تلے سینکڑوں، ہزاروں مردہ اجسام، کٹے پھٹے اعضاء مویشیوں کے گلتے سڑتے وجود......" اس نے جھرجھری لی اور پھر خود پر قابو پاتے ہوئے دوسری طرف بڑھ گئی۔

وہ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جسے آٹھویں روز ملبے سے نکالا گیا تھا...... اور وہ زندہ تھی۔

"کیسی قیمتی ہوگی وہ جان...... جسے خدا نے اب تک سنبھالے رکھا...... معلوم نہیں کتنی دعاؤں کا فیض......؟" وہ اس طرف کھڑے ہجوم کی طرف بڑھی مگر پتہ چلا ڈاکٹر احسن اور ڈاکٹر زین اسے موبائل ہاسپٹل کے اندر لے جا چکے ہیں۔ اسپین کے طبی ماہر ڈاکٹر جون بھی ان کے ساتھ تھے۔

وہ اس لڑکی کی زندگی برقرار رکھے جانے کی دعا کرتے ہوئے خواتین کے کیمپ کی طرف بڑھ گئی۔



آزمائش ہے عجب
امتحاں یہ کیسا ہے
چہرہ زندگی کو دیکھو تو
آپ اپنے سے خوف آنے لگے
آئینے اور خواب ٹوٹ گئے
اس قیامت کی گھڑی میں صاحب!
دل پہ کتنے عذاب ٹوٹ گئے

سیاہ رنگ کی بلند و بالا چٹان تھی۔ چھوٹے بڑے نوکیلے پتھروں سے اٹی...... ہر پتھر کے پیچھے سے ایک مکار آنکھ جھانکتی تھی...... اور لہو رنگ زبان اس کی خشک دراڑوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی...... اس کی رگوں میں زہریلی آگ دھیرے دھیرے پھنکارتی تھی...... اور وہ چٹان منتظر تھی...... اپنے خشک بدن کو سرخ رنگ سیال سے لبریز کرنے لگی......

اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس چٹان کے بالمقابل کھڑے پایا...... وہ سیاہ ہیبت ناک چٹان دھیرے دھیرے کروٹ بدل رہی تھی...... ہولے ہولے جاگ رہی تھی اس کی سرخ زبان کسی اژدھے کی طرح لہرائی...... تو وہ پوری قوت سے چیخ اٹھی۔

"نہیں...... مجھے کچھ مت کہو، نہیں۔" وہ کہتی جا رہی تھی مگر لفظ اس کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے نہ آواز اس کے حلق سے باہر آ رہی تھی۔ سیاہ پتھر ایک ایک کر کے اس کی طرف لڑھک رہے تھے۔

اس نے بھاگ کر جانا چاہا مگر اس چٹان کی جڑ سے نکلتے کیچوے لمبے ہو کر اس کے قدموں کو جکڑ گئے تھے...... وہ وہیں لڑکھڑا کر گری پھر اٹھی۔ پھر گری وہ چلاتی رہی مگر چہار طرف ہو کا عالم تھا۔ نہ آدم، نہ آدم زاد...... چرند پرند غائب، درخت، ٹنڈ منڈ شاخیں جھکی ہوئی۔

"کوئی ہے، کوئی ہے جو مجھے بچائے۔" آواز کی بازگشت دور تک پھیلتی چلی گئی پھر اس نے زریاب کو دیکھا۔

اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے زریاب کو......

وہ دیوانہ وار اس کی طرف بھاگی لیکن فاصلہ ان مٹ تھا۔

زریاب سے کچھ پرے ممی کھڑی تھیں اور ان کے برابر پاپا...... کیسے مغموم چہرے تھے ان کے...... دونوں ہاتھ سینے پر باندھے...... کسی بھی قسم کی مدد سے محروم...... اس نے رو رو کر ہلکان ہوتے دادی ماں کی طرف دیکھا جو سفید دوپٹے کے ہالے میں تسبیح گھماتی، بہت پرسکول کھڑی تھیں۔

تب ہی کوئی گونج ابھری تھی۔ کوئی گڑگڑاہٹ پھیلی...... اس نے متوحش ہو کر اپنے عقب میں دیکھا۔

سیاہ چٹان ایک دم زمین کے سینے سے جدا ہو کر اس پہ ٹوٹ پڑی تھی۔

"دادی!" وہ سسکی مگر دادی غائب تھیں۔ صرف ان کی تسبیح کے موتے، دودھیا موتی تھے جو زمین پر گرے تھے، ابھرے تھے، پھر گم ہو گئے تھے اس کے ساتھ ہی تاریک رات آہستہ آہستہ سارے منظر پر پھیلتی چلی گئی تھی۔



رب اغفر وارحم

رب اغفر وارحم

رب اغفر وارحم

بڑھاپے کے عروج سے لرزتی، آنسوؤں سے بھیگی آواز جوں جوں بلند ہوتی جاتی
تڑپ، فریاد اور لگن بھی آسمان کو چھونے لگتی تھی۔

سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

چہرے کی جھریوں میں جما دکھ چیخنے لگتا۔

بتانے والے بتاتے تھے ان کے رعب و دبدبے کی داستان پارینہ......!

بھرے پرے خاندان کے سربراہ تھے...... بھائی، بھاوجیں، بیٹے، بہوئیں، بیٹیاں نواسے
نواسیاں، پوتے پوتیاں سب کے سب راہی عدم ہوئے۔

اور وہ...... چمن آفریدہ کے محافظ و نگران۔

گلشن نوبہار کے پاسبان......

پتھریلی زمین پر دونوں ٹانگیں بچھائے۔ کسی سادھو، فقیر، کی مانند بس ایک ہی دعا کی تکرار
جا رہے تھے۔

ان سے پرے مائی گلزاراں تھی...... جو انہیں دیکھ کر ہنستی، کبھی روتی تھی۔

بظاہر اپنے کام مصروف نین تارا کی توجہ بھٹک بھٹک کر ان کی طرف جاتی تھی۔

"اور تم اچھی ہو مائی گلزاراں! ہوش و حواس کھو کر آزاد بیٹھی ہو۔ جب دل چاہتا ہے، کھاتی
سوتی ہو۔ جب دل چاہتا ہے، رو دیتی ہو۔" نیلم افروز کے زخموں کا جائزہ لے کر وہ ابھی کچھ کہہ
نہ پائی تھی جب کسی نے اچانک آ کر اس کا بازو دبوچ لیا تھا۔

"پلیز ڈاکٹر! پلیز میرے بھائی کو دیکھو! خدارا اسے بچالو...... میرے بھائی کو......" وہ
لڑکا اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے ایک نوجوان کے پاس گھسیٹ کر لے گیا تھا اس کا بدن
دار چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔

"میرا کوئی نہیں رہا اس کے سوا دنیا میں۔ کوئی نہیں رہا کچھ کیجئے جلدی، کچھ کیجئے اسے درد
بچالیں......" بھائی کے چھن جانے کے خدشے سے بے حال وہ گرتا پڑتا چارپائی تک گیا اور اگلے
پل ایک جھٹکے سے اس نے زخمی کے بدن پہ پڑی چادر الٹ دی تھی۔

"آ......" نین تارا نے ایک جھٹکے سے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھتے ہوئے حلق سے نکلنے وا

کو روکا۔

کیا تھا اس چادر کے نیچے۔ کچلے ہوئے گوشت کا ایک ڈھیر...... چور چور ہڈیاں سیاہ پڑتا لہو۔

اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں پھسل کر اس زخمی نوجوان کے چہرے پہ جا ٹھہریں۔ نیلے ہونٹ، بے
ہن چہرہ اور آنکھیں؟

ایسی ویران آنکھیں...... بے تاثر...... ہر جذبے سے عاری...... ایک سے دوسرے چہرے
پہ پھسلتی۔

"آہ......" وہ ذرا سا لڑکھڑائی ہی تھی کہ کسی نے پل میں اسے دونوں کاندھوں سے تھام کر
پیچھے ہٹا دیا تھا...... شخص چند قدم پیچھے سفید اوور آل، ماسک پہنے ڈاکٹر پل بھر میں اس نوجوان کے
گرد جمع ہو گئے تھے۔

"میرا بھائی! میرا بھائی!" اس نوعمر لڑکے کی چیخ و پکار......

"آکسیجن...... انجکشن......" کوئی اسٹیتھو اسکوپ لے کر اس جوان پہ جھکا جا رہا تھا جس کی کھلی
آنکھوں کی پتلیوں میں جنبش نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

نین تارا نے اس تکلیف دہ منظر سے پرے ہٹ جانا چاہا، مگر پیروں میں سکت نہ رہی تھی......
آنکھیں جیسے کسی خوف کے زیر اثر پھٹی جا رہی تھیں۔ کسی نے چادر اٹھا کر اس کچلے ہوئے نصف وجود
کو ڈھانپ دیا۔

"ہی از نو مور......" ڈاکٹر بخاری نے سر جھکا۔

"نین تارا چلیں، چلیں یہاں سے۔" ڈاکٹر عائشہ اسے وہاں سے ہٹانا چاہ رہی تھیں، مگر اسے
لگا تھا...... سارا وجود مٹی ہو چکا ہے۔ ذرا سی جنبش بھی کی تو شاید ڈھے جائے گی۔

زین العابدین کو جانے کس نے خبر کر دی تھی...... وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے سیدھے اسی کی
جانب آئے...... اس کی غیر معمولی کیفیت کو دیکھ کر ان کا چہرہ متغیر ہوا، مگر اس کے سامنے آنے تک
وہ خود پر قابو پا چکے تھے۔

"تارا...... تارا" اس کے عین سامنے آ کر انہوں نے دھیرے سے اسے پکارا۔

سفید پڑتی رنگت کے ساتھ اس نے ابھی تک دونوں ہاتھ سختی سے اپنے منہ پر رکھے ہوئے
تھے۔ کھلی آنکھوں میں دہشت کا عفریت نمایاں۔

"نین تارا...... ریلیکس...... ایوری تھنگ از او کے تارا!"

انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اسے زبردستی اپنی طرف متوجہ کیا۔ کچھ لمحوں

کے لئے وہ بڑی بیگانگی سے انہیں دیکھتی رہی۔

شناسائی کی کوئی رمق اس کی آنکھوں میں نہ پا کر انہوں نے ذرا سختی سے اسے جھنجوڑا۔ اس کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی آنکھوں کے تاثرات یکلخت ہی بدل گئے۔

"آ..... آ..... زخمی کے مردہ وجود کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے، زین العابدین کو کچھ بتانے، کچھ کہنے کی کوشش میں وہ تکلیف کی شدت سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔

"نین تارا! کمپوز یور سیلف۔ دیکھو اسے کچھ نہیں ہوا۔" اسے سنبھالنے میں ناکام ہوئے وہ خود بھی بری طرح گھبرا گئے تھے۔ اس شدید ردعمل کی توقع انہیں کسی طور نہیں تھی۔ نجانے کب سے کیا گیا ضبط اپنی حدود سے آج تجاوز کر گیا تھا کہ لمحہ بھر میں اس کی حالت بگڑ گئی تھی...... جبڑے بھینچ کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے یوں دبا تھا کہ اس میں سے خون پھوٹتا ہوا ہو رہا تھا۔ ناخن ہتھیلیوں میں گڑ گئے تھے۔

اسے اسٹریچر پہ لٹاتے ہی ڈاکٹر احسن لغاری زین کو پیچھے ہٹا کر خود اس پر جھک گئے تھے۔

"ریلیکس نین تارا! سب کچھ ٹھیک ہے...... کچھ بھی نہیں ہوا۔ تم تو بہت بہادر بچی ہو۔ دل و دماغ کی مالک...... خود کو پرسکون رکھو...... دیکھو ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے پاس......" وہ اس کی سختی سے بھینچی مٹھیوں کو کھولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دے رہے تھے۔ وہ ناہموار سانس لیتی کچھ سمجھی، کچھ ناسمجھی کے عالم میں انہیں تکتی رہی پھر آنکھوں میں ذرا سی نمی چمکی اور اگلے ہی پل وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔

ڈاکٹر عائشہ اس کے لیے انجکشن تیار کر چکی تھیں۔

زین العابدین، ڈاکٹر احسن کے عقب میں لب کاٹتے ہوئے سخت مضطرب تھے۔ بے خواب سرخ آنکھوں میں پریشانی ہلکورے لے رہی تھی۔

ڈاکٹر احسن اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولتے رہے...... کچھ ہی دیر بعد کے شدت سے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے تو اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔

"اسے ایک لمبی اور پرسکون نیند کی ضرورت ہے۔ اٹھے گی تو خود کو فریش محسوس کرے گی۔"

ڈاکٹر احسن لغاری اس کی طرف سے مطمئن ہو کر زین العابدین کی طرف مڑے۔

"مجھے خدشہ تھا کہ تارا یہ سب برداشت نہیں کر سکے گی۔" زین کے کہنے پر ڈاکٹر احسن نے فوری طور پر نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں..... وہ اول روز سے نہایت ہمت و حوصلے سے کام کرتی آ

بس کچھ مناظر اپنی شدت کی بناء پر انسان کا ذہن جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔"

وہ انہیں ساتھ لے کر خیمے سے باہر آئے۔

"اور خود سوچو! آج کتنے دن ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے۔ ہماری بھوک، پیاس، نیند آرام کس حد تک پورا ہو رہا ہے......؟ رفتہ رفتہ سب ہی تھکنا شروع ہو گئے ہیں اور یہ زخم و لہو کے حالات...... یہ تو رہی سہی توانائیاں بھی نچوڑ لیتے ہیں......" ڈاکٹر احسن نے حقیقت پسندی سے حالات کا تجزیہ کیا تھا۔

"اب تو جتنی جلدی ممکن ہو سکے، ہیلتھ ورکرز کی نئی ٹیمیں یہاں آ جانی چاہئیں۔ ہماری ٹیم کے چند ممبران ایسے ہیں جنہیں ریلیف مل ہی جائے تو بہتر ہے۔"

"یہ خون آلود بدن، رستے ہوئے زخم، کون جانے انہیں دیکھنے، چھونے والوں کی نیندیں ان کے دکھ میں کتنے روز تک اچاٹ رہیں گی...... دل کبھی اس بوجھ سے آزاد ہو بھی پائے گا بھی یا نہیں جو ہر نئی موت کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔" زین العابدین ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سوچتے ڈاکٹر احسن لغاری کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔

♦❖♦

ہلکی پھلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر زین اندر داخل ہوئے تو گرم جیکٹ کے اوپر برف ننھے قطروں کی طرح ٹھہری ہوئی تھی۔ جیکٹ کے کالرز کو پکڑ کر ذرا سا جھٹکتے ہوئے انہوں نے یہ قطرے جھاڑے اور ڈاکٹر جون کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا...... جو نہایت چوکس انداز میں اس لڑکی کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کر رہے تھے۔

"دل کی دھڑکن نارمل ہو چکی ہے...... سانس بھی ہموار ہے۔ اس لئے فی الحال میں نے آکسیجن ماسک ہٹا دیا ہے۔" انہوں نے ناک پر سے پھسلتی عینک کو دوبارہ سے ایڈجسٹ کرتے ہوئے انہیں بتایا۔

"لیکن لگتا ہے یہ لڑکی ذہنی طور پر مسلسل سفر کر رہی ہے...... نارمل ہوتے ہوتے اچانک ہی طبیعت پھر سے بگڑنے لگتی ہے...... یوں جیسے چلتے چلتے اچانک ٹھوکر کھانے والا متزلزل ہو جائے۔" ڈاکٹر جون نے قریبی اسٹول سنبھالتے ہوئے انہیں بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"موسم خراب ہے ورنہ اس وقت اسے بہترین طبی سہولیات سے مزین ایک ہسپتال میں ہونا چاہئے تھا اور سناؤ تمہاری یہ کزن کیسی ہے؟ میں نے سنا، اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔"

"ہاں ایک زخمی کی ناقابل بیان حالت دیکھ کر وہ اچانک ہی اپنا ضبط کھو بیٹھی تھی...... بہت

زیادہ حساس ہے میں نے کبھی اس کے لئے ڈاکٹری کا پیشہ موزوں نہیں سمجھا تھا...... مگر نجانے
میں اسے ایسی کیا اٹریکشن نظر آئی تھی کہ اسی شوق کو اپنا جنون بنالیا۔ وہ دوسروں کی ذرا سی تکل
بہت زیادہ گھبرا جانے والی لڑکی ہے۔" ان کے ماتھے پر پھیلا شکنوں کا جال دم بدم گہرا ہو رہا تھا
"یہ حساسیت تو تمہاری پوری قوم میں ہے...... تم نے دیکھا نہیں جب تمہاری کزن کی
خراب ہوئی تو بہت سے زخمی لوگ اپنا بستر چھوڑ کر اس کی خیریت طلب کرنے وہاں پہنچے تھے
بھی غالباً اسی وجہ سے معمول سے کچھ زیادہ پریشان لگ رہے ہو......؟" انہوں نے معنی خیز
میں مسکراتے ہوئے دانستہ انہیں بشاش کرنے کی کوشش کی مگر دوسری طرف کچھ زیادہ اثر نہ ہوا
"میری پریشانی کی وجہ صرف وہی نہیں ہے ڈاکٹر جون! برف باری کا آغاز ہو چکا
زلزلے سے بچ جانے والوں میں اگر بہت سے لوگ زخمی تھے تو بے شمار صحیح سلامت بھی تھے
زخمیوں کو سنبھال رہے تھے۔ لاشوں کو دفنا رہے تھے صرف اپنا اور اپنے بچ جانے والے کنبے
نہیں انہوں نے ہر دوسرے فرد کا بھی خیال رکھا جو ان کے آس پاس موجود تھا...... آپ نے
ہے نا......؟ بغیر کسی مشینری کے لوگوں نے گھروں کے ملبے تلے سے ضروریات زندگی کا سامان
کرا اپنی مدد آپ کی ہے' لیکن یہ جو ایک نئی آفت آ رہی ہے، موسم کی۔ اس سے کتنے لوگ ہوں
جو بچے رہیں گے؟ خیمہ بستیاں بن رہی ہیں' مگر صورت حال یہی رہی تو امدادی سامان یہاں
کیسے؟"

ان کی سوالیہ نظروں کے جواب میں ڈاکٹر جون مسکرائے۔

"تمہاری قوم بڑی جی دار ہے...... دیکھ لینا، وہ یہاں تک پہنچنے کے کئی راستے نکال لے
ان کی بات پر زین بھی بے اختیار مسکرا دیئے تھے۔

"باہمی محبت کا یہ جذبہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے ڈاکٹر زین...... یہاں آنے سے پہلے
نے دیکھا بہت سے ینگ لڑکے، طالب علم، دفتر کارکن، رفاہی انجمنیں رضا کارانہ طور پر
آنے کے لیے بے چین و بے قرار تھے انہیں یہاں لانا ممکن ہوتا تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ
کا یہ شہر دنوں میں ایک بار پھر زندگی کی علامت بن جاتا۔"

ڈاکٹر حقیقتاً متاثر تھا۔

"وہ تو حیران کے ہم وطن ہیں...... جذبہ تو آپ لوگوں کا قابل ستائش ہے جو اپنی جمی ج
زندگی کو چھوڑ کر یہاں کی صعوبتوں اور تکلیفوں کو شیئر کرنے کے لیے خطرات میں آ گھرے ہیں
اس کی بات سن کر ڈاکٹر جون نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"اچھی بات...... یہ خوب بدلہ چکایا ہے تم نے...... خیر تم کچھ دیر کے لیے یہاں رکو میں ابھی
آتا ہوں۔ اس لڑکی کو فی الحال انڈر آبزرویشن رکھنا ہوگا۔ تم چیک کرتے رہنا۔" انہوں نے
سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر زین کے اثبات میں سر ہلانے پر باہر نکل گئے۔

"بڑے عجیب لوگ ہیں یہ...... بدترین حالات میں بھی ان کی خوش مزاجی برقرار رہتی ہے۔"
کے جانے کے بعد انہوں نے قدرے ریلیکس ہوتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور
ر اس لڑکی کو دیکھنے لگے...... جس کی آتی جاتی سانسوں کو برقرار رکھنے کے لیے ان چار ڈاکٹروں
نے پورے چھ گھنٹے صرف کیے تھے اور اس قدر محدود وسائل میں اس لڑکی کا زندہ رہنا یقیناً کوئی معجزہ
تھا۔

حلق اور ناک میں مٹی گھس جانے کے باعث اس کی سانس نارمل نہیں رہی تھی۔ بایاں بازو کسی
اری چیز کے نیچے دبا رہنے کی وجہ سے گینگرین کا شکار ہو چکا تھا۔ ہاتھ کی انگلی میں پہنی انگوٹھی پیک
ر گوشت میں گھس گئی تھی...... اس لیے فوری طور پر اس کا بازو کہنی سے اوپر تک کاٹنا پڑا تھا۔ دائیں
نگ میں بڑے جبکہ بائیں ٹانگ میں کئی چھوٹے چھوٹے زخم تھے...... لیکن بہرحال یہ شکر تھا کہ جسم
کا اوپر کا حصہ کسی خاص رکاوٹ کے سبب محفوظ رہا تھا...... وہ ابھی تک مسکن ادویات کے زیر اثر
تھی...... ذہنی حالت کے بارے میں یقینی طور پر تو نہیں تاہم اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کس حد تک
متاثر ہوئی تھی...... ایک بار ہسٹریائی انداز میں وہ یوں بے قابو ہوئی تھی کہ حلق سے سوائے دردناک
چیخوں کے اور کوئی لفظ نہ نکل پا رہا تھا۔ کوئی شدید قسم کی جدوجہد اس کے اندر اس طرح جاری تھی کہ
کہیں دوبارہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

وہ ہولے سے کچھ بڑبڑائی تھی۔

تب وہ ذرا چونکے...... اور گہری سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے...... ہاتھ کو ذرا سا جھٹک کر
گھڑی سامنے لاتے ہوئے انہوں نے اس کی نبض تھام لی تھی۔

تب ہی کسی نے اندر جھانکا تھا۔

"ڈاکٹر تارا ہوش میں آ گئی ہیں زین!"

انہوں نے سر اٹھا کر اطلاع دینے والے کو دیکھا...... کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر انگلیوں کے
نیچے دبی نبضیں ایک پل کے لیے تیزی سے دھڑکیں' انہوں نے فوری طور پر رخ بدل کر اسے دیکھا
اسی دوران اس کمزور اور سرد ہاتھ نے ان کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔
اس گرفت کی شدت ان کے لیے حیران کن تھی۔



زمین اور آسمان کے بیچ سفید دھند بھری ہوئی تھی۔

چمکدار اور سرد دھند۔ بدن کو کپکپا دینے والی اور وہ اس دھند پہ پیر دھرتی یہاں سے وہاں پھر رہی تھی۔

"لاجور! کپڑے بدل لو جانو! زریاب آرہا ہوگا۔" ممی کی قطرہ قطرہ آواز اس کی سماعتوں ٹپکی تو وہ دادی ماں کی طرف بھاگی۔ ڈھیر ساری چوڑیاں ان کے سامنے تخت پر پھیلا دیں اور سونی کلائیاں ان کے سامنے کر دیں۔

"پہنا دیں دادی ماں!"

"میں پہنا دوں......؟" دادی کا معنی خیز بوڑھا لہجہ، اس کی قلقل کرتی ہنسی اس دھند پر کی طرح جگمگانے لگی تھی۔

"تو اور کون پہنائے گا......؟"

"وہ آرہا ہے ناں زیب! کچھ حق تم پر وہ بھی رکھتا ہے۔"

"اف......" اس کی شرگیں مسکراہٹ نے چارسو کیسا اجالا سا کر دیا تھا۔

وہ اٹھ کر دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ دادی کچھ کہہ رہی تھیں مگر اس کی توجہ بھٹکنے لگی۔

"آیا کیوں نہیں ابھی تک......" بے چینی و بے قراری نے اسے مضطرب کر رکھا تھا۔ نظروں سے دادی کی طرف دیکھنا چاہا' مگر دبیز دھند ان دونوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔ تسبیح کے چند دانے تھے جو اس دودھیا غبار پر گرتے، ابھرتے دکھائی دے رہے تھے۔

"زیب!" کسی اجنبی آواز کی پکار پہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ اس کے قریب کھڑا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر۔

اور اس کی پر حدت انگلیوں کا لمس مردہ کلائی پر زندگی کا پتا دے رہا تھا۔

"زریاب!" وہ کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح اس کی طرف لپکی......اور پوری قوت کا مضبوط ہاتھ اپنے کپکپاتے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

"زیب! زیب تم کہاں تھے......؟ یہ دیکھو ہمارے ساتھ کیا ہو گیا؟" پہلی بار اس پر در میں کسی اپنے کو دیکھ کر وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"سب کہاں چلے گئے......؟ کہاں کھو گئے......؟ کسی نے میری پکار نہیں سنی......کوئی نہیں دے رہا۔ دادی ماں کہاں ہیں......؟ ممی پاپا اور تم؟ تم کہاں تھے زریاب! تم نے اتنی د

دی؟ تم نے دیکھا مجھے؟ اپنی لاجور کو جو تمہیں بلا بلا کر تھک گئی تھی۔ تم نے دیکھا میں کتنی اکیلی ں؟"

تم نے دیکھا زریاب" میرے ساتھ کیا ہوا......؟"

اسے جھنجھوڑتے جھنجھوڑتے وہ بے دم ہو کر اس کے سینے سے جا لگی تھی۔

"کتنے دن میں نے اندھیری قبر میں گزار دیئے۔ کیڑے میرے مردہ جسم کو نوچ کر کھاتے مگر تم نہیں آئے زریاب...... آسمان ہم پر ٹوٹ پڑا تھا' ہمیں کہیں پناہ نہ ملی۔ زیب میں نے ت درد سہا، بہت درد تھا زریاب، درد ہی درد تھا۔" روتے روتے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ تب ریاب نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔

"ممی مجھ سے بہت دور کھڑی رہیں...... پاپا نے پاس آکر نہ دیکھا۔ وہ کہاں؟ انہوں نے س عذاب میں مجھے تنہا چھوڑ دیا......" اس کی آواز اس کی ہچکیوں میں گم ہونے لگی......آس پاس کا نظر آنسوؤں میں ڈوب گیا تھا۔

زریاب نے کچھ کہا......کیا کہا اسے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ بس اتنا معلوم تھا کہ گہری نیند میں غرق ونے سے قبل تک وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس کے بازوؤں کے حصار میں تھی اور اس کا مضبوط ہاتھ دھیرے دھیرے اسے تھپک رہا تھا۔

اس نیم بے ہوش وجود کو بستر پہ لٹاتے ہوئے ڈاکٹر زین العابدین نے اپنے حواس بکھرتے ہوئے محسوس کیے تھے۔

اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ......گردن کی پھولی ہوئی رگیں، لرزتی پلکیں......کپکپاتے ہونٹ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی ہوئی سسکیاں......اس بے ہوشی کے عالم میں بھی ایک ہاتھ مٹھی کی صورت بستر کی چادر کو بھینچے ہوئے تھا۔

وہ نڈھال سے ہو کر کرسی پر گر گئے۔

سسٹر مہناز اسے چادر اوڑھاتے ہوئے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

ڈاکٹر جون اپنی جگہ ساکت تھے۔

ڈاکٹر زین نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ اپنی خون آلود آستین کو دیکھا اس کے ہاتھ پہ لگی نیڈل کھل جانے کے باعث بہت سا خون ان کی آستین کو رنگین کر گیا تھا۔

"بے چاری لڑکی......!" ڈاکٹر جون نے اپنی عینک اتارتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی

پرنم آنکھیں رگڑیں۔

ڈاکٹر زین نے لب بھینچتے ہوئے اپنا سر تھام لیا۔ اس لڑکی کا رونا، تڑپنا، مچلنا ...... کیا
ناک تھا۔

کسی مضبوط پناہ گاہ کی چاہ میں وہ ان کے وجود میں چھپی جا رہی تھی۔ خبر نہیں وہ اس
سمجھی تھی ......؟ ان سے کیا چاہتی تھی ......؟ بے ربط جملوں، ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بس ا
لفظ کی تکرار تھی۔

"زریاب ...... زیب!"

اور وہ خود لاچار تھی۔

ان دونوں کا کیا رشتہ تھا ...... تعلق کی نوعیت کیا تھی یہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل تو نہ تھا۔

ڈاکٹر زین نے طویل سانس لیتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا سر اٹھایا اور اپنی
فولڈ کرتے ہوئے جیکٹ پہن لی۔

"بہت وقت لگے گا ان لوگوں کو سنبھلنے میں ...... بہت وقت ...... سب کچھ کھو چکے ہیں
لوگ ......" ڈاکٹر جون تاسف سے اپنا سر ہلا رہے تھے۔ زین العابدین کچھ کہے بغیر باہر نکل آئے
دل قطرہ قطرہ لہو بن کر پگھل رہا تھا۔ مگر چہرہ ہنوز پرسکون تھا۔ خود پر جبر وضبط میں کمال
تھا انہیں۔

کوئی بچہ دوڑتے دوڑتے بے اختیاری میں ان سے ٹکرایا ...... جھک کر اسے سنبھالا
ہوئے وہ ذرا سا مسکرائے ...... پھر سیدھے ہوتے ہوئے اپنے دائیں جانب دیکھا ...... وہ فوراً
نین تارا کے سامنے جا کر اسے مزید کمزور پڑتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے مگر دکھ اور تکلیف میں اپنا
ساتھ کس طرح ضرورت بن کر دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس کا مظاہرہ وہ ابھی ابھی دیکھ
تھے۔

ہوا کے سرد جھونکوں سے بچنے کے لئے انہوں نے جیکٹ کے کالر کھڑے کرتے ہوئے
خیمے کی طرف قدم بڑھائے جہاں نین تارا موجود تھی۔ مگر ڈاکٹر تیمور نے اسے راستے ہی میں
تھا۔

"ڈاکٹر احسن لغاری نے فوری طور پر آپ کو بلایا ہے۔ ایک اسٹوڈنٹ زندہ ہے، ہوش و حوا
میں ہے۔ صرف اس کی ٹانگ بری طرح ملبے میں دبی رہی ہے۔ سرجری کرنی ہوگی۔"

ڈاکٹر تیمور نے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے انہیں آگاہ کیا تو وہ ہر سوچ کو ذہن سے جھ

ئے اپنی پیشہ ورانہ مستعدی سے ان کے ساتھ ہو لیے۔



بہت دیر سے وہ بازوؤں میں منہ چھپائے لیٹی تھی ...... اب تک وہ خوب رو چکی تھی اور ایسا
رہا تھا، کسی کا سامنا نہیں کر پائے گی۔

"ایسی کمزور، بزدل ہوں میں۔ چند دنوں میں ہی حوصلہ کھو بیٹھی۔ زین کو بھی کس قدر شرمندگی
ئی ہوگی میری وجہ سے، یقیناً خفا بھی ہوں گے۔ جبھی تو تب سے اب تک یہاں جھانک کر بھی نہیں
یکھا۔" وہ آہستگی سے اٹھ بیٹھی اور سرہانے پڑا دوپٹہ اٹھا کر آنسوؤں سے بھیگا چہرہ رگڑ ڈالا۔

وہ کئی گھنٹے دوا کے زیر اثر سوئی رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے سوج کر بھاری ہو گئے تھے اور سر
ب بھی گھوم رہا تھا۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹتے ہوئے اپنا سر گھٹنوں پر گرا لیا۔

"ہاں بہت کچھ سہنا اور دیکھنا پڑے گا۔ بھوک، سردی، بے آرامی اس کے علاوہ برداشت کر
سکو گی؟"

"کیوں نہیں۔ آخر میں بھی تو ایک ڈاکٹر ہوں ...... بالکل آپ کی طرح۔"

"کس قدر درست شبہات تھے زین کے ...... اور کیسا غلط دعویٰ تھا میرا ......" اس نے شرمندگی
کے مارے اپنے ہونٹ کچل ڈالے۔

"سب لوگ اپنی اپنی جگہ ایستادہ ...... اپنے اپنے فرائض میں منہمک ...... اور میں یہاں پڑی
ہوں۔ بیماروں، مریضوں کی طرح ...... حالانکہ سرتاپا صحیح سلامت ہوں، نہ ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہیں
...... نہ کسی میت کو کندھا دیا ہے، نہ گھربار اجڑا ہے میرا ...... پھر بھی یہ کم ہمتی ...... افسوس کہ میں
دوسروں کو حوصلہ دینے والوں میں سے نہ ہو سکی۔" وہ پچھتاوے کی زد میں نجانے کتنی دیر تک خود سے
لڑتی جھگڑتی رہتی ...... اگر ڈاکٹر عائشہ اندر آ کر اسے نہ چونکا دیتیں۔

"نین تارا! کیوں بیٹھی ہو اس طرح ......؟ لیٹ جاؤ ...... آرام کرو ......" اس کے قریب بیٹھتے
ہوئے انہوں نے آہستگی سے اس کے بال سنوارے۔

"میں ٹھیک ہوں ......" اسی زاویے میں بیٹھے بیٹھے اس نے بھیگی آواز میں جواب دیا۔

"بھوک تو لگ رہی ہوگی ...... کچھ کھاؤ گی ......؟" ڈاکٹر عائشہ کا نرم، شیریں لہجہ۔

"دل نہیں چاہ رہا ......" اس نے خود پر قابو پایا ...... چپکے سے اپنے آنسو صاف کیے اور سیدھی
ہو بیٹھی۔

"یوں کرو جوس پی لو ...... میں ابھی دیتی ہوں۔" وہ اٹھنے کو تھیں کہ نین تارا نے روک دیا۔

"میں لے لوں گی ڈاکٹر عائشہ! پلیز۔"

"سردی بہت ہوگئی ہے نین تارا! باہر تو جیکٹ، جرسی کے بغیر مت آنا...... یہاں کچھ سکون ہے...... مگر باہر کی سرد ہوائیں...... ہمارے تو ابھی سے دانت بجنے لگے ہیں۔ ریسٹ کرو۔ میں بس تمہیں دیکھنے آئی تھی۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"سنو! اب تو ریلیکس فیل کر رہی ہو ناں؟" انہوں نے قدرے توقف سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اوپر اٹھایا۔

"ہاں......" اس کی مسکراہٹ کا پھیکا پن پوری طرح عیاں تھا...... جسے ڈاکٹر عائشہ انداز کر گئی تھیں۔

"ایک ڈیلیوری کیس ہے...... خاتون صدمے کی وجہ سے سکتے کی حالت میں...... میں پریشان ہوں...... ڈاکٹر احسن سے مشورہ کرتی ہوں جا کر...... تم خود کو بہتر محسوس کرو تو کچھ مریض دیکھ لینا...... بعض عورتیں تو میل اسٹاف کو قریب نہیں آنے دیتیں...... چلتی ہوں۔" وہ اس تھپتھپا کر باہر نکل گئی تھیں۔

"اول روز کی طرح پرعزم...... چاق و چوبند...... تمہارے ہمت و حوصلے کی کیا اوقات تارا؟ کس برتے پر یہاں چلی آئی تھیں تم!" اسے ڈاکٹر عائشہ کے سامنے اپنا آپ بہت چھوٹا تھا۔

"ان ہی سے کوئی سبق سیکھ لو نین تارا! کیوں ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھی ہو۔" اس نے اپنی ہوئی قوتوں کو ایک بار پھر یکجا کرتے ہوئے سوچا اور باہر نکلنے کے لیے شال اوڑھنے لگی۔

♦❖♦

"ڈاکٹر زین کہاں ہیں؟" ڈاکٹر احسن لغاری داؤں کے اسٹاک کا جائزہ لے رہے تھے ڈاکٹر جون حواس باختہ سے ان کی طرف بھاگے چلے آئے تھے۔

"اینی پرابلم......؟" ڈاکٹر احسن نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے ان کی اڑی رنگت کو دیکھا۔

"وہ لڑکی...... لا جور بری طرح ہسٹریک ہو چکی ہے۔ رونے، چلانے کے ساتھ دوسروں کو مارنے کی کوشش کر رہی ہے...... کسی ڈاکٹر، کسی سسٹر کو قریب نہیں آنے دے رہی...... کے سارے زخم کھل جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں ڈاکٹر زین فوری طور پر اسے ٹریٹ کریں۔"

"ڈاکٹر زین......؟" انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے استفہامیہ انداز میں ڈاکٹر جون

"ہاں کوئی مشابہت ہے...... ڈاکٹر زین اور اس شخص میں، جسے وہ مسلسل پکارتی رہی ہے...... ڈاکٹر زین سے ٹوٹلی ڈفرنٹ بی ہیو کر رہی تھی...... اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ......"

"وہ بھلا آدمی ابھی ابھی منوں ملبے تلے دبے ایک لڑکے کی سرجری کر کے اسے زندہ بچا لایا ہے...... اسے اس وقت آرام کی سخت ضرورت ہے ڈاکٹر...... اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کسی دوسرے کو موت کے منہ سے نکالنا مشکل ہی نہیں، اذیت ناک بھی ہوتا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر کی حیثیت سے تم یقیناً بہتر سمجھتے ہو۔"

"لیکن وہ لڑکی...... مجھے امید ہے ڈاکٹر زین یقیناً اس وقت میری مدد کرنا پسند فرمائیں گے۔" ڈاکٹر جون ذرا سا جھنجھلائے۔

"یقیناً...... میں بھی اس سے یہ ہی توقع رکھتا ہوں...... تاہم میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ اس وقت تم اس لڑکی کو کوئی ٹرنکولائزر دے دیتے...... بہرحال تم ڈاکٹر زین سے مل لو...... آؤ میرے ساتھ۔"

ڈاکٹر احسن لغاری کو اندازہ تھا کہ ڈاکٹر جون ٹلنے والے نہیں جبھی قدرے بے بس سے ہو کر وہ ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ورنہ ان کا ذاتی خیال یہ ہی تھا کہ کم از کم موجودہ صورت حال میں، جب ایک ڈاکٹر کو بیک وقت بیسیوں مریض دیکھنے تھے، ڈاکٹرز کی ذہنی و جسمانی صحت کا خیال رکھنا زیادہ ضروری تھا۔ مسلسل ہونے والی بارشوں میں آج صبح سے ٹھہراؤ تو آ گیا تھا، مگر جب تک یہ فضائیں امدادی ہیلی کاپٹروں کو زمین پر اترنے نہ دیتیں تب تک ان کی بھرپور کوشش یہ ہی تھی کہ وہ اپنی ٹیم کے ہر ممبر کو اتنا ریلیف ضرور دیں کہ وہ اپنے فرائض بھرپور طریقے سے انجام دیتے رہیں۔ کیمپ کے اندر جانے تک ان کے دل سے یہ ہی دعا نکلتی رہی کہ ڈاکٹر زین العابدین اس وقت گہری نیند میں ہوں۔

انہوں نے سوچ رکھا تھا اگر ایسا ہوا تو وہ زین کو ڈسٹرب کیے بغیر خود اس لڑکی کو دیکھ لیں گے...... انہیں اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت اور مہارت و تجربے پر کامل یقین تھا۔



بوجھل پپوٹوں کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائیں۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ نجانے کیا حائل تھا بیچ میں کہ دوبارہ آنکھیں بند کرنے سے قبل وہ اس کے چہرے کا کچھ حصہ ہی دیکھ پائی تھی۔

سرگوشیوں کی صورت میں کچھ آوازیں اس تک پہنچتی رہیں...... پھر چند لمحوں بعد ہی پرحرارت

بھاری ہاتھ کا دباؤ اس کی پیشانی پہ آ کر ٹھہرا تو دکھتی ہوئی کنپٹیوں میں سکون سے اترنے لگا تھا
وہ اسی ایک لمس کو تادیر محسوس کرنے کی خواہش مند تھی۔

"لاجور! تم ٹھیک ہو؟"

وہ اسے بہت قریب سے سن رہی تھی۔ آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر عجب
چھایا ہوا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اسے واضح طور پر دیکھ نہ پائی۔

"کچھ بولو لاجور! کچھ بتاؤ..... تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

وہ اس کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا مگر تیز بخار بدن کی رہی سہی توانائیاں بھی نچوڑ چکا تھا۔ خشک لبوں پہ
پھیرتے ہوئے اس نے نقاہت و بے چارگی سے اسے دیکھا۔

"تم بالکل ٹھیک ہو..... کچھ زخم ہیں جو چند دنوں تک بھر جائیں گے۔ کچھ کھاؤ گی؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ دھندلی نگاہیں اس پہ ٹکائے رہی پھر کسی نے
اسے کندھوں سے ذرا اوپر اٹھا کر تکیوں کا سہارا دے دیا تھا۔ بھاپ اڑاتا پیالہ اس کے سامنے
قطرہ قطرہ سوپ اس کے حلق سے نیچے اترنے لگا۔

"زریاب!" اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پکارتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"میں یہیں تمہارے پاس ہوں۔ گھبراؤ نہیں....." بڑا تسلی بخش لہجہ تھا مگر وہ بے یقین تھی
تھا کہ آنکھ بند ہوئی تو وہ پھر سے کھو جائے گا۔ سو اس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں دبو
پھر مزید سوپ پینے سے انکار کرتے ہوئے اسے نے ترچھی نظروں سے اپنے بائیں بازو کو دیکھا
پٹیوں میں جکڑا ہوا ادھورا بازو۔

جب سے احساس ہوا تھا دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔

وہ ادراک کرنا چاہتی تھی کہ اس نے کیا، کیا کھو دیا ہے؟

"تمہاری زندگی زیادہ قیمتی تھی لاجور! مجبوراً یہ کرنا پڑا۔" اس کی نظروں کا مفہوم جان کر
نے بہت سبھاؤ سے کہا تھا۔

"میرا ہاتھ.....؟" وہ ہکلائی۔

"میری انگوٹھی.....؟" زیب! تم نے پہنائی تھی ناں وہ رنگ.....؟" زیب نے کوئی جواب
دیا تھا۔

لاجور نے قدرے بے قراری سے اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹی رہو لاجور!" اس کے شانوں پر دباؤ پڑا۔

"مجھے دیکھنے دو..... کیا کچھ میرے پاس نہیں رہا.....؟"

وہ متوحش ہو کر بولی تھی..... تب زیب نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔

"کچھ نہیں ہوا تمہیں..... باقی سب ٹھیک ہے لاجور۔"

اس نے زیب کے کہے پر یقین نہیں کیا..... چادر ہٹا کر اپنی ٹانگوں کو ٹٹولا..... پیروں کو محسوس

کہیں سوجن تھی..... کہیں پٹیاں بندھی تھیں کہیں خون کے دھبے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر
قریب بیٹھے زریاب کو حیرت سے دیکھا۔

"کیا ہوا تھا مجھے زریاب.....؟" اس نے اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی۔

"تم بول کیوں نہیں رہے زیب!" اس کی طویل خاموشی پر وہ ناگواری سے بولی۔

"تمہارا مکان گر گیا تھا۔"

"مکان.....؟" اس کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھری۔

"مکان کیسے گر گیا.....؟ کب گر گیا؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا..... مکان۔" وہ عجب کشش و پنج میں پڑ گیا۔ سوچ کا سفر محدود تھا۔

"تم تھک گئی ہو..... کچھ دیر آرام کرو..... پھر سب یاد آ جائے گا۔" اس نے زیب کو کہتے سنا
تو محسوس کیا واقعی بہت تھکن ہے..... یونہی کسی الجھن میں ڈوبی وہ لیٹ گئی۔ زیب اس کا سر سہلا رہا
تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر دماغ چک پھیریاں کھا رہا تھا۔

"مکان گر گیا۔ مکان گر گیا۔" اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

"کیسے.....؟ کب.....؟"

"دھڑام..... دھڑام....." ہلکا سا دھماکہ۔

"آہ....." وہ جی جان سے لرزی۔

"دھڑام....." کمرے کی چھت اس پر آ گئی..... دیواریں لمحہ بھر میں تڑخیں زمین میں شگاف۔

"آ....." اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی..... خود کو بچانے کی کوشش میں اٹھنا چاہا تھا کہ
زیب نے سنبھال لیا۔ اس نے متوحش ہو کر آنکھیں کھولیں..... چاروں اور دیکھا۔

پھر زریاب کو.....؟

"زیب! ممی.....؟ پاپا..... دادی اماں؟" شعور پہ پڑے کئی پردے ایک ساتھ چاک

ہوئے۔

''ہاں ...... مکان ...... گر گیا تھا ...... دادی بھی وہیں تھیں میرے ساتھ ...... ممی بھی۔ سب ہی ہیں زریاب؟'' وہ انجانے خدشوں میں گھری لرز رہی تھی۔

''پاپا نہیں آئے ...... وہ ٹھیک تو ہیں ناں ......؟'' اس نے اپنے بدن سے دھیرے دھیرے جان نکلتی محسوس کی۔

''ہاں ...... سب ٹھیک ہیں تم اب سو جاؤ لاجور ......!'' زریاب کے کھوکھلے لہجے میں درشتی محسوس کرتے ہوئے وہ بری طرح سہم گئی تھی۔

''تم یہیں ہو ناں زریاب! میرے پاس؟''

''ہاں ......''

''مجھے چھوڑ کر مت جانا زریاب ...... مجھے بہت ڈر لگتا ہے ......'' وہ آنکھوں پہ بازو رکھے گئی مگر بے چینی ہر ہر حرکت سے عیاں تھی۔ اس نے چادر کھینچ کر سینے سے اوپر تک کر لی۔

چند سانسیں بمشکل سینے میں کھینچیں ...... پھر دھیرے سے اپنا بازو ہٹا کر آنسوؤں سے بھری آنکھیں کھول کر زریاب کی آنکھوں میں جھانکا۔

''وہ سب نہیں رہے ناں ......؟'' اس نے دھیرے سے سرگوشی کی، جانے کس امید پر زریاب کو دیکھے گئی۔

وہ چاہتی تھی زریاب اسے ڈپٹ کر اس خدشے کی تردید کر دے ...... اس کی بات کو جھوٹ دے مگر وہ بہت دیر بعد بولا تھا۔

''میں نہیں جانتا ...... وہ لوگ کہاں ہیں ......؟ کس حال میں ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ زندہ ہوں ہو سکتا ہے نہ ہوں۔ ایک تمہارا گھر نہیں شہروں کے شہر اجڑ گئے ہیں، بستیاں ویران ہو گئی ہیں۔ یہاں سے نکلو گی تو دیکھ سکو گی کہ تمہارا شہر اب وہ نہیں رہا۔ تمہارا زندہ رہ جانا ایک معجزہ ہے۔ خدا کرے کہ وہ سب لوگ بھی خیریت سے ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو جلد یا بدیر وہ تم سے ضرور آن ملیں گے۔'' زریاب کی نرم پوریں اس کی آنکھوں سے بہتی نمی کو سمیت رہی تھیں۔

وہ حیرت و بے یقینی کو آنکھوں میں سمائے، بنا کوئی لفظ کہے زریاب کی باتوں پر غور کرتی رہی۔

''اے خدا! کیا واقعی یہ سب ہو گیا ......؟ جو زریاب کہہ رہا ہے۔''



وہ ان کے بالکل سامنے تھی ...... اپنے کام میں محو ...... پوری طرح مصروف ......

اس کی نازک، سبک انگلیاں بڑی تیزی سے زخموں پر مرہم رکھ رہی تھیں ...... زین العابدین محسوس کر رہے تھے کہ وہ دانستہ ان کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔ انہوں نے کئی بار اسے خود سے نظر چرا کر ادھر ادھر ہوتے دیکھا تھا۔ سحری اور افطاری میں بھی جانے کہاں چھپ جاتی تھی۔ کچھ تو مصروفیت کا ہی یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے سے بات کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ کچھ نین تارا کی بے اعتنائی۔

انہیں پوری طرح اندازہ تھا اس کی کیفیت کا۔ اپنی کسی کمزوری کے اظہار پر وہ دنوں ان سے کترائی پھرا کرتی تھی۔

کبھی کوئی ٹیسٹ اچھا نہیں ہوا۔ کبھی ان کی کوئی کتاب، ڈائری اس سے کھو گئی، کبھی کوئی کام ٹھیک نہیں ہوا ...... حتیٰ کہ نادانستہ ہو جانے والی غلطیوں پر بھی وہ یونہی گھبرا کر کئی روز تک ان کے سامنے نہ آنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

معلوم نہیں یہ کیسی جھجک کیسا ڈر تھا اس کے اندر مگر صرف ان ہی کے لیے ورنہ تو انہی غلطیوں، کوتاہیوں پر گھر کے بڑوں سے ڈانٹ ڈپٹ سن کر بھی بدمزہ نہ ہوتی تھی۔

''آصف!'' انہوں نے عجلت میں اپنے قریب سے گزرتے ایک رضاکار کو آواز دی۔

''ڈاکٹر تارا سے کہیں ...... اگر فارغ ہوں تو دو منٹ کے لئے میری بات سن لیں۔''

وہ خود ایک ادھیڑ عمر شخص کی گال پر لگے زخم پر ٹانکے لگا کر فارغ ہوئے تھے۔ موسم آج بہت خوشگوار تھا۔ سورج کی سنہری کرنوں کی ہلکی سی جھلک ان سب کے دلوں میں امید کی نئی جوت جگا گئی تھی۔

بے شمار منتظر نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ بے چین سماعتیں ہیلی کاپٹروں کی بھاری بھر کم گونج سننے کی خواہشمند تھیں۔

مزید امداد پہنچے گی ......

کچھ اور مسیحا آئیں گے ......

جاں بلب لوگوں کو ہسپتال ملیں گے۔

گرم کپڑے آئیں گے لحاف، بستر اور خیمے۔

بدن کو کاٹ دینے والے یخ بستہ موسم سے بچاؤ کا کچھ تو انتظام ہو گا۔

کوئی تو آئیں گے جو ان کے پیاروں کے سینوں پہ پڑی بھاری سلوں کو ہٹا سکیں گے جو مرنے والوں کے لیے نماز جنازہ پڑھیں گے۔ جو قبریں کھودیں گے۔ ہر چہرہ ایک امید کی زد میں تھا

ہر چہرے پر آس ابھری تھی۔

"یا اللہ! اپنی رحمت سے نواز دے۔ ان بے سرو سامان لوگوں کے لیے جو اسباب بن رہے ہیں انہیں ان تک پہنچنے کے لیے وسیلہ عطا فرما۔"

ان کے لبوں سے بے اختیار دعا نکلی...... "ڈاکٹر احسن سے بات کرتا ہوں...... آتے ہی فوری طور پر ہمارے کچھ ٹیم ممبرز کو ریلیف دے دیا جائے...... کم از کم نین تارا کو تو فوری طور پر واپس بھجوا دوں گا۔" انہوں نے اپنی طرف آتی نین تارا کو بغور دیکھا۔

لاکھ وہ ضبط ہنر آزماتی رہے۔ ان سے تو کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کی تک پہچانتے تھے وہ۔

"آپ نے بلایا تھا......" ان کے سامنے رکنے کے بجائے برابر میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ سرسری نگاہیں بھی ہزار مفہوم رکھتی تھیں۔

"ہاں، کام کیسا چل رہا ہے؟" انہوں نے گردن موڑ کر اس کی زرد رنگت کو دیکھا۔ ہونٹ رنگ ہو چکے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے بے حد گہرے تھے۔ انہوں نے نگاہوں کا زاویہ بدلا اور طرف کو چل دیئے۔

وہ قدرے توقف سے ان کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"بیٹھو!" کچھ دور جا کر ایک بڑے پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی اس کے ٹک گئے تھے۔

"جانتی ہو نین تارا! میں ایک بار پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔"

نین تارا چونک گئی۔ بالکل ہی غیر متوقع بات۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ بڑی افسردگی سے چار سو پھیلے ویران منظر کو دیکھ رہے تھے۔

"حسن اس شہر کی گلیوں میں کھیلتا تھا اور در و دیوار سے جیسے خوشبوئیں پھوٹتی تھیں۔ ہر شے شفاف، پرنور، سرسبز تھا۔ دریائے نیلم، سفید قلعہ، وادی نیلم پیر چناسی اس سرزمین کے گوشے گوشے میں زندگی رقص کرتی تھی جہاں اب موت کا تعفن جی بھر کر سانس بھی نہیں لینے دیتا۔" ان کی آنکھوں کے زیر کنارے سرخ ہوتے دیکھ کر نین تارا نے سر جھکا لیا۔

آزردگی میں گھرے کچھ پل یونہی بیت گئے تھے۔

"میں خود کو بہت تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگا ہوں۔"

انہوں نے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھاتے ہوئے دونوں بازو سینے پہ باندھ لیے۔

"دل پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے آرام کرنے کو وقت نہیں اور وقت ملے تو آرام میں سکون

نین تارا کسی قدرے بے یقینی سے ان کا چہرہ کھوجنے لگی۔ تب ہی انہوں نے گردن گھما کر اس آنکھوں میں جھانکا...... وہ کچھ دیر کے لیے ان پر سے نظریں ہٹا نہیں سکی تھی۔

جانے کیوں ان کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بھلا زین العابدین جیسے لوگ بھی یوں ہارے ہوئے لہجے میں بات کر سکتے ہیں؟"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں......؟" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"جھوٹ......؟" انہوں نے متعجب انداز میں اسے دیکھا۔

"اس میں جھوٹ کیا ہے نین تارا......! کیا تم مجھے انسان نہیں سمجھتیں......؟"

"لیکن آپ...... تھکنے والوں میں سے تو نہیں......" وہ دھیرے لہجے میں کہہ گئی۔

"ہاں میں تھکنے والوں میں سے تو نہیں......" وہ دھیرے لہجے میں کہہ گئی۔

"ہاں میں تھکنے والوں میں سے نہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"لیکن تھک چکا ہوں...... میری انگلیوں کی پوروں نے اتنے زخم سہے ہیں کہ اب ان کی لرزش ہی اترنے لگی ہے۔ آنکھوں میں اتنی تاب نہیں کہ کچھ اور پردرد مناظر دیکھ سکیں۔" انہوں نے چند پتھروں کو اپنی ٹھوکر سے ادھر ادھر لڑھکایا۔

"بہت دن ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے...... میں اب کچھ دنوں کے لیے واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا ہمت و حوصلہ کھو دوں میں تازہ دم ہونا چاہتا ہوں۔ موسم بہت بہتر ہو گیا ہے امید ہے چند گھنٹوں تک ہیلی کاپٹروں کی پروازیں شروع ہو جائیں گی، خدا نے چاہا تو یہاں سے نئے لوگ ہماری جگہ لے لیں گے ہم سے زیادہ سرگرم، فعال اور پر جوش ہوں گے وہ لوگ۔ تم نے دیکھا ہے نا آرمی کے لوگ کتنے چاق و چوبند ہیں۔ میں ڈاکٹر احسن سے بات کرتا ہوں ہو سکے تو ہم ایک دو روز تک واپس چلے جائیں گے۔"

انہوں نے جیکٹ کی جیب سے ہاتھ نکالتے ہوئے اس کی طرف پھیلایا تو وہ سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

نہ جانے کیوں دل کے کسی اندرونی گوشے میں ہلکا سا سکون اترتا ہوا محسوس ہوا تھا اسے۔ پرسکون گھر، روشن در و دیوار، اس گھر کے مکین۔ اس کا دل وہاں جانے کے لئے ہمکنے لگا تھا۔

اگلے دو روز تک وہ قدرے پرسکون ہو کر اپنا کام کرتی رہی لیکن تیسرے دن بہت سے زخمیوں کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں سوار ہوتے ہوئے اسے ایک نیا دھچکا لگا تھا۔

"ہم ایک، دو روز تک واپس چلے جائیں گے۔" زین العابدین کا جملہ اسے بھولا نہیں تھا۔ اس نے عجیب خالی خالی نظروں سے اپنے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

بہت سے زخمی۔

سسٹر رقیہ، ایک دو رضا کار اور وہ خود۔

"تو گویا ہم نہیں صرف میں......؟" اس کے حلق میں پھندا سا پڑنے لگا تھا۔

اس نے بے دردی سے اپنے ہونٹ کچلے اور آس پاس کے ہر منظر سے آنکھیں چرا کر گھٹنوں میں چھپا لیا۔



راولپنڈی پہنچتے ہی الینہ اور شہریار عباسی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اس کے پہنچنے کی سے خبری تھی انہیں۔

الینہ تو کئی پل تک متحیر کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"یہ تم نے کیا حال بنا ہے اپنا؟" نین تارا کوشش کے باوجود بھی مسکرا نہ پائی تھی۔

الینہ اس سے گلے ملنے کے بعد بغور دیکھنے لگی:

"بہت زرد اور کمزور ہوگئی ہو۔ کیا خود بھی بیمار پڑ گئی تھیں؟"

"ہاں ...... بس کچھ ......" اس نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے بات بنانا چاہی، جب شہریار عباسی گاڑی لے کر آ گئے تھے۔

"آجائیے محترم خواتین! میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔" انہوں نے بشاش انداز میں گاڑی کے کھلے شیشے سے انہیں پکارا پھر راستے بھر زیادہ تر وہ خود ہی بولتے رہے۔ حالانکہ ویسے کافی کم گو انسان تھے۔

تارا کبھی ان کی بات سنتی، کبھی بے دھیانی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔

الینہ نے ایک آدھ بار مظفر آباد کے حالات کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہا پھر شہریار کے اشارے پر خاموش ہو رہی۔

گھر کے سامنے گاڑی رکتے ہی شہریار اسے بازو کے حلقے میں لیے اندر آ گئے تھے۔ الینہ وہیں سے باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں۔

"آثار سے ملاقات ہوئی تھی پچھلے دنوں۔ وہ لوگ بالاکوٹ کی طرف نکل گئے تھے۔ جانتی ہو بالاکوٹ پر جان چھڑکتا تھا۔ ہر سیزن میں ایک چکر ضرور ہی لگاتا تھا' پھر اب دوسروں سے پیچھے رہ سکتا تھا وہ۔" شہریار اپنائیت بھرے لہجے میں اسے فرداً فرداً سب کے بارے میں بتا رہے تھے۔

"گھر میں تو اکثر و بیشتر ہی بات ہوتی رہتی ہے۔ ماموں جان بالکل خیریت سے ہیں۔ چھوٹی بڑی ممانی بھی ٹھیک ٹھاک ...... بی بی نیز البتہ تمہاری اور زین العابدین کی طرف سے خاصی فکر مند تھیں۔ خیر اب آرام کرنے کے بعد ان سے بات کر لینا۔"

وہ اس کے کھوئے کھوئے، گم صم سے انداز کو بخوبی دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ زین العابدین سے پہلی بات نہ بھی ہوتی، تب بھی وہ یقیناً واقف حال ہوتے۔ اس لڑکی کو گودوں کھلایا تھا انہوں نے۔ چہیتے ماموں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اپنے بابا کی جاب کی وجہ سے شہریار عباسی نے ماں کے ساتھ طویل عرصہ اپنی ننھیال میں گزارا تھا پھر چھوٹے ماموں فوت ہوتے تو نین تارا اور ذی وقار اتنا روئے ہوں گے جتنا شہریار عباسی ان دونوں کے لیے روئے ہوں گے۔ گزرتے وقت نے زمینی فاصلے بڑھا دیئے تو الگ بات۔ وگرنہ تو وہ ابھی بھی ان کی تکلیف پر اپنی جان نکلتی محسوس کرتے تھے۔

الینہ چائے بنا کر لے آئی تھیں۔ ساتھ میں بہت سے لوازمات۔

شہریار دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اتنا سا وقت بھی بہت مشکل سے نکال کر آیا ہوں۔ تم لوگ چائے پیو، میں اب چلتا ہوں۔"

انہوں نے موبائل اور گاڑی کی چابیاں اٹھائیں پھر نین تارا کو بھرپور آرام کی تاکید کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ ملٹری ہاسپٹل راولپنڈی میں تعینات تھے۔ ان سے چھوٹا زیرک عباسی آرمی ایوایشن میں پائلٹ تھا۔ سب سے بڑے بھائی زبیر عباسی، وہ سعودیہ میں ہوتے تھے۔ پھپھو آج کل ان ہی کے پاس تھیں۔

الینہ چائے کے دوران اسے سب کی مصروفیت کے بارے میں بتاتی رہیں۔ وہ کسی زمانے میں شہریار عباسی کی کلاس فیلو ہوا کرتی تھیں۔ اب شریک سفر بھی تھیں۔ چائے سے فارغ ہو کر وہ بعدازاں اسے ایک ویل ڈیکوریٹڈ بیڈ روم میں چھوڑ گئیں۔ تھکے تھکے اعصاب اور دکھتے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ نرم گرم بستر پہ آئی تو خیال تھا کہ شاید یہاں پڑتے ہی سو جائے گی' مگر کمرے کی پرسکون اور خاموش فضا میں وقفے وقفے سے ابھرتی چیخ و پکار نے تادیر اسے بے چین کیے رکھا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے کتنے ہی زخم آلود چہرے شکوہ کناں نظریں لیے ڈوبتے ابھرتے رہتے۔

سارے وجود پر جیسے پتھر لڑھکنے لگے تھے۔ آنکھوں میں کنکریاں سی چبھنے لگیں۔ تب لاچار و بے بس ہو کر الینہ کے کمرے کے کھلے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔

"الینہ بھائی! پلیز مجھے نیند کی کوئی ٹیبلٹ دے دیں۔"

اپنی دراز خالی کرتے ہوئے الینہ نے اسے چونک کر دیکھا۔

"شہریار کتنی تاکید کر کے گئے تھے۔ اس لڑکی کا بے حد خیال رکھنا اور اس کی حالت تو پہلے بھی بدتر دکھائی دے رہی ہے۔"

وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں پھر اسے نیند کی گولی کھلا کر اس وقت تک اس کے پاس بیٹھی، اس کے بال سہلاتی رہیں جب تک انہیں اس کی گہری نیند میں ڈوب جانے کا نہیں ہو گیا تھا۔

◆❖◆

رات کا تیسرا پہر چل رہا تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔

کمرے میں پھیلی ہلکی نیلگوں روشنی نے اسے کچھ پل الجھائے رکھا تھا۔ فوری طور پر د نہ سکی کہ وہ کس جگہ موجود ہے۔ یونہی کسلمندی سے کروٹ بدلی۔ کچھ جانی پہچانی چیزوں پر نگاہ تب یاد آیا وہ آج صبح یہاں پہنچی تھی۔

کمرے کی کوئی کھڑکی غالباً کھلی رہ گئی تھی۔ سرد خنک ہوا مسلسل اندر آ رہی تھی۔ اس کے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور کافی دیر تک یونہی لیٹی رہی۔ بہت دنوں بعد یوں ایک مکمل پر ماحول ملا تھا۔ رفتہ رفتہ بھوک کا احساس ستانے لگا۔ ٹیبل لیمپ جلاتے ہوئے اس نے ٹائم پیس ڈالی۔

گھر کے سب افراد تو اس وقت محو خواب ہوں گے۔ اس نے بیڈ سے اترتے ہوئے جوتا پہن کر ہولے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ خاموش اور سنسان راہداری میں زیرو بلب روشن تھا۔ سست روی سے کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ ذرا سا چونکی۔

لاؤنج سے ٹی وی کی مدھم آوازوں کے ساتھ ساتھ روشنی بھی دروازے سے چھن چھن کر رہی تھی۔

دروازے کو ذرا سا دھکیلتے ہوئے اس نے اندر جھانکا پھر ایکدم سے پورا دروازہ کھول انکل عباسی پائپ منہ میں دبائے ٹی وی کے چینل بدل رہے تھے۔ ایک کتاب گود میں کھلی رکھی بڑے ریلیکس موڈ میں ٹانگوں پہ کمبل ڈالے وہ صوفے پر نیم دراز تھے۔ دروازہ کھلنے پر فوراً انہوں

ے پھر پرتپاک انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اومائی سویٹ ڈاٹر...... ! ہاؤ آر یو؟" ان کی بھاری بھرکم پرجوش آواز کمرے کی خاموشی میں گونجی۔

دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر ٹھیک ٹھاک ہی جھٹکے دیئے تھے۔ رہا سہا خمار بھی جاتا رہا۔ اس نے بے اختیار ہنستے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں انکل! لیکن اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"تھنگ اسپیشل ...... پہلے تمہارے جاگنے کے انتظار میں تھا، پھر میری نیند غائب ہو گئی۔ الینہ کے اندازے کے مطابق تمہیں اب سے دو تین گھنٹے پہلے اٹھ جانا چاہیے تھا۔"

"افسوس میری نیند ان کے اندازوں کے تابع نہیں نکلی، ورنہ آپ میری وجہ سے یوں بے آرام نہ ہوتے۔"

"ارے کیا آرام......؟ کیا بے آرام......؟ تمہاری پھپھو یہاں نہ ہوں تو میرا وقت یونہی کتنا ہے، بہت مزے میں۔" آخری بات سرگوشی میں کہنے کے بعد وہ خود ہی زوردار قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"ارے...... انکل...... سب سو رہے ہوں گے۔" ان کے بلند و بانگ قہقہے سے خائف ہو کر اس نے فوراً یاد دلایا۔

"چلو...... چلو...... باورچی خانے میں......" انہوں نے اس کی بات گویا چٹکی میں اڑا دی تھی۔

"الینہ تمہارے لیے کچھ بنا کر رکھ گئی تھی۔ اب ڈنر کے بجائے سحری کھا لو۔ چائے، کافی بنانے کے لیے میں حاضر ہوں۔" انہوں نے کچن کی لائٹ آن کرتے ہی فریج کھول دیا تھا۔ خود برنر آن کرنے لگے۔

"شہریار اور زیرک تو رات آئے ہی نہیں۔ شہریار البتہ فون پر تمہیں پوچھ رہا تھا۔ کیا بنا لوں، چائے یا کافی......؟"

"چائے ٹھیک رہے گی۔" اس نے میکرونیز کا باؤل نکال کر اوون میں رکھا۔ ذرا دیر میں وہ دونوں ہی فارغ ہو کر دوبارہ لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔

گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے انکل عباسی ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرتے رہے۔ اچھے خاصے جی دار انسان تھے [illegible] کی حیثیت سے آرمی سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ایک دو سال

آرام کیا پھر ایجوکیشن فیلڈ میں آ گئے۔ گھر میں ہوتے تو کوکنگ کرتے یا گارڈننگ...... یہ
تھا ان کا...... جسم بھاری بھرکم...... رنگت سرخ و سپید...... بال روئی کے گالوں ایسے سفید۔
پہلی نظر میں تو دوسروں کو مرعوب ہی کرتے تھے مگر ان کی شخصیت کا نرم، بھلا سا تاثر
تک چھپا نہیں رہتا تھا۔

ان سے باتیں کرتے ہوئے نین تارا نے خود کو گزشتہ روز کی مایوسی، قنوطیت اور افسر
قطعی طور پر آزاد ہوتے پایا تھا۔

اس دوران الینہ بھی اٹھ چکی تھیں۔

فٹافٹ پراٹھے بنا کر کباب تلے، بھجیا گرم کی اور ٹرے سجا کر لاؤنج میں چلی آئی
عباسی نے معذرت کر لی۔ نین تارا نے البتہ کچھ پراٹھا کباب کے ساتھ کھا کر چائے کا
اٹھا لیا تھا۔

سائرن ہوتے ہی انکل اٹھ کر مسجد کی طرف چل دیئے۔

''گھر فون کرنا ہو تو کر لو نین تارا! اس وقت تو سب ہی جاگ رہے ہوں گے۔''
برتن سمیٹتے ہوئے کہا تو وہ فلور کشن سے اٹھ کر صوفے پہ ٹک گئی۔ فون سیٹ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔
اتنے دنوں بعد تفصیلی بات کرنے کا موڈ ہو رہا تھا۔

فون بی بی نیر نے اٹھایا تھا۔ لمحہ بھر میں سب ہی کو جمع کر لیا۔ تائی اماں نے، ذی
امی نے، سب نے بات کی۔

''زین العابدین کہاں ہے؟ اس سے بات کرواؤ۔''

''وہ......؟'' اس کے دل میں کانٹا سا چبھا۔

''میرے ساتھ نہیں آ سکے...... ایک دو دن تک شاید......'' اس کی آواز خود بخود دھیمی پڑ

''مخلوق خدا کی خدمت کا اس سے بڑا موقع شاید کبھی نہ مل سکے، میری بچی! کہیں کوئی کوتاہی
نہ کرنا، کوئی کسر مت چھوڑنا۔ یہ بات ہمہ وقت ذہن میں رکھنا کہ تمہارے اللہ نے تمہیں
والوں میں نہیں، مدد دینے والوں میں رکھا ہے۔ کئی جانوں کا وسیلہ بنو گی تم۔ اس سے بڑھ کر
اور کیا ہو گی۔''

''تایا ابا کا مشفق لہجہ...... ریسیور کانوں سے لگائے وہ ایک بار پھر جیسے اپنے سامنے
گئی۔ مزید کچھ کہا، سنا نہ گیا تو چپکے سے ریسیور رکھ دیا پھر وضو کر کے جائے نماز پہ کھڑی ہو گئی۔
اسے اپنے رب سے کچھ حوصلہ درکار تھا۔



زیرک سے اسی شام ملاقات ہوئی تھی۔

گھر میں سوائے نین تارا کے اور کوئی نہ تھا۔ الینہ صبح کی گئی، اب تک نہ لوٹی تھیں۔ انکل عباسی
کا بھی کچھ یہی حال تھا۔

وہ خالی گھر کی سنسان سی راہداریوں اور کمروں میں گھوم پھر کر تھکنے کے بعد باہر نکل آئی تھی۔
ڈھلتی شام کی زرد مرجھائی ہوئی کرنیں لان کی گھاس کے آخری سروں کو چھو رہی تھیں۔
وہ لکڑی کا سفید گیٹ کھول کر باہر نکل آئی۔ لمبی روش کے دونوں جانب گھنے سبزے نے اسے
بری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ کچھ سبز، کچھ زرد پتے بڑی بے ترتیبی سے روش پہ بکھرے ہوئے تھے۔
وہ اپنے ہی خیالوں میں الجھی ہوئی یہاں سے وہاں چکراتی رہی۔ جب گاڑی اس سے کچھ
فاصلے پر آ کر رکی تھی اور گاڑی میں سے اترنے والا زیرک عباسی تھا، اس کا دوست......
آتارا اور زیرک کے سوا کوئی تیسرا اس کا دوست تھا نہ اس نے بنانے کی کوشش کی تھی۔ رسمی دعا
سلام بہت لوگوں سے تھی، لیکن دل انہی سے ملتے تھے۔ اس نے آتے ہی اپنی کیپ اس کے سر پہ

''آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں، چہرہ بھی اترا ہوا مگر جب بولا تو جوش و جذبہ اس کی آواز
سے نمایاں تھا۔ انکل عباسی نے بتایا تھا اسے۔''

''چوبیس گھنٹے مسلسل پروازیں، مگر زیرک ہے کہ تھکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس کے آفیسر حیران
ہیں، فیول ڈلوانے میں جو وقفہ ہو سو ہو، ورنہ وہ خود تو چند منٹ بھی اپنے لیے نکالنے کو تیار نہیں۔''
اور نین تارا کو لگا تھا، یہ سب اسے سنایا جا رہا ہے، جان بوجھ کر۔

زیرک کپڑے بدل کر باہر آیا تو وہیں گھاس پہ دراز ہو گیا۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھی گھاس
نوچ رہی تھی۔

''کب واپسی ہوئی؟''

''کل۔''

''اور وہ تمہارے صاحب بہادر! ڈیشنگ مین۔'' اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے شرارت سے
اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ بے اختیار ہی نظریں پھیر گئی۔

''وہ ابھی نہیں لوٹیں گے، واپسی صرف مجھ جیسے لوگوں کی ہوئی ہے۔ ہارے ہوئے، شکستہ

"لوگوں کی۔" اس کی آنکھوں میں نمی کی ہلکی سی چمک محسوس ہوئی تھی۔ زیرک بے تاب، بیٹھا۔

وہ بھی کہتی چلی گئی۔ بہت دیر بعد کسی سے کچھ کہنے کا موقع ملا تھا۔

"وہ تو بہت عظیم انسان ہیں۔ ان کا حوصلہ، ان کی ہمت، ان کا عزم بہت بلند ہے۔ اعصاب فولاد سے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے جذبات آسمان کو چھوتے ہیں اور...... اور ان بھی کمال کا ہے زیرک......" وہ بے اختیار ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"کیا کہہ رہی ہو تارا؟"

"انہوں نے کہا تھا، ہم سب واپس چلیں گے۔ انہوں نے خود کہا تھا، میں تھک گیا، آرام کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتی تھی ایسا نہیں ہو سکتا پھر بھی میں نے ان کے کہے پر لیکن وہ نہیں آئے زیرک! انہوں نے صرف مجھے واپس بھیجا کیونکہ ان سب میں صرف میں تھی، صرف میں ہی کم ہمت تھی۔ اس سے قابل نہیں تھی کہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر جاتی۔ میں ان کے لئے پرابلم کری ایٹ کر رہی تھی۔ میں مسیحا بن کر وہاں گئی تھی مگر مجھے مسیحا نہیں آیا۔"

وہ آنسو بہاتی چلی گئی۔ زیرک پریشان سا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"مجھے لگ رہا ہے زیرک! میں وہ ماں ہوں جو اپنے بچوں کو کسی طوفان میں گھرا چھوڑ کر محفوظ ہو بیٹھی ہے۔ میری خودغرضی، میری ساری ہمدردی کو نگل گئی۔ میں نے آنے میں بہت کی۔ صرف اور صرف زین کی وجہ سے۔ وہ مجھے سنبھلنے کا موقع دیتے تو شاید میں کبھی اپنی نگاہ سرخرو ہو جاتی۔ معلوم نہیں انہوں نے محبت برتی تھی یا غفلت لیکن میں اپنے مقام پر کھڑی نہیں زیرک۔"

زیرک نے پرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کھل کر بولنے دیا تھا

"کس قدر غلط سوچ رہی ہو تم؟" اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

"جانتی ہو، تم اپنی ہمدردی، اپنی غم خواری کو انگلیوں کی پوروں پر گننے کی کوشش کر رہی وہاں کتنے دن رکیں، کتنے مریض دیکھے؟ کیا یہ باتیں کوئی معنی رکھتی ہیں؟ بات تو صرف یہ کہ تمہارے وہاں جانے میں، ان لوگوں کا درد بانٹنے میں تمہاری کتنی محبت، کتنا خلوص شامل نے تمہیں جتنی ہمت، جتنا صبر و ضبط عطا کر رکھا تھا، تم نے اس کا پورا پورا استعمال کیا یا نہیں سمجھتی ہو کہ تم نے دانستہ کہیں کام چوری، خودغرضی نہیں دکھائی۔

کہیں کوئی ڈنڈی نہیں ماری تو پھر کاہے کی شرمندگی؟ بھلے سے وہ سارے کے سارے مہینوں بیٹھے رہیں۔ ہمیں کیا؟ اب مجھے دیکھو۔ چند گھنٹے آرام کی خاطر گھر چلا آیا ہوں۔ کچھ لوگ ابھی ڈیوٹی دے رہے ہیں تو میں اپنے آپ کو کیا سمجھوں؟ کیا یہ کہ میں بھگوڑا ہوں، میں دوسروں جیسا بہادر نہیں یا میں نکھٹو ہوں۔"

بہت سنجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ ایکدم ہی پٹڑی سے اتر گیا۔

"میں نے یہ نہیں کیا۔" اس نے ناراضی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"تم نے میرے لئے یہ نہیں کہا' لیکن تم خود اپنے بارے میں کچھ ایسا ہی سوچ رہی ہو۔ جانے دو! ان کاموں میں مقابلے بازی نہیں چلتی۔ خلوص نیت سے جہاں، جب اور جیسا ہو پائے، کرنا چاہیے۔ تم اپنا فرض ہی ادا کرنا چاہتی ہو نا؟ تو یہاں بھی حالات کچھ مختلف نہیں۔ جس غم کدے سے آنے پر پچھتا رہی ہو...... سمجھو اسی غم کدے میں واپس بھی آ گئی ہو۔ یہاں کام کرو ہمارے تمہارے حوصلے کی دیوار خستہ ہونے لگی تو ہم سب ساتھ ہوں گے نا، سہارا دینے والے۔ چلو اب فوراً افطاری کا کچھ سامان کرو۔ میں جلد از جلد سونا چاہتا ہوں۔" وہ پھرتی سے اٹھا اور پھر بھی بازو سے تھام کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔

پھر جتنی دیر تک وہ کام کرتی رہی، زیرک اس کے ساتھ ہی کچن میں بیٹھا مسلسل بول بول کر کی سوچ کے زاویے درست کرتا رہا تھا۔ افطاری کے بعد وہ فوراً ہی سونے چل دیا تھا۔ اب اس کے پاس اپنی نیند کے لیے صرف تین گھنٹے بچے تھے۔

♦❖♦

"نہیں، یہ بستی میری بستی نہیں۔" وہ ایک چٹیل میدان میں کھڑی تھی جہاں ہر چیز زیر و زبر تھی۔

"یہ شہر میرا شہر نہیں۔ یہ اجڑے مکان، ویران گلیاں، درد و کرب میں ڈوبے چہرے۔ یہ کس کہاں لے آئے ہو مجھے۔" یقین کا کوئی سرا ہاتھ میں نہ آ رہا تھا۔

"یہ پتھروں، دیواروں تلے کچلے ہوئے بدن میرے پیاروں کے تو نہیں۔" چار سو ہو کا عالم تھا کامل خاموشی۔

"وہ دیکھو! وہ بچہ کس کا بچہ ہے جس کی ادھ کھلی آنکھوں میں نیند جم چکی ہے؟ اور وہ ہاتھ جس کی ہتھیلی اور پانچوں انگلیوں کی شاخیں آسمان کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ کن جوان ہوتے جذبوں کی کتاب ہے جس کے ہر صفحے پر پھولوں کی خشک پتیوں کی باس

ٹھہری ہوئی ہے۔

وہ بوڑھا کس کا باپ ہے جس کے شانے جھک گئے ہیں اور آنکھوں سے نور بہتا ہے

ماں کے جگر گوشے کہاں جا سوئے جو گھر کی چھت تلے پنگھوڑے میں لیٹے میٹھی نیند جھولتے

وہ دیکھو، کسی میت پر سینکڑوں گدھ ٹوٹے پڑے ہیں۔

اور وہ جوان جس کی پنڈلی سے ایک خونخوار کتے کے نوکیلے ذانت بڑی سفاکی و بے

گوشت نوچ رہے ہیں۔

''ارے ذرا پوچھو تو...... کس کس کی آرزوئیں تہہ خاک سو رہی ہیں؟''

کس کس کی امیدوں نے دم توڑا ہے؟

کس کس کا آسرا زمین نگل گئی؟

کس کس نے سائبان لٹا دیا؟

ہے کوئی شمار، کوئی حساب، کوئی میزان؟

جو بتا سکے، رونے والوں نے کتنا رویا ہے؟ کتنا غم سہا ہے؟

کتنا الم جھیلا ہے؟

ہے خدا! تیری محبت مخلوق سے تمام ہو گئی کیا...... تیری رحمت نے جواب دے دیا؟ تو

ہے...... کریم ہے...... غفار ہے...... رحمٰن ہے پھر بھی اتنی بے نیازی۔ اپنے ہی پیاروں سے

ہی بندوں سے۔''

بہت دنوں بعد وہ کھلے آسمان تلے لائی گئی تھی۔

ٹکر ٹکر ایک ایک چہرے کو دیکھتی رہی، نہ آنکھوں میں اضطراب، نہ وحشت، نہ خوف

چہرہ بے تاثر، لب خاموش۔

نہ کچھ پوچھتی، نہ کہتی تھی۔

''اونہوں۔'' ڈاکٹر احسن لغاری نے قدرے مایوسی سے سر اٹھایا۔

''اسے نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ اور ماحول کی تبدیلی میں اشد ضروری ہے۔

خیال میں اسے فوری طور پر پنڈی شفٹ کریں۔'' انہوں نے مکمل معائنے کے بعد اپنی را

تھی۔

ڈاکٹر جون نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کی بات کی تائید کی تھی۔

زین العابدین جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چپ چاپ کھڑے اس کی نیلگوں آ

رہے پانی کو دیکھتے رہے۔

پتہ نہیں؟ کون سی مماثلت تھی جو اس لڑکی کو ان کی مضبوط پناہوں کے حصار میں آ جانے پر

کر گئی تھی۔

زین اور زیب میں کیا چیز مشترک تھی؟

لاجور کے کسی جاننے والے نے بتایا تھا۔

''وہ اپنے گھرانے میں سے زندہ بچ جانے والی واحد لڑکی ہے۔ ایک ہفتہ قبل اس کا نکاح ہوا

رباب سے۔''

''زریاب!'' انہوں نے زیر لب دہرایا۔ پتہ نہیں کون تھا وہ؟ کیسا تھا؟ کہاں ہوگا اب؟ اور

معلوم ہوگا بھی یا......؟''

مزید کچھ بھی سوچنے سے قبل انہوں نے اپنے سر کو جھٹک کر اس سوچ سے پیچھا چھڑانے کی

شش کی۔

''کانچ سے نازک، نوخیز جذبوں سے بنا محل، ریت کا گھروندا ثابت نہ ہو۔ یا خدا! وہ کہیں

لوٹ آئے...... لاجور کے لیے......''

انہوں نے پورے خلوص سے دعا کی۔ لاجور کی آنکھوں میں پھیلا خالی پن انہیں اپنے دل میں

تا محسوس ہو رہا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے اپنی دلی کیفیات پر غور کرتے رہے۔



آج کا دن کافی مصروف گزرا تھا۔

پہلے ہاسپٹل اور پھر ٹرانزٹ کیمپ، جہاں مختلف ہسپتال سے فارغ کیے گئے مریضوں کو رکھا

گیا تھا۔ بہت سے بچے، عورتیں اور مرد۔

الینہ ان سہمے ہوئے، خوف زدہ بچوں کے لیے مختلف پروگرام ارینج کر رہی تھیں۔ انکل عباسی

کو وہاں جاتے دیکھا تو نین تارا بھی گھر پہ رہنے کے بجائے ان کے ساتھ ہو لی۔

الینہ بچوں کے ساتھ ٹھیک ٹھاک مصروف تھیں۔ اسے دیکھ کر دور ہی سے ہاتھ ہلایا تو وہ ان ہی

کی طرف آ گئی اور بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھتے دیکھتے خود بھی ان کے ساتھ لگ گئی۔

بچے رنگ برنگے کاغذوں، رنگوں میں الجھ کر کچھ دیر کے لیے ہی سہی، سب کچھ بھول کر چہک

رہے تھے۔

''ہمارا اصل مقصد ہی انہیں زندگی کی رونقوں کا احساس دلانا ہے، ورنہ بعض بچے تو اس قدر

ذہنی دباؤ کا شکار ہیں کہ ذرا اونچا بولنے پر ہی ان کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں۔ میں نے
ہے، عید پر......'' ان کی بات سنتے سنتے وہ بے دھیانی میں انکل عباسی کو دیکھنے لگی۔

کوئی نوجوان ان کے کشادہ سینے میں منہ چھپائے بلک رہا تھا اور وہ اسے کسی ننھے
طرح بازوؤں میں سمیٹے کھڑے تھے۔

دردخواہی کا عجب انداز رکھتے تھے وہ بھی۔ دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے۔ بغیر کچھ کہے
کو کھل کر اپنی بھڑاس نکال لینے دیتے پھر بڑی تسلی سے اسے اپنے سامنے بٹھا کر آنسو
بڑی شفقت سے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پوچھتے۔

''کیوں روتے ہو؟ گھر مٹ گیا......؟ کوئی بات نہیں...... پھر بن جائے گا۔ جانے
روتے ہو......؟'' ارے یار! وہ سب ہم سے اچھے نکلے۔ مزے سے اوپر چاند تاروں
سجائے بیٹھے ہوں گے۔ وہیں سے آئے تھے نا؟ جہاں بلا لیے گئے...... کیا ہم اور تم نہ جائیں
اور ذرا دیکھو، کیسا برکتوں والا مہینہ ہے۔ جنت کے سب دروازے کھلے ملے ہوں
ڈائریکٹ اندر...... وہ سب کے سب اللہ کو بہت عزیز تھے۔ فرشتے بڑی محبت سے اپنی آغوش
کے لے گئے۔''

کسی پڑھے لکھے نوجوان کے سامنے بیٹھتے تو لہجہ و انداز دونوں تبدیل۔

''بعض معاملات میں ہماری حیثیت کٹھ پتلیوں کی سی ہے۔ اب یہاں، اس مقام پر
مجبور محض ہے۔ یہ کائنات کسی اور کے اشاروں پر چلتی ہے، کسی اور نظم و ضبط کی پابند ہے۔ اس
نے چاہا، ادھر پہاڑ لرز اٹھے۔ ذرا اشارہ کیا تو سمندر بپھر گئے اور یہ اشارے یونہی بے سبب
ہوتے، کچھ پابندی تو بہرحال ہم پر بھی لازم ہے۔ جب جب ہم اپنی اوقات بھولنے لگتے ہیں
تب وہ یاد دہانی کراتا رہتا ہے۔ تم جوان آدمی ہو، یوں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر مت بیٹھو۔ ان
عورتوں کو دیکھو، معصوم بچوں اور ناتواں بوڑھوں کا خیال کرو۔ اٹھو اور اٹھ کر ان کے درد
کرنے کی کوشش کرو۔ سب کچھ ختم نہیں ہوا، بہت کچھ ابھی باقی ہے۔''

ان کی باتیں حوصلہ دیتی تھیں۔ وہ جیسے ٹھوکر کھا کر گرے ہوئے کو شانوں سے تھام کر
دیتے تھے۔

کبھی چلتے چلتے یونہی نعرہ لگاتے۔

''ارے جس نے آسرا لیا ہے، وہی لاٹھی تھمائے گا۔ رنج مت کرو۔''
نین تارا ان کی باتیں سن کر نئے سرے سے تازہ دم ہو جاتی تھی۔



کوریڈور کے آخری سرے پر کسی مانوس چہرے کی ذرا سی جھلک دکھائی دی تھی۔ اس سے پہلے
کہ وہ اپنے واہمے کی تصدیق کرتی وہ راہداری کے دوسری جانب مڑ چکے تھے۔

''زین!'' وہ کچھ حیران، کچھ ششدر سی، چند پل کے لیے کھڑی رہی پھر راہداری کے چکنے
فرش پر تقریباً دوڑتے ہوئے اس طرف لپکی۔

بلاشبہ وہ وہی تھے۔

کسی ڈاکٹر سے مصروف گفتگو، لمبے لمبے ڈگ بھرتے سامنے چلے جا رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ
ساکت کھڑی انہیں دور تک جاتا دیکھتی رہی۔

''زین واپس آ گئے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ اس انتہا درجے کی مصروفیت کہ ایک فون بھی نہ کر
سکے۔'' دکھی ہونے کے ساتھ ساتھ اسے ان پر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔

زین العابدین کی یہ بے نیازی و لاپروائی اس کے لیے قطعاً اجنبی تھی۔ وہ تو ہمیشہ سے اس کا
بہت خیال رکھتے آئے تھے۔

''خیریت......؟'' یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' قریب سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر لبنیٰ نے اسے
چونکایا۔

''یہ ڈاکٹر زین...... یہاں ڈیوٹی دے رہے ہیں؟'' اس نے قدرے الجھ کر ڈاکٹر لبنیٰ کر دیکھا۔

''نہیں۔ یہ تو غالباً آج ہی مظفر آباد سے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الحسن کو کوئی اسپیشل کیس ریفر کیا
ہے انہوں نے۔ ان کی کوئی قریبی عزیزہ ہیں، لاجور......''

''لاجور......!'' اس نے حیرت سے ڈاکٹر لبنیٰ کا چہرہ دیکھا۔ وہ اسے تفصیل سے بتانے لگیں
مگر دھیان کی سوئی بس ایک ہی جگہ اٹک گئی تھی۔

''لاجور!'' اس نے زیرلب یہ نام دہرایا جس کی بازگشت اسے وہاں بھی کئی بار سنائی دی تھی۔
بہت سے لوگوں کے درمیان ان کا دکھ سنتے، دیکھتے، ساعتوں میں یہ نام کئی بار گونجا تھا اور ہمیشہ ہی
ڈاکٹر زین العابدین کے ساتھ۔

اس نے ایک طویل سانس لی پھر ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترتی نیچے چلی آئی۔ ڈیوٹی آف
ہو چکی تھی۔ نرم، چمکیلی دھوپ میں دھیرے دھیرے ٹہلتے ہوئے وہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ ایک پل کے
لیے سوچا اور پھر گھر جانے کے بجائے ٹرانزٹ کیمپ میں چلی آئی۔ البتہ یہاں کہیں نظر نہ آ رہی
تھیں۔ ان کی کولیگز البتہ موجود تھیں۔ وہ ان کے ساتھ مختلف سرگرمیوں میں لگی تو پھر سرِ شام ہی فارغ

ہوئی۔سیل فون گاڑی میں ہی چھوڑ رکھا تھا۔واپس آئی تو مس کال کی لمبی فہرست سامنے تھی
کی ساری کالز شہریار عباسی اور زیرک کی طرف سے تھیں۔ایک کال ذی وقار کی، اس
آف کیا اور ڈیش بورڈ پر لڑھکا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔پتہ نہیں کیوں عجیب سی بے چینی
خوامخواہ ہر چیز پر غصہ آنے لگا تھا۔

"وہ چند دنوں میں اتنی اہم ہو گئی کہ اس کے لیے مظفر آباد چلے آئے اور میں اتنی غیر
بتانا بھی پسند نہیں کیا۔"

آس پاس اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔وہ بلا مقصد ہی گاڑی کو سڑکوں پر دوڑاتی رہی جس وقت
پورچ میں کھڑی کر کے اتری، گھر کی ساری لائٹس جل چکی تھیں۔سیٹ کی پشت پر پڑا
موبائل اٹھا کر وہ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے برآمد عبور کر کے راہداری میں آئی تو ڈرائنگ
کھلے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ یکدم ٹھٹک کر رک گئی۔

اندر سے آتی آوازوں نے جیسے دامن کھینچ کر اسے روکا تھا۔

بہت محتاط ہو کر اس نے دروازے پر لٹکتا پردہ ذرا سا ہٹایا۔

وہ بالکل سامنے تھے۔

پہلی نظر پڑتے ہی دل بے ترتیب انداز میں دھڑکا تھا۔ذرا سا ترچھے ہو کر ٹانگ پہ
چڑھائے کافی ریلیکس انداز میں بیٹھے تھے۔ایک بازو صوفے کی بیک پر پھیلا رکھا تھا، دوسرے
میں چائے یا کافی کا مگ، شیو بڑھی ہوئی اور چہرے پر کمزوری نمایاں۔آنکھوں کے گرد حلقوں
مزید اضافہ ہو چلا تھا۔اسی صوفے پہ اپنے سامنے بیٹھے شہریار عباسی سے وہ محو گفتگو تھے۔

اس نے پردہ چھوڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔دروازہ لاک کر
تا کہیں لڑھکایا، اوور آل کہیں پھینکا اور اوندھی سیدھی بیڈ پر جا گری۔وہ دل ہی دل میں
العابدین سے سخت خفا ہو چکی تھی۔



بہت دور کہیں دھیمی دھیمی دستک ہو رہی تھی۔

وہ گہری نیند میں ڈوبی اس مسلسل ہونے والی دستک کو سن رہی تھی جو دھیرے دھیرے
آنے لگی تھی۔

"ٹھک......ٹھک" وہ ذرا سا کسمسائی۔سوئے سوئے اعصاب کو یہ دستک ناگوار
رہی تھی۔

بے چینی سے کروٹ بدلی، تب ایکدم چونکی۔بمشکل آنکھیں کھول کر کمرے کے بند دروازے
کو دیکھا، جہاں وقفے وقفے سے اب بھی دستک جاری تھی۔

"کون......؟" اس نے سوئی سوئی سی آواز میں پوچھا مگر کوئی جواب موصول نہ ہوا تھا۔
لائٹ آف تھی اور کمرے میں گھپ اندھیرا۔وقت کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا تھا۔دوبارہ دستک
ہوئی تو وہ قدرے چڑ کر اٹھ بیٹھی۔سرہانے پڑا دوپٹہ کھینچا اور جوتا پہنے بغیر اٹھ کر دروازہ کھولا۔
پھر ایک پل کے لیے اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"السلام علیکم۔" وہ بنا اجازت طلب کیے پورا دروازہ کھول کر کمرے میں چلے آئے تھے۔
راہداری میں جلتی ٹیوب لائٹ کی ہلکی سی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔انہوں نے سوئچ بورڈ ڈھونڈ کر
لائٹ آن کی تو تیز روشنی سے بچنے کے لیے نین تارا نے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لیا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟" یوں بے وقت کیوں سو رہی تھیں؟ الینہ بتا رہی تھی، تم نے
کھانا بھی نہیں کھایا؟" پورے کمرے پہ طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے اسے آنکھیں مسلتے
دیکھا۔

بال بے ترتیبی سے کندھوں پہ بکھرے ہوئے تھے۔آنکھوں میں ادھوری نیند کی سرخی، دوپٹہ
بے نیازی سے ایک کندھے پر جھول رہا تھا۔اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔کلائی پر بندھی گھڑی پہ
وقت دیکھنے لگی۔پونے گیارہ ہو رہے تھے۔

"آپ واپس کب آئے؟" سرسری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

بہت دنوں بعد عام سے گھریلو حلیے میں دکھائی دیے تھے۔ہلکے براؤن رنگ کا کھدر کا شلوار
سوٹ غالباً شہریار عباسی کا تھا۔

"آج صبح......گھر بات ہوئی تھی میری......سب ہی آنے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔
عید پر چلو گی تم؟"

"آپ کہیں گے تو چلی چلوں گی۔" بڑا پرایا لہجہ تھا، کچھ جتاتا ہوا۔انہوں نے بغور اس کا چہرہ
دیکھتے ہوئے کچھ جانچنے کی کوشش کی پھر سر جھٹک کر دھیرے سے ہنس دیے۔

"بہت فرماں بردار ہو گئی ہو۔چلو آؤ، تمہارے انتظار میں سب ہی بھوکے بیٹھے ہیں۔کھانا
کھا لو پھر بناتے ہیں کوئی پروگرام۔" لبوں پر مسکراہٹ لیے کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئے۔

کھانے کی میز پر واقعی سب لوگ موجود تھے۔

بہت دنوں بعد، بہت عرصے بعد قدرے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔زیرک بھی

موجود تھا، شہریار بھی۔ شاید اسی لیے الینہ نے کھانے پر خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کچھ زین العابدین کی آمد بھی خاصی اہم تھی۔

کھانے کے بعد چائے کے لیے وہ لوگ لاؤنج میں آ گئے تھے۔ خشک میووں کا تھال رکھا تھا۔ زیرک کی زبان اور ہاتھ دونوں ہی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ انکل عباسی بار بار اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے مگر وہ اچھا خاصا ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔

"لاجور کیسی ہے اب؟" وہیں فلور کشن پہ بیٹھے بیٹھے چائے کا کپ زین کو تھماتے نے دانستہ بہت عام سے انداز میں پوچھا تھا۔

"جسمانی طور پر تو بہت بہتر ہے، ذہنی حالت کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ صبح الحسن سے ملوں گا، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں؟" وہ جیسے بہت ہی عام سی بات کا جواب دے شہریار کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

وہ دل ہی دل میں جھنجھلاتی۔ زیرک کے ساتھ باہر واک کے لیے نکل آئی تھی۔



عید کے چاند غریبوں کو پریشان نہ کر
تجھ کو معلوم نہیں زیست گراں ہے کتنی

آج روز عید تھا، بے حد اداس مغموم، پژمردہ دن...... نہ ہاتھوں پہ مہندی تھی۔ نہ کلائی چوڑیاں، آنکھیں کاجل سے بے نیاز۔ بس صبح سویرے اٹھ کر کپڑے بدلے، گھر فون کیا تحائف سے لدی پھندی ہسپتال آ پہنچی۔

نینا، چھ سالہ بچی اس سے بے حد مانوس ہو چکی تھی۔ نین تارا کی گود میں آئی تو ننھے سے اسے جکڑ لیا اور پھر بہت دیر تک اس کی گود سے اترنے پر تیار نہ ہوئی۔

لوگ مختلف تحائف، مٹھائی، چاکلیٹس لیے بھاگے چلے آئے تھے۔ دکھ کم کرنے کا یا دکھ بانٹنے کا چارہ کر رہے تھے۔ کچھ بچے بہل گئے تھے، کچھ مزید خوفزدہ نظر آنے لگے تھے۔ عورتیں چہروں پہ دوپٹے ڈالے پڑی تھیں۔

اپنی راجدھانی یاد آنے لگی تھی۔ صبح سویرے الائچیوں میں پکے شیر خرمے کی مہک، چو معنی خیز کھنکھناہٹیں۔ بچوں کے نئے نویلے جوڑے، بزرگوں کا پیار...... بے بسی کا یہ کون سا کوئی بچہ ماں کی گود کے لیے ترسا تو کوئی ماں اپنی بنجر گود کو روئی۔ وہ بڑھ بڑھ کر ان رہی، اپنی محبتوں کا یقین دلاتی رہی۔

"تم لوگ اکیلے کب ہو؟ ہم سب ہیں نا!" اس کا بس نہیں چل رہا تھا، کون سی ایسی جادو کی بڑی گھمائے کہ سب ایک بار پھر سے اپنے ہنستے بستے گھروں میں جا پہنچیں۔

"ڈاکٹر سرفراز آپ کا پوچھ رہے تھے، فارغ ہوں تو ان سے مل لیں۔"

کسی نے عجلت میں پیغام دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فوراً ہی اٹھ گئی۔ ڈاکٹر سرفراز ان سے کچھ مریضوں کے بارے میں ڈسکس کرنا چاہ رہے تھے جو اس کے زیر علاج تھے۔ تمام رپورٹس دیکھ کر اور اس کی رائے سے متفق ہوتے ہوئے انہوں نے اسے مزید کچھ ہدایات دیں تو وہ ہلکی سی ہو کر اٹھ گئی۔ وہ اپنی ڈگری سے زیادہ تجربہ رکھتی تھی۔ وجہ صرف اور صرف زین العابدین...... جنہوں نے کتابوں سے زیادہ اسے عملی تعلیم دینے کی کوشش کی تھی۔

ڈیوٹی آف ہو چکی تھی۔ وہ پارکنگ کی طرف آئی تو زین العابدین کی گاڑی کھڑی دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ کچھ پل وہیں شش و پنج میں گزار دیئے پھر ان ہی قدموں واپس لوٹ آئی۔

وہ اس وقت کہاں ہو سکتے تھے؟ اسے تھوڑا بہت اندازہ تھا پھر بھی یقین دہانی کے لیے جیسے ان دیکھی ڈور سے بندھی ایک سمت چلتی گئی تھی۔ ڈاکٹر محمود الحسن کے کمرے میں گئی تو وہ خالی تھا۔ وہیں سے کسی سے لاجور کا روم نمبر پوچھا اور سیدھی وہیں آ گئی۔

وہ اب صرف اور صرف اس لڑکی کو دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ اس کمرے کے سامنے پہنچنے تک اس کا اندرونی اضطراب ہلکی سی لرزش کی صورت اس کی انگلیوں میں اتر آیا تھا۔

سسٹر ذکیہ روم نمبر 7 سے باہر نکل رہی تھی، اسے دیکھ کر مسکرائی اور دروازہ اس کے لیے کھلا چھوڑ گئی۔

کمرے کے اندر پڑنے والے اس کے قدم خاصے بے ربط تھے۔ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ جماتے ہوئے اس نے ڈرتے ڈرتے کمرے کے اندر جھانکا اور پھر جیسے ٹھنڈے آبشار تلے کھڑی رہ گئی۔

وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ چہرہ زرد، بے رونق مگر بے حد خوبصورت، نیلی، سمندروں جیسی ساحر آنکھیں جو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں زین العابدین کو۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے دھیمے لہجے میں کچھ کہتے ہوئے، کچھ بولتے، کچھ سمجھاتے ہوئے۔

وہ کیا کہہ رہے تھے۔ نین تارا کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا لیکن جس انداز میں کہہ رہے تھے، وہ سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کی پشت دروازے کی جانب تھی۔

نین تارا الٹے قدموں پیچھے ہٹی اور سست انداز میں قدم اٹھاتی وہاں سے دور ہوتی چلی گئی۔

اس پل لان میں مکمل کر مرجھا جانے والے زرد گلاب اور نین تارا کے چہرے میں
فرق نہیں تھا۔



عید کے چاند کہیں اور اجالے لے جا
میرا ویران بسیرا ہی مجھے کافی ہے

اس کی آنکھیں کھڑکی سے باہر کے منظر پر جمی ہوئی تھیں۔ خالی آسمان اور اس کی
وسعت میں کبھی کبھار اڑان بھرتے پرندے۔

زین العابدین اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے رہنے کے باوجود جان نہیں
اسے کس چیز نے اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔

"تمہاری آنکھیں اور شفاف آسمان اس وقت بالکل ایک سے دکھائی دے رہے ہیں
ویران لیکن اس ویرانی میں امید کے خوش رنگ پرند دیکھنا میری سب سے بڑی خواہش
کمرے کے وسط میں کھڑے کھڑے انہوں نے کچھ دیر کے لیے سوچا پھر اس کی توجہ ہٹا
لیے آگے بڑھ کر کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔

ڈاکٹر محمود الحسن نے واضح طور پر انہیں بتایا تھا۔

"جس طرح کسی اچانک حادثے سے قبل ہم خوفزدہ ہو کر فوری طور پر اپنی آنکھیں بند
ہیں، بالکل اسی طرح لاجور نے اپنے شعور کی آنکھ بند کر لی ہے۔ یہ کوئی بیماری نہیں ہے، صرف
ہے، حقیقت کا سامنا کرنے کا خوف۔ اس دکھ، صدمے، بے پناہ غم کا خوف اور ان مشکلات
کا خوف جو حقیقت حال کو سمجھنے، جان لینے کے بعد اسے فوری طور پر سہنا پڑے گا۔ خود کو اس
وہ ماحول سے دور رکھنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو بے حسی کے خول میں جکڑ لیا ہے۔
ہے کہ وہ کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کر پا رہی۔ اب ہمارا کام سب سے پہلے اس خول
ہے۔ تکلیف وہ حقائق کو قدرے آسان بنا کر اسے یقین دلانا ہے کہ وہ یہ سب برداشت
حوصلہ رکھتی ہے اور وہ اکیلی نہیں، ہم سب اس کے ساتھ ہیں۔ اگر وہ تمہیں زیب کی حیثیت
قبول کر رہی ہے تو ٹھیک ہے، تم اسے پورا پورا اعتماد دو۔ ایک بار وہ اس شعوری جبر سے آزاد
سب کچھ جان لینے سے بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا، بڑے سے بڑا صدمہ سہہ لے گی
اپنے طور پر کوشش کرتا ہوں، تم اپنی سی کرو۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینکتے رہو، کھڑے پانی
بننے والے چھوٹے چھوٹے دائرے بہت دور تک ہلچل مچاتے ہیں۔"

اس کے سامنے بیٹھ کر کرسی جھلاتے وہ ایکدم سیدھے ہو کر اس کی طرف جھکے۔

"لاجور! جانتی ہو، آج عید ہے۔ ایک بہت ہی خاص مگر بہت اداس کر دینے والا دن۔ لوگ
اپنے پیاروں کو رو رہے ہیں، اپنے گھر بار یاد کر رہے ہیں۔ لاجور! تمہیں کون کون یاد آ رہا
؟" وہ اس کے منجمد حواس کو تحریک دینا چاہتے تھے۔ اس کی آنکھیں اب پہلے کی طرح قطعی بے
تھیں۔ اداسی کی ہلکی سی رمق گذشتہ چند دنوں سے اپنی ہلکی سی جھلک دکھا جاتی تھی۔

اب بھی اس نے بند کھڑکی پر سے نظریں ہٹائیں اور انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہیں مہندی پسند ہے نا اور چوڑیاں بھی؟" انہوں نے اس کی کوری ہتھیلی کھول کر اس کے
منے کی۔

زرد ہاتھ میں پھیلی لکیروں کا جال مدھم سا پڑ گیا تھا۔

وہ ٹکٹکی باندھ کر اپنے ہاتھ کو دیکھتی رہی پھر منہ اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"میرے ساتھ باہر چلو گی؟ میں تمہارے لیے چوڑیاں خریدوں گا۔ سرخ اور سبز رنگ کی کانچ
چوڑیاں۔ مجھے بہت پسند ہیں اور تمہاری کلائی میں تو......" کچھ کہتے کہتے انہوں نے یکدم لب
نچ لیے تھے۔

"نجانے کیوں اس لڑکی کے سامنے آ کر میں بھولنے لگتا ہوں کہ میں زریاب نہیں، زین
ابدین ہوں۔" انہوں نے اپنی پیشانی مسلی اور مضطرب ہو کر انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"لاجور! تم کچھ کہتی کیوں نہیں، کچھ تو بولو۔" کرسی کی پشت پر ہاتھ جماتے ہوئے انہوں نے
ب کر اس کی آنکھوں میں نادیدہ جذبات کھوجنے کی کوشش کی۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں لاجور! مگر اس وقت تک نہیں کہوں گا جب تک تم خود مجھے کچھ
نے کا حوصلہ نہیں دو گی۔" ان کی آواز میں عجب وارفتگی در آئی تھی۔ جذبات سے معمور مدھم لہجہ،
ماتی آنکھوں میں لکھی ان کہی کہانیاں۔

لاجور کی پلکیں ذرا سی لرزیں۔ اگلے ہی پل اس نے رخ موڑا اور اسی خاموشی سے پہلو کے بل
ٹ گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے کمبل کھینچنے کی کوشش کی تو زین نے آگے
ھ کر کمبل اس کے کاندھوں تک اوڑھا دیا۔

"سنو لاجور! میں کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے
رور کہنا۔ کوشش کروں کہ تمہیں وہ سب کچھ دے سکوں جو میرے بس میں ہے۔" اس نے دھیرے
ے سرگوشی کی اور پھر کھلے دروازے سے باہر نکلتے چلے گئے۔

اس کی پلکوں پر اترتی لرزش ان کے لیے بہت امید افزاء تھی۔



”تو کیا واقعی آنے والے دنوں میں وہ سب ہو جائے گا جس کا خدشہ مجھے قبل
ہولائے دے رہا ہے۔“

کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے، گرم شال لپیٹے وہ کھڑکی میں کھڑی تھی، بہت گم صم اور
رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی مگر نیند تھی کہ آنکھوں سے کوسوں دور۔ سوچیں تھیں
پس کی طرح اسے جکڑے جا رہی تھیں۔

رات کے اس پہر کی سوئی، جاگی ہوا سرسرانے لگی تھی اور ادھورا چاند آنکھوں میں چھپ
اس نے شال اپنے گرد مضبوطی سے لپیٹی اور آنکھیں موند کر سر گھٹنوں پہ گرا لیا۔ زین
اس کے سوا کسی اور کے ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال کبھی اس کے دل و دماغ کو چھو کر بھی نہ گزرا
سب جو اس کی آنکھیں دیکھ چکی تھیں، اتنے روز بعد بھی وہ منظر اس کے دل کو سمندروں کی گ
دھکیل دیتا تھا۔

”کیا زین العابدین نہیں جانتے؟ کیا انہیں کبھی خبر نہیں ہو سکی کہ وہ میرے لیے کیا ہ
جو ان کی محبت کا بیج اپنے دل میں بوئے ایک عمر اس کو اپنے خوابوں اور آرزوؤں کا لہو د
اپنے نوخیز جذبوں، ارمانوں سے خاک دل کو لبریز کر کے اس درخت کو تناور بناتی رہی۔ ا
اس لیے کہ جب محبت کا یہ جوان برگد میرے روم روم میں اپنی جڑیں گاڑ لے تو وہ اس گھنی
ہمیشہ کے لیے دھتکار کر کسی اجنبی ہوا کا دامن تھام لیں۔“ اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طر
رہا تھا۔ بے چینی حد سے سوا ہوئی تو وہ یونہی ننگے پیر کھڑکی کے راستے ہی باہر لان میں اتر گئ

گھاس پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ گیلی، سرد زمین پہ پاؤں پڑتے ہی ہلکی سی کپکپی جسم
گئی مگر جو دکھ اندر موجزن تھا اس نے کسی اور تکلیف کا احساس ہی نہ ہونے دیا تھا۔

”مجھے خبر ہی نہ تھی زین! کبھی وقت مجھے یہ آزمائش بھی بخش دے گا، ورنہ میں آپ
لیتی۔ اپنے جذبوں کے نرم مگر مضبوط حصار میں، کسی ریشمی جال میں پھنسا لیتی آپ کو۔ بند
کر رکھتی صرف اپنے لیے لیکن میں نے اپنے جذبوں کو گم نام رہنے دیا۔ شاید اس لیے کہ
سے زیادہ اپنی محبت پر اعتبار تھا۔“ وہ چلتے چلتے تھک جیسے گھٹنوں کے بل گر سی گئی۔

”مجھے اعتبار تھا، بہت زیادہ یقین تھا۔ زین! آپ تو بنا کہے میری بات سمجھ لینے والے
یہاں اس مقام پر، اس معاملے میں یوں انجان کیسے رہ گئے؟ دھوکا کیسے کھا گئے؟“ وہ د

ں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

دل کسی پکے ہوئے پھوڑے کی مانند رسنے لگا تھا۔

کس قدر پریقین انداز میں زین العابدین کو کہتے سنا تھا اس نے۔

”وہ ہمت ہار چکی ہے لیکن میں اسے زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دوں گا۔“

”اف...... ان کا وہ لہجہ، ان کا اندازہ، ان کا عزم وہ تو اسی پل کسی ہارے ہوئے جواری کی
شکستہ قدموں سے دروازے سے ہی لوٹ آئی تھی۔“

اور اگلی صبح البینہ نے الجھن آمیز لہجے میں اس سے کہا تھا۔

”یہ زین العابدین! شہر یار بتا رہے تھے، وہ اس لڑکی لاجور میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لے
؟“

چائے کا مگ ہاتھوں میں دبائے وہ اپنے اندر ٹوٹ کر بکھرتے کانچ کی صدا سنتی رہی اور ہزار
آزماتے ہوئے اس نے کہہ تو دیا تھا۔

”ایک مریض کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ڈاکٹر کی تمام تر توجہ اور دلچسپی حاصل کرے۔
العابدین اگر اپنا فرض نبھا رہے ہیں تو اس میں عجیب کیا ہے؟“ لیکن اس کہنے میں جو دل پر بیتی
ں دل ہی جانتا تھا۔

اور اب رات کی اس تنہائی میں وہ اپنا ضبط کھوتے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اسے تایا ابو یاد آ رہے تھے۔

اور بی بی نیر

اور آثار

وہ ان لوگوں کے پاس ہوتی تو ایک بار ہی سہی، ان کے سینے میں منہ چھپا کر اپنا دکھ تو کہہ سکتی
ا۔

یہاں تو ہزار بھرم رکھنے تھے کہ اپنے جذبوں کی ارزانی اسے کہاں منظور تھی۔ رات اس کے
وش آنسوؤں سے بھیگنے لگی تھی۔ چاروں طرف بڑھتی دھند نے اسے ٹھٹھرا سا دیا تھا۔ خوب رو چکنے
بعد وہ لان کے طول و عرض کو ناپ ناپ کر تھک گئی تو برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر راہداری میں
ئی۔

گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ سب افراد خانہ نیم گرم کمروں میں محو خواب تھے۔

”اور اب تو شاید تا عمر ایسی نیند نصیب نہ ہو۔“ اس نے آہ بھر کر سوچا اور اپنے کمرے میں جا

کر دروازہ اپنی پشت پر بند کر دیا۔
نائٹ بلب جلا کر وہ پلٹی تو یکلخت ہی ٹھٹک کر رک گئی۔
کھلی کھڑکی میں ایستادہ وہ لمبا چوڑا وجود۔
اس نے ہراساں ہو کر سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا اور کئی بٹن ایک ساتھ دبا دیئے۔ ٹیو
ایک ہلکے سے جھماکے سے روشن ہو گئی تھی۔
نیم تاریک ہیولا واضح ہو کر اس کی طرف پلٹا تو کتنی دیر تک وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ
تھی۔

وہ بھی ٹکٹکی باندھے اسے یوں دیکھے گئے جیسے پہلی بار ان کے سامنے آئی ہو۔
ان کی اس توجہ پر وہ ایک بار پھر پگھلنے لگی۔ نچلا ہونٹ بری طرح کچلتے ہوئے وہ
جھپک جھپک کر سارے آنسو پی لینے کی کوشش کرنے لگی۔
دبیز قالین پر بے آواز قدم اٹھاتے وہ اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ان کی مانوس
اس کے آس پاس چکرانے لگی تھی۔
"بہت اداس ہو؟" ان کا اپنا لہجہ افسردگی سے بھرا تھا۔ نین تارا سر اٹھا کر ان کا چہرہ بھ
سکی۔ وہ بیک وقت انہیں خود سے بہت قریب اور بہت دور محسوس کر رہی تھی۔
"وجہ نہیں بتاؤ گی؟"
اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ لاعلمی کا یہ اظہار......؟ شکوہ کناں آنسو آنکھ کے کنار
پھسل کر گال پر جا ٹھہرا۔ لبوں پہ کتنی ہی باتوں نے آ کر دم توڑ دیا تھا۔
"مت روؤ نین تارا! ورنہ یہ آنسو میرے لیے پل صراط بن جائیں گے۔" انہوں
بڑھا کر پانی کے بے رنگ قطرے اپنی پوروں میں جذب کر لیے تھے۔
"تم صرف مجھے کھو رہی ہو اور وہ، سب کچھ بیٹھی ہے، ہر آسرا، ہر محبت، ہر چھایا، ہا
داماں ہے وہ۔"
نین تارا کو ایک دم سے بے تحاشا سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ اپنے کپکپاتے جسم کو آسر
کے لیے اس نے اپنی شال کو سختی سے اپنے گرد لپیٹا اور دونوں بازو سینے پہ باندھ لیے۔
"تم نہیں جانتیں مگر میں نے دیکھی ہے اس کے ہاتھوں کی لرزش۔ جب وہ مجھے سہار
لیے تھاما کرتی تھی، وہ سسکیاں جو اس کے سینے میں پھوٹتی اور لبوں پہ دم توڑتی تھیں۔" انہوں
بے چینی سے ہاتھ مسلتے ہوئے رخ بدلا تو اس کی بے قرار نظریں انتہائی کرب سے ان کا ایک

چھونے لگیں۔
"کبھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو، خزاں رسیدہ ٹہنیوں میں پھنسے کسی مردہ پرندے کی
ح بے جان۔ زندگی کی ایک رمق تک دکھائی نہیں دیتی تارا! وہ پناہ کے لیے زریاب کی طرف لپکی
تو اسے سہارا دینا میری مجبوری تھی مگر اب اس مجبوری میں میری خواہش، میری مرضی بھی شامل
لی ہے۔"
"اور میں......؟ میں جو ٹوٹ کر گری تو مجھے آسرا کون دے گا زین! مجھ سے ہاتھ چھڑاتے
ے ایک پل کے لیے بھی آپ نے نہیں سوچا کہ میری تنہائی، میرے اکیلے پن کا انت کیا ہو گا؟"
ب بھینچے ششدر سی کھڑی انہیں اپنے کمرے میں چکراتے دیکھ رہی تھی۔
"جو دکھ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ وہ بہت کم محسوس ہو گا تمہیں، اگر تم اس کا اندازہ کرو جو
ہ مجھ سے پائے گی۔ اس کا اولین آشیانہ تو تنکوں کا گھر ثابت ہوا جسے تقدیر کی تند ہوا تہس نہس کر
ی۔ اب مسمار شدہ گھروندے کی نئی بنیادیں رکھنے میں اسے کسی کا ساتھ تو درکار ہو گا نا؟" وہ اسے
د چھری سے ذبح کر رہے تھے۔ "میں نہیں جانتا مجھے لاجور سے محبت ہے یا ہمدردی۔ بس اتنی خبر
ہ کہ اس کے کمزور ہاتھوں سے اپنا دامن میں کبھی چھڑا نہیں پاؤں گا۔"
اس کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا وہ شخص ایک ایسا مجرم تھا جو سر اٹھائے اپنے جرم کا اقرار کر
ہا تھا۔
"مجھے رہائی چاہیے تو صرف تم سے نین تارا! جو حصار تم نے میرے گرد کھینچ رکھا ہے، مجھے اس
ے باہر نکلنے کے لیے اجازت درکار ہے۔ دو گی مجھے یہ آزادی......؟" وہ ایک بار پھر اس کے مقابل
ڑے تھے۔
نین تارا نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا رخ پھیر لیا۔ وہ ضبط کی انتہاؤں پر تھی۔
"نین تارا جواب دو۔" انہوں نے ایک جھٹکے سے اسے سیدھا کیا تو وہ لڑکھڑا سی گئی۔
"کچھ تو بولو، کچھ تو کہو۔ بتاؤ کیا میں اسے یونہی چھوڑ دوں؟ اتنے بہت سے اجڑے، بکھرے
گوں میں اگر میں کسی کا دامن خوشیوں سے بھرنا چاہوں تو کیا یہ غلط ہو گا؟ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا
رتیں نین تارا؟" انہوں نے اسے کندھوں سے تھام کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔
"میں...... میں وہی کرتی جو آپ کر رہے ہیں زین! یو۔ آر آلویز رائٹ۔" جو آواز اس کے
حلق سے نکلی وہ اس کی اپنی نہیں تھی، نہ ہی یہ لفظ اس کے لفظ تھے۔
"اور میں...... ہمیشہ وہی تو کرتی آئی ہوں جو آپ کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ ہر مقام پر آپ جیسا

بننے کی کوشش کی ہے میں نے ......کل بھی ...... آج بھی اور ...... شاید آئندہ بھی یہی کروں
آنسو بڑی خاموشی اور روانی سے اس کا چہرہ بھگوتے رہے۔

"آپ نے لاجور کے لیے مجھے چھوڑا ہے۔ میں بھی لاجور کے لیے آپ کو چھوڑ سکتی
جائیے زین العابدین! آپ میری ملکیت تو کبھی بھی نہیں تھے مگر آج، اس ایک پل کے لیے آپ
مجھے یہ احساس بخش ہی دیا ہے۔ تو یقین رکھیے کہ آپ کے لیے سب دروازے کھلے ہیں۔"

اس نے اپنے ہاتھوں، اپنے بدن میں ایک ایک کر کے ساری سوئیاں گاڑیں اور پھر
کر پڑ رہی۔



آثار بالاکوٹ سے واپس آ گیا تھا۔

بالکل ویسا ہی جیسا گیا تھا۔ جواں ہمت، پرجوش، باعزم......

لیکن جہاں بالاکوٹ کی تباہی کی بات آتی، وہیں اس کے چہرے پر تاریک سائے
لگتے۔

"خوراک کے ذخیرے ملیامیٹ ہو گئے، سر چھپانے کو چھت ندارد۔ لوگ بچے کھچے
ذبح کر کے خوراک کی ضروریات پوری کرتے رہے۔ ایسے ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ الامان وال
میں تو شاید جیتے جی کبھی فراموش نہ کر سکوں۔ بہرحال اب تو ساری جنگ وہاں کے موسم
ہے۔ وہاں کی سخت سردی اور شدید برفباری میں یہ خیمے کہاں تک ساتھ دیں گے۔ خیر سب لوگ
سی کوشش کر تو رہے ہیں۔ یقیناً خدا بہتر کرے گا۔" اس کی عادت تھی، مایوس ترین حالات میں
امید کا کوئی نہ کوئی دیا جلائے رکھتا تھا۔

جتنے دن وہ راولپنڈی میں رہا، مختلف اسکولز، کالجز کے وزٹ کرتا رہا۔ حکومت رضا کا
کر رہی تھی۔ وہ مخصوص عمر کے لوگوں کو وہاں کے باتصویر حالات دکھا دکھا کر قائل کرتا رہا
امداد کے لیے اور کبھی افرادی قوت کے حصول کے لیے۔ انکل عباسی اس کے ساتھ ہو لیتے۔

چند روز یہاں گزار کر اس نے واپس گھر جانے کی ٹھانی تو ساتھ ہی نین تارا کا بیگ
تھا۔

"مگر کیوں آثار......؟ میں ابھی نہیں جانا چاہتی۔" بہت کمزور سا انکار تھا اس کا۔ اور
ارادہ اتنا ہی پختہ۔

"میں تمہیں ابھی لے جانا چاہتا ہوں۔"

"وجہ......؟" کارڈیگن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نے بغور اس کے غیر معمولی سنجیدہ
دیکھا تو وہ خوامخواہ ہی سامنے ٹیبل پہ پڑے کرسٹل کے ڈیکوریشن پیسز کی جگہ بدلنے لگا۔

"کوئی خاص نہیں۔ بس چچی جان کا خیال آ رہا تھا۔ ذی وقار بھی اتنے دن سے اکیلا ہے اور
وہاں اکیلا کیا کروں گا؟"

نین تارا کو واضح طور پر محسوس ہوا کہ وہ بات کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"تمہیں زین نے کہا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بدستور سوالیہ نظروں سے
دیکھے گئی تو وہ جیسے چڑ سا گیا۔

"کون کہے گا مجھ سے؟ کیا میں دیکھ، سوچ اور سمجھ نہیں سکتا۔ بس میں نے کہہ دیا ہے تم میرے
گی۔" وہ قطعی انداز میں کہتا کمرے سے باہر نکل گیا تو اس نے خاموشی سے صوفے کی پشت
ادیا۔

"اف...... یہ میرے "اپنوں" کی محبتیں۔ کس قدر کمزور بنا دیتی ہیں مجھے۔ میرے اپنے دکھ
بھی "میرے" نہیں رہتے۔ سمجھو دل میں مورچے بنائے بیٹھے ہیں۔ ہر دکھ، ہر تڑپ سے آگاہ
آزردگی سے سوچتی رہی۔ جس روز واپسی ہونی تھی، اس روز وہ صبح ہی اسپتال آ گئی تھی۔
بہت سے لوگوں سے ملنا ملانا تھا۔ بچوں کو اپنی جانب سے تحائف دینے تھے اور الوداعی پیار
ا۔

سینئر ڈاکٹرز اس کے پرخلوص رویے کو، بے غرض محبتوں کو سراہتے رہے اور وہ لبوں پر پھیکی
ٹ لیے ان کے تمام تر سچ کو سو فیصد جھوٹ سمجھ کر اوپرے دل سنتی رہی۔ آثار کا دوبارہ فون آ

ہسپتال سے جلد از جلد نکلنے کی تاکید۔

"بس آ رہی ہوں، نکل رہی ہوں۔" ہر بار ہی اسے تسلی دیتے ہوئے اس نے یونہی بے مقصد
راریوں کے کئی چکر لگا ڈالے اور پھر ایک لمحے میں اپنی تمام تر ہمت یکجا کرتے ہوئے وہ اس
ازے کو کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی جو بہت دیر سے اس کے حوصلے آزمائے چلے جا رہا تھا۔

وہ ایک بار پہلے بھی اسے دیکھ چکی تھی مگر تب اور اب میں بہت فرق تھا۔ پہلے وہ اس کی
ب" تھی اور اب فاتح۔

"لیکن اس خود سے ناآشنا وجود پر فاتح کا لفظ کتنا عجیب سا لگے گا۔ نہ کسی جنگ میں شرکت کی

، نہ کوئی ہتھیار آزمائے۔ بس کسی کو کھویا اور کسی کو پالیا۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتی اس کے
بیٹھی۔

"اور اس بے چاری کا بھی کیا قصور؟ خدا جانے کتنے گوہر لٹا کر یہ در نایاب پایا ہے"
زپ سے کھیلتے وہ اس شکستہ وجود کو دیکھتی رہی۔

اس ایک حادثے نے اسے محروم ہی نہیں معذور بھی کر دیا تھا۔ چہرے کے دلکش نق
حزن و ملال جیسے رقم ہو چکا تھا۔ عجیب نڈھال سے انداز میں تکیے پر سر ڈالے وہ چھت کو
تھی۔

نین تارا کو بے اختیار ہی اس پہ ترس آ گیا۔ کرسی چھوڑ کر وہ اس کے بیڈ کے کنار
ٹکی، تب اس نے چونک کر نین تارا کو دیکھا۔

آنکھ کی پتلیوں میں ہلکا سا خوف جاگا تو نین تارا نے اپنائیت کے اظہار کے لیے ا
ہاتھوں میں تھام لیا۔

بہت کچھ کہنے آئی تھی یہاں، بہت کچھ بتانا چاہتی تھی مگر اب تو جیسے ہر لفظ کھو گیا تھا
باتیں گم، بولی تو صرف اتنا۔

"جانتی ہو؟" ایک گھر ہے، بہت ہی خوبصورت، پھولوں سے سجا، خوشبو سے مہکا۔ وہا
والے سب کے سب بے پناہ محبت کرنے والے ہیں۔ تم وہاں آؤ گی تو دیکھو گی کہ بز
شفقت تمہارے لیے بانہیں پھیلائے کھڑی ہے۔ وہاں بھائیوں کا تحفظ بھی ہوگا اور دوستی کا
بھی۔ سب سے بڑھ کر زین کی چاہتیں، تمہیں خبر نہیں وہ تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ تمہاری خاط
نہیں چھوڑا انہوں نے۔" درد میں ڈوبی وہ مسکراہٹ بے اختیار ہی اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"وہ تمہارا خیال رکھیں گے۔ بس اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، میں واپس جا رہی ہو
روز تمہارے آنے کی راہ دیکھوں گی اور دعا کروں گی کہ میرا انتظار زیادہ طویل نہ ہو۔" لا
سینے پہ پڑا کمزور اور زرد سا ہاتھ اس نے ہولے سے دبایا اور اٹھ کر تیزی سے دروازے
گئی اور اسی شام وہ آثار کے ساتھ اتنے سوالات؟" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر چوما۔

"آثار کے ساتھ آئی ہوں۔ ابھی، اسی وقت۔"

"اچھا چلو، اس سے تو ملوں۔" انہوں نے جھٹ سے چولہا بند کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر
گئیں۔

ذرا دیر میں ہی گھر کے سوئے جاگے ماحول میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ تایا ابا کا

ازدں سے بھر لیا گیا تھا۔ ان کے بوڑھے سینے سے لگ کر ان کا حال احوال پوچھے، اپنا بتاتے
کی پلکیں بار ہا بھیگیں مگر ان ہی کے تھپکتے پر شفقت ہاتھوں کا لمس صبر و ضبط کا حوصلہ بھی دیتا رہا

"ارے، اپنی ہی کہتے رہو گے یا ان درد کے ماروں کا بھی کچھ احوال سناؤ جو اپنی ہی دھرتی پہ
گھر ہوئے بیٹھے ہیں۔" تائی اماں نے آثار کو جھنجھوڑا تو وہ ایک پل کے لیے خاموش سا ہو گیا۔

"کیا کہوں اماں! آپ سب کو پل پل کی خبر تو ملتی رہی ہے۔ بھوک بھی مٹ جائے گی، گھر
بن جائیں گے لیکن جانوں کا زیاں ...... دو نسلوں کا مٹ جانا ...... وہاں موت کی اتنی فراوانی تھی
دل و دماغ ماؤف سے ہونے لگتے تھے۔"

آثار کے چہرے پہ کرب ہی کرب تھا۔

"اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے ہزاروں بچے، نوجوان ...... یوں سمجھئے
ستقبل کے سب خواب، ساری آرزوئیں زمین کا رزق ہو گئیں۔"

"امداد کی کیا صورت حال رہی، کچھ سنبھالا ملا یا نہیں؟"

"بے شک ابا! امداد تو ایک طرف، ان رضا کاروں کے کیا کہنے جو اپنے بہن بھائیوں کے
لیے پیدل سفر کر کے دور دراز کے علاقوں تک پہنچے۔ بہر حال اب اس وقت تو ان کا سارا مسئلہ موسم کا
ہے۔ سردی کی شدت اپنے ساتھ بیماریوں کی بہتات لائی ہے اور وہاں کے فیلڈ ہسپتالوں میں اضافی
مریضوں کی قطعاً گنجائش نہیں اور ڈاکٹرز نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر ان تباہ حال لوگوں کو سردی
سے بچانے کے لیے مناسب اقدامات نہ کیے جا سکے تو پھر سانس کے امراض اور ہائپو تھرمیا کے
امکانات بڑھ جائیں گے اور اس کا نتیجہ زلزلے سے زیادہ ہلاکت خیز ہوگا۔"

"استغفر اللہ ...... استغفر اللہ ......" تایا ابا کی تسبیح کے دانے تیزی سے گرنے لگے تھے۔

"اٹھو تم لوگ اب ...... آرام کر لو۔" بی بی نیر گھبرا کر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور رات گئے امی
کے ساتھ بیڈ پہ لیٹے، نرم گرم بستر کی لطافت کو محسوس کرتے وہ ہزار ہا سوچوں میں ڈوبتی، ابھرتی
رہی۔

"ایسا ہی ایک گھر ہوتا ہو گا اس کا بھی۔ ایسے ہی محبت کرنے والے رشتے" ایسے ہی پیار
جتانے والے ناطے، ایسا ہی آرام، ایسا ہی سکون، ایسے ہی مطمئن سے روز و شب۔ ایسی ہی خوشیوں
بھری کائنات۔" اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔

"تارا! نیند نہیں آ رہی کیا؟" امی اس کی بے چینی محسوس کر کے ہولے ہولے اس کے بال

سہلانے لگی تھیں۔

"امی!" وہ ان سے مزید قریب ہوگئی۔

"اگر اپنی کوئی بہت ہی قیمتی چیز کھو جائے صبر کیسے کرتے ہیں؟" اس نے مدھم آواز میں
کی۔

"اللہ کی رضا میں راضی ہو جاتے ہیں میری جان! پھر وہ خود اپنے بندے کو صبر دیتا
انسان بہت کم فہم ہے۔ اسے کیا خبر وہ چیز کس کے لیے زیادہ قیمتی ہے؟" سو چھن جائے
کرتے۔ سب معاملہ اسی پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بہت انصاف کرنے والا ہے۔"

وہ دھیرے دھیرے بولتی رہیں۔ نین تارا کمرے کی نیم تاریکی میں ان کی آواز سے
بگڑتے دائروں کو دیکھتے دیکھتے نیند کی وادیوں میں جا اتری تھی۔



"زرد پتہ شاخ سے ٹوٹا اور لہراتا فضا میں ڈولتا ہوا اس کے پاؤں کے قریب سبز گھاس
ٹھہر گیا۔ لاجور کی نگاہوں نے شاخ سے زمین تک کا سفر اس پتے کے ساتھ ساتھ طے کیا تھا۔
درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑے زین العابدین نے اس کی توجہ کے اس انداز
نوٹ کیا۔

"خزاں قریب ہے، کچھ زیادہ وقت نہیں بیتے گا کہ فضا میں ان درختوں کی برہنہ شاخیں
اور ملول، ساکت نظر آئیں گی۔ پرندے گھونسلے خالی کر جائیں گے۔ سرسبز مناظر زرد اور ویرا
جائیں گے۔ یہی قانون فطرت ہے۔" وہ درخت سے ہٹ کر اسی بنچ کے دوسرے سرے
بیٹھے۔

"ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ اب بالکل ٹھیک ہو۔ چند روز بعد تمہیں یہاں سے ڈسچارج
جائے گا۔" دونوں بازو سینے پہ باندھتے ہوئے انہوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ دوسری طر
چہرہ کیے کسی نادیدہ نقطے کو گھور رہی تھی۔

"تم.....کہاں جاؤ گی؟ کسی قریبی عزیز، رشتے دار، دوست کے ہاں یا کسی کیمپ میں؟"
وہ کوئی بھی رسپانس دیے بغیر جوں کی توں بیٹھی رہی۔ وہ لب بھینچے اٹھ کر اس کے سا
کھڑے ہوئے۔

"یوں کب تک چلے گا لاجور! بے حسی کی یہ چادر تمہیں کب تک حقیقت کی نظروں سے چھ
رکھے گی۔ زندگی کی تلخیاں شدید تر ہی کیوں نہ ہوں، ان سے منہ نہیں موڑا جاتا۔ ان درختوں کو

ان کی ساری ہریالی ان سے چھین لی جائے گی مگر یہ اپنی جڑیں اپنی زمین میں گاڑے رکھیں گے۔
آسمان کی جانب ابھی شاخیں محو دعا رہیں گی اور بالآخر ان پر بہار آ ہی جائے گی۔ آج خزاں تم پر
اپنے پنجے گاڑ چکی ہے مگر تمہیں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھنے ہیں اور پھر تم اکیلی تو نہیں۔ ادھر
دیکھو، میری طرف۔" وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھے۔

"میں ہوں نا تمہارے ساتھ، تمہارا ہر دکھ بانٹنے کے لیے، تمہیں چھایا دینے کے لیے پھر
کیوں خوفزدہ ہو؟ ایک بار اعتبار تو کرو، جو چھن گیا ہے، وہ تو تمہیں لوٹانے پر قادر نہیں ہوں لیکن
میری محبت، تمہارے دکھوں پر مرہم ضرور رکھ دے گی۔" وہ مستحکم لہجے میں اسے یقین دلا رہے تھے مگر
دوسری طرف کوئی اثر نہ تھا۔

"لاجور! تم سن رہی ہو جو میں تم سے کہہ رہا ہوں؟" وہ بند دروازے پر بڑی مستقل مزاجی
سے دستک دے رہے تھے۔

"کوئی تو جواب دو، کوئی اشارہ جو میری امید کے خالی کشکول کا پہلا سکہ ثابت ہو سکے۔" وہ
استفہامیہ نگاہوں سے کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا لاجور! نہ تمہاری بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی مجھے چاہ ہے۔ ہاں
میری خود غرض محبت شاید مجھے جلد باز بنا رہی ہے لیکن تم فکر مت کرنا۔ میں بہت مستقل مزاج انسان
ہوں۔ تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک تم خود اپنے لیے، اپنی مرضی کے
مطابق کوئی فیصلہ نہیں کر لیتیں۔" اس کی بے پناہ خاموشی میں انہیں اپنی آواز کی بازگشت اپنی ہی
طرف لوٹتی محسوس ہوئی تو بالآخر چپ ہو کر اس کے برابر جا بیٹھے۔

اداسی بھری زرد رو شام دھیرے دھیرے رات کے آنگن میں اترنے لگی تھی۔ اپنے اپنے
گھونسلوں کی طرف لوٹتے پرندوں کے پر، مسافت کی گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ چڑیوں کی معصوم
چہکاروں میں تھکن کا راج تھا۔

سورج اپنی تھکی ماندی کرنیں سمیٹ چکا، تب انہیں ہلکی ہلکی سردی کا احساس ہوا۔

اپنی سوچوں میں گم زین العابدین سرد ہوا کو محسوس کرتے ہوئے چونکے تو احساس ہوا کہ لاجور
تھک چکی ہوگی۔ کسی نرس کو بلانے کے خیال سے وہ اٹھنے ہی والے تھے کہ اپنے کندھے پر کسی دباؤ
کو محسوس کرتے ہوئے یکدم ٹھٹک گئے۔

"زریاب مر گیا تھا نا؟" ادھرے یقین میں لپٹا سوال۔ اپنے کندھے پر رکھے اس کے ہاتھ
کے سرد لمس کو محسوس کرتے ہوئے وہ ششدر سے بیٹھے اس کی آنکھوں میں جھانکتے رہ گئے تھے۔



آثار نے آتے ہی اپنے لیے بے پناہ مصروفیت ڈھونڈ نکالی تھی۔ غالباً وہیں سے سوچ
کہ اپنا ہنر کس طرح برتنا ہے۔ این سی اے کا ڈگری ہولڈر تھا۔ ابھی پہلی تصویر بھی نہ بنی تھی
نمائش کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے منجھے ہوئے مصوروں کا بھی
حاصل تھا۔ کچھ اس کے ساتھ طلباء بھی شریک کار تھے۔ نمائش سے حاصل ہونے والی تمام
زلزلہ زدگان کی مدد کے کام آئی تھی۔ اسی مصروفیت میں وہ گویا شب و روز کا فرق مٹائے بیٹھا

نین تارا نے چند دن بعد ہاسپٹل جوائن کر لیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر اپنے کمرے میں
جاتی۔ وہ ٹھیک ٹھاک چہکنے والی، ہنستی کھیلتی، خوش باش لڑکی تھی۔ اس کا اس حد تک بدلا ہوا لہجہ
سب ہی کے لیے حیرت کن تھا مگر جن حالات کو دیکھ کر وہ یہاں آئی تھی، ان ہی کا رد عمل
ہوئے خاص طور پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا لیکن اس کا دل بہلانے کو بی بی نیر یا تائی اماں
کمرے سے باہر نکال کر اپنے ساتھ مصروف رکھنے کی کوشش کرتیں۔ وہ کبھی چپ چاپ ان
ساتھ لگی رہتی، کبھی تھکن کا کہہ کر اپنے کمرے میں جا کر پڑی رہتی۔

کبھی کبھار بی بی نیر ہول سی جاتیں۔

''کیسی گم صم سی ہوتی جا رہی ہے یہ لڑکی ......! دل پہ لے لی ہے ساری بات ...... چہرہ
زردی ہے کہ جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔''

تایا ابا بھی اسے دیکھ رہے تھے مگر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے لیکن اسے کھانے کی
یونہی بے دلی سے چند لقمے لے کر اٹھتے دیکھا تو بے اختیار ہی ٹوک بیٹھے۔

''نینو! بیٹھ جاؤ۔''

''میں کھا چکی تایا ابا!'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''ادھر آؤ۔'' انہوں نے اسے اپنے برابر والی کرسی پہ بٹھایا اور پلاؤ کی ڈش اٹھا کر اس
سامنے رکھ دی۔

''تمہاری بی بی نیر کھانے پر بہت محنت کرتی ہیں۔ کم از کم اتنا تو کھانا چاہیے کہ وہ اپنی محنت
وصول کر لیں۔'' انہوں نے خود سے چمچ بھر کر اس کے سامنے کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی محض ان کی
رکھنے کی خاطر انہیں کھانا پڑا۔ کھانے کے بعد وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔

ٹی وی پر کوئی ڈاکومنٹری فلم چل رہی تھی۔ دیکھنے کے ساتھ ساتھ تایا ابا مختلف خبروں کو ڈ
کرنے لگے تھے۔ وہ غائب دماغی سے ہوں، ہاں کرتی رہی۔ تایا ابا خود ہی زیادہ دیر تک

پھر ایک کتاب کھول کر اس کے آگے رکھ دی۔

فلسفے کے کچھ مسئلے، مسائل تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اب تک پڑھنے کے بعد اس میں سے
نکتے نکال کر بحث کر چکی ہوتی مگر اب تو نظریں بار بار اس پیراگراف پہ پھسلتی رہیں، دماغ
بالکل خالی، سرے سے کچھ سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا۔ عجیب جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتے ہوئے اس
کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی تھی۔

تب ہی دروازہ کھلا، بی بی نیر کے پیچھے ثریا چائے کی ٹرے اٹھائے چلے آ رہی تھی۔

''تایا ابا بڑے اطمینان سے ان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے پھر اپنا کپ اٹھا کر چائے کے
گھونٹ بھرتے ہوئے بغور اسے دیکھنے لگے۔''

''فیصلہ کر ہی چکی ہو تو پھر یہ اضطراب کیونکر؟'' چائے کے کپ سے اڑتی بھاپ کو دیکھتے
ہوئے وہ ان کی بات پر چونک سی گئی۔

''ایسے معاملات میں دل بڑا کرنا پڑتا ہے۔''

''آہ ...... یہ درد آشنا لہجہ اور میں انہیں بے خبر سمجھتی تھی۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے
تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

''جگہ تو تم نے خود چھوڑی ہے نا؟ جان بوجھ کر اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے، ورنہ مقابل تو بہت
کمزور تھا۔''

''جانتی ہوں تایا ابا! وہ کمزور اور شکستہ وجود ہی مجھے ڈھا گیا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں سر
تھامتے ہوئے ایک بار پھر خود کو کمزور پڑتے محسوس کیا۔

''اس کا محروم وجود، اس کی بے رنگ آنکھیں، اس کا بے یقین، غیر محفوظ مستقبل ...... زین
اسے ''زندگی'' کی طرف واپس لانا چاہتے تھے تو میرا دل اتنا کٹھور تو ہرگز نہ تھا کہ لاجور کے مقابل
اٹھ کھڑی ہوتی۔ زین کے مقدس جذبات کا احترام مجھ پر لازم تھا تایا ابا! ان کے خلوص نیت، ان
کی سچائی کی سب سے بڑی گواہی میرا دل دے رہا تھا۔ میں نے خود چاہا کہ وہ یہ سب کریں مگر میرا
دل ...... میرا نہیں ٹھہرتا تایا ابا!'' وہ ان کے سامنے بکھری سی گئی تھی

''اسے کسی صورت چین نہیں، بے قراری ہے کہ گھٹتی ہی نہیں ......'' اس نے بے چینی سے ہاتھ
ملے۔

تایا ابا خاموشی سے سنتے اور زیر لب کچھ پڑھتے رہے۔ پھر سیدھے ہو کر اسے اپنے تخت پر
بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تھکی تھکی سی ان کے سامنے جا بیٹھی۔

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیشانی پہ پھونکا اور پھر بے اختیار ہی اٹھ کر اس کا سر چوم لیا۔

بنا کسی خوشبو کے معطر وجود...... سفید بارلیش داڑھی، آنکھوں میں جلال کی سرخی، لہجے کی نرمی، نین تارا کا دل چاہا اس کو محفوظ پناہ گاہ میں اپنے سارے دکھ بھول جائے۔ ایک ... بہائے اور ہمیشہ کے لیے شانت ہو جائے۔

"جاؤ، سکون آئے گا میری بچی! ضرور آئے گا۔ جاؤ، سو جاؤ......" تایا ابا نے کہہ کر ہوئے اسے خود سے علیحدہ کیا تو وہ اپنی تم آنکھوں مسلتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

"معلوم نہیں، کیا بھید ہے؟" اس کے جانے کے بعد انہوں نے تکیے سے ٹیک لگا کر اپنی پیشانی مسلی۔

"ہم نے تو آخری رات تک بھی نین تارا ہی کو زین العابدین کے برابر کھڑے ... انہیں اپنے خواب میں ملنے والے اشاروں کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آنے لگی تھی۔



بہت بے کیف سے شب و روز تھے۔ بے رنگ و بو دن رات...... ایک، ایک کر کے چلے جا رہے تھے۔ اس کے دل پر بھی موسموں کی طرح ہلکی ہلکی دھند بسیرا کیے بیٹھی تھی۔ کھل ... ہونے دیتی نہ غمگین۔

ہسپتال کی مصروفیت میں جو وقت بیت جاتا وہی اچھا تھا۔ ورنہ گھر آ کر خالی کمرا اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

آثار اپنے شہر میں کامیاب نمائش کے بعد انکل عباسی کی خواہش پر اگلی نمائش کے لیے آباد جا چکا تھا۔

ذی وقار کے سمسٹر ایگزام شروع ہو چکے تھے۔ امی اس کے ساتھ بری طرح مصروف اماں اور بی بی نیر کے اپنے ہزاروں کام۔

وہ لان میں بیٹھی جان محمد کو پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے دیکھا کرتی یا پرندوں کے پنجرے سے لگ کر وقت بتاتے کی کوشش کرتی۔ تایا ابا نے اس کے بعد اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ راولپنڈی سے کئی بار فون آیا مگر کبھی وہ دانستہ ادھر ادھر ہو گئی۔ کبھی تایا ابا خود بات کہہ کر ٹال دیتے۔ اس کے پرسنل سیل پر البتہ کبھی وہ نمبر نہ جگمگایا۔ جیسے دیکھنے کی موہوم ہر نئی بیپ پر اس کے دل میں جاگ اٹھتی تھی۔

اور وہ ایسی ہی ایک زرد سی شام تھی جب ہاسپٹل سے نکل کر یونہی بے مقصود وہ شہر کی خاموش سنسان سڑکوں سے دل کا حال کہتی رہی۔ نہر کنارے گاڑی روک کر شفق کی زرد رنگ سرخی کو پانی میں کھلتے دیکھتی رہی۔ اور تب ہی اٹھی تھی جب دور پل کے اوپر آتی جاتی گاڑیوں کے ساتھ رنگ ... لی روشنیاں بھی بھاگنے دوڑنے لگیں۔

گاڑی گیٹ پر ہی روک کر چابی چوکیدار کو دے کر وہ اندر آئی تو سارا گھر کھانوں کی دلفریب مہک سے بھرا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں بھی ہلچل سی محسوس ہوئی۔ یونہی چلتے چلتے اندر جھانکا۔ ثریا ابھی تک یہی بی بی نیر کے ساتھ خاصی مصروف۔

"خیریت...... آج اتنا اہتمام کس خوشی میں......؟" اس نے پیچھے سے جا کر ان کی کمر میں بازو ڈالا۔

"پتہ ہے کون آیا ہے......؟" سبز الائچی دودھ میں ڈال کر وہ مسکرائیں۔ پلیٹیں تو بنا نام جانے ہی اس کا دل گہرائی میں ڈوب کر ابھرا۔

"دھک دھک......" بے ترتیب دھڑکن...... غیر ہموار سانسیں اسے چپ کھڑی دیکھ کر

"زین العابدین آیا ہے۔ مگر تم نے اتنی دیر کیوں کر دی...... وہ تو شام سے آیا بیٹھا ہے۔ میں نے ہسپتال فون کیا تو پتا چلا تم نکل چکی ہو۔ پھر کہاں رہ گئی تھیں......؟" وہ چولہے کی آنچ دھیمی کر کے پلٹیں۔

"ایک دوست کی طرف رک گئی تھی۔" وہ انہیں ٹالتے ہوئے باہر نکل آئی۔ راہداری سے گزرتے ہوئے قدموں کی رفتار سست سے سست پڑتی گئی تھی۔

"وہ بھی ساتھ ہو گی؟"

"وہیں بیٹھی ہو گی...... ان کے برابر...... سب کے درمیان......" ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا تھا۔

کھلے دروازے سے باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں...... وہیں دہلیز پہ رک کر اس نے ایک پل کے لیے گہری سانس لیتے ہوئے خود کو کمپوز کیا اور دوسرے پل کمرے میں داخل ہو گئی۔ پہلی نظر نے سب افراد کے درمیان زین العابدین کو ہی کھوجا اور پھر یوں الجھی کہ سلام کہنا بھی بھول گئی۔

"لو...... نین تارا بھی آگئی......" نجانے کس نے کہا تھا۔ انہوں نے چائے کا گھونٹ
تپائی پہ رکھتے ہوئے اچانک ہی اسے گردن موڑ کر دیکھا۔

"السلام علیکم......!" اسے یوں ساکت کھڑے پا کر مبہم مسکراہٹ کے ساتھ وہ بو
چونکی...... نگاہ ان سے ہٹی تو سب چہروں سے ہوتی ہوئی دوبارہ سے انہی پہ آٹکی۔

وہ، جسے ان سب کے درمیان اس وقت ہونا چاہیے تھا، نہیں تھی۔

کوئی سوال اس کی آنکھوں میں جاگا تو تھا جسے پوری طرح نظرانداز کر کے وہ تایا ابا
متوجہ ہو گئے تھے۔

"بیٹھو گی نہیں تارا......!" تائی اماں نے اپنے برابر جگہ خالی کی۔

"کپڑے بدل لوں تائی اماں!" وہ دھیرے سے کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔

"اور میں سمجھی تھی، اپنے آپ کو سنبھال چکی ہوں۔"

وہ دروازہ بند کر کے بیڈ پہ گر گئی۔ جانے کیوں اپنی کمزوری پہ دکھ ہوا تھا۔

کروٹ بدل کر آنکھیں بند کیں تو کچھ دیر پہلے کا منظر ایک دم روشن ہو گیا۔

ہاتھ بڑھا کر مگ رکھتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھنا اور دھیرے سے مسکرا
مسکراہٹ میں کوئی مفہوم نہیں تھا۔ بہت سادہ، بے ریا، پہلی سی خالص، مگر جانے کیوں آج
اور طرف جا ہی نہ پایا رہا تھا۔

کتنا بہت سا وقت اس نے یونہی کروٹیں بدلتے گزار دیا۔ دروازے پر دوسری با
ہوئی۔

"نین تارا! تایا ابا کھانے پہ انتظار کر رہے ہیں۔" ثریا پیغام پہنچانے آئی تھی۔ ا
چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور کھانے کے لیے چلی آئی۔ تایا ابا کے برابر والی ک
تھی۔ وہ وہیں جا ٹکی۔

کھانے کے دوران تمام تر حساس داہنی جانب متوجہ رہیں...... تایا ابا خاصے خوش دکھا
رہے تھے۔ اس نے بھی کسی حد تک نارمل رہتے ہوئے معمول کے مطابق بات چیت جاری ر
کوشش تو کی مگر جلد ہی تھک کر چپ ہو رہی۔

ایک یہ ہی تو خرابی تھی اس میں، اپنا آپ چھپانا کبھی نہ آیا تھا۔

کھانے کے بعد زین العابدین اپنے کمرے میں چلے گئے تو باقی محفل میں تتر بتر ہو گئ
نیند آتی محسوس نہ ہوئی تو باہر لان میں آگئی۔

کہاں جا رہی ہو......؟ مرو گی اتنی سردی میں۔"
امدے کی سیڑھیاں اترتے دیکھ کر امی نے اسے ٹوکا مگر وہ ڈھیٹ بن کر نکل گئی۔
جانے دیجئے...... اس عمر میں یہ بھی ایک کریز ہوتا ہے۔" بی بی نیر نے ہنس کر اس کی
ں اور پھر کافی کا مگ بھی ثریا کے ہاتھ وہیں بھجوا دیا۔
لی ہوئی چاندنی میں گھونٹ گھونٹ کافی پیتے ہوئے اس کی نظریں کئی بار بھٹک کر دوسری
بند کھڑکیوں تک گئیں اور دوسری جانب پھیلے اندھیروں سے ٹکرا کر واپس پلٹتی رہیں۔ کتنے
ے اس کے ذہن میں، جو جواب چاہتے تھے۔
کتنی بے چینیاں لاحق تھیں۔
کتنی الجھنیں تھیں۔
"اسے آنا تھا، تو کیوں نہیں آئی......؟ اب نہیں آئی، تو پھر کب آئے گی؟" وہ لان میں رکھے
پر جا بیٹھی۔
"انسان مرتا ہے، یا زندہ رہتا ہے اور میں تو شاید زندگی اور موت کے بیچ میں معلق ہوں۔"
ے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے دونوں پاؤں اٹھا کر بینچ پہ رکھے۔ تب ہی برآمدے کی سیڑھیوں
ی اترا اور سیدھا اسی کی جانب چلا آیا۔ وہ سانس روکے انہیں دور سے آتا دیکھتی رہی۔
وہی جینز اور وہی بھاری سی جیکٹ، کپڑے ابھی تک نہ بدلے تھے۔

"تو گویا سکون سے یہ بھی نہیں۔"

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟" جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سر پہ کھڑے پوچھ رہے

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اب اس بات کا بھلا کیا جواب دے سکتی تھی۔
"لاجور...... نہیں آئی آپ کے ساتھ......؟" کچھ توقف کے بعد وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
"نہیں...... لاجور نہیں آئی، میرے ساتھ۔"
"کیوں......؟ اس کی طبیعت کیسی تھی، مطلب کوئی امپرومنٹ تو ہونی چاہیے تھی نا اب تک؟"
بیٹھے نہیں تو اس نے خود ہی کھڑے ہونا مناسب سمجھا۔
"ہاں، امپرووتو کر لیا تھا اس نے......" وہ غالباً واک کرنے کے موڈ میں تھے۔ وہ بھی ان کا
تھ دینے لگی۔
"پھر......؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"اس نے یہاں آنے سے خود انکار کر دیا۔" وہ معمول کے لہجے میں بتا رہے تھے۔
نین تارا ٹھٹک کر رک گئی۔ اجلی چاندنی میں ان کے چہرے کے تاثرات جاننے کی
مگر وہ زین العابدین ہی کیا جو کھل کر سامنے آ جائیں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نین تارا......!" ان کا لہجہ ذرا مدھم سا لگا اسے۔

"وہ لڑکی جسے میں بہت کمزور سمجھا تھا، بہت بہادر نکلی۔ اس نے اپنے ریزہ ریزہ و
چٹانوں کو بھی شکست دے دی۔ جانتی ہو ڈاکٹر محمود الحسن حیران رہ گئے تھے۔ ایک ہی شخص
انتہائی رخ دیکھ کر۔" وہ اسے سوچ کر ذرا مسکرائے۔

"لیکن زین! وہ اکیلی تھی، بالکل تنہا...... اسے کسی نہ کسی کا سہارا تو لینا ہی تھا۔" وہ
یقین تھی۔ بھلا دنیا میں کوئی ایسی لڑکی بھی ہو سکتی تھی جو زین العابدین جیسے انسان کا ساتھ
انکار کر دیتی۔

"انسان اندر سے مضبوط ہو جائے تو اسے بیرونی سہاروں کی ضرورت نہیں پڑتی تارا
نے جیسے تھک کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی طویل سانس لیتے ہوئے بینچ پر ٹک گئے۔

"اسے زریاب کی موت کا علم تھا...... اور جانتی ہو، آخری ملاقات میں اس نے مجھ
تھا؟" انہوں نے پلٹ کر اس کی حیران آنکھوں میں جھانکا۔

"اس نے میرے ہر سوال کے جواب میں میرے ہی لفظ مجھے لوٹا دیے تھے۔ اس
اس نے کہا تھا۔"

"خزاں آتی ہے تو درختوں سے ہریالی چھین لی جاتی ہے، مگر یہ درخت اپنی جڑیں
گاڑے رکھتے ہیں۔ ان کی زرد و شاخیں آسمان کی جانب باہیں پھیلائے محو دعا رہتی ہیں
ان پر بہار آ ہی جاتی ہے۔ زین العابدین! خزاں مجھ پر حملہ آور ہو چکی ہے، مگر مجھے ا
مضبوطی سے جمائے رکھنے ہیں۔ ہریالی صرف مجھ سے نہیں چھینی گئی۔ میری تو ساری بستی
رسیدہ ہو چکی ہے۔ مجھے ان کا ساتھ دینے دیجیے۔ اگر آج میرے قدم اکھڑے گئے تو کل آ
بہار شاید کبھی میرے لیے اپنی باہیں وا نہ کرے۔ مجھے اپنے لوگوں کو دکھ بانٹنے ہیں، انہیں
چلنا ہے۔ انہی میں سے سہارا ڈھونڈنا ہے۔" وہ اس کے الفاظ دہرا کر چپ ہو رہے۔
گیٹ کے آس پاس لگی روشنیوں میں بھٹک رہی تھیں۔

"اور اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ زین العابدین! آپ بھلائے جانے کے لائق نہیں

شق زریاب سے کیا تھا، لیکن جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا اس کے بدلے تو پوری زندگی
، نام کی جا سکتی ہے کہ ان دم توڑتی سانسوں اور لاغر ہوتی زندگی کو آپ کی محبت نے ہی تو
"اس کے احترام و ممنونیت سے لبریز لہجے کو دل ہی دل میں سوچتے ہوئے انہوں نے نین
تھا...... جوان کے چہرے پر جانے کیا کھوجتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

آپ کو دکھ تو ہوا ہوگا ناں زین!" انہوں نے ہنستے ہوئے سر جھٹکا۔

اگر آپ کسی کی انگلی تھام کر اسے ایک ایک قدم چلنا سکھا رہے ہوں اور ایک وقت ایسا
وہ آپ کے سامنے دوڑتا ہوا دور نکل جائے تو آپ کو خوشی ہوگی یا دکھ......؟"

ت عجیب سا سوال تھا...... مگر اسے غور کرنے کی مہلت نہ دی تھی انہوں نے......

تمہیں تو دکھ ہوا ہوگا نا! لاجور کے یہاں نہ آنے پر......؟" وہ خاصی سنجیدگی سے پوچھ رہے
ن تارا ان کا لہجہ بھانپ گئی۔

میں نے خلوص نیت سے اس کے لیے جگہ چھوڑی تھی، لیکن مجھے یقین تھا زین! آپ مجھے
میں مر ہی جاتی۔" اس کے آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

کتے رکتے بھی دل کی بات زبان پہ چلی آئی تھی۔

گلی......" انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے اس کے سر پہ ذرا سی چپت لگائی اور یونہی اٹھ کر ٹہلنے

ین تارا ان کے ہم قدم تھی...... کس قدر پرسکون اور مطمئن......
جلی چاندنی پھوار کی صورت ان دونوں پر برس رہی تھی۔ خوشبو سے لبریز سرد اور خنک ہوا نے
رسے ان دونوں کو چھوا اور کسی انجانے دیس کی طرف روانہ ہو گئی۔



دل کے موسم

''ثانیہ! جمعہ کو تمہارا نکاح ہے۔'' تائی اماں نے بہت اچانک کہا تھا۔

برآمدے کی سیڑھیوں سے صابن کا جھاگ ہٹاتے ہوئے جینا کے ہاتھ سے جھاڑو
تھی۔ آلو چھیلتی ہوئی روبی چھری روک کر نا سمجھی کے عالم میں ماں کو دیکھنے لگی تھی اور خود ثا
مشین کا سوئچ آف کرتے ہوئے اپنی جگہ ساکت سی رہ گئی تھی۔

''تم آج بازار جا کر کچھ ضروری چیزیں لے آنا۔''

ثانیہ نے پلٹ کر دیکھا، تائی اماں نے پالک کے گلے سڑے پتے اٹھا کر ڈسٹ
ڈالے اور کٹی ہوئی پالک کی ٹوکری اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ثانیہ کی نگاہیں
میں جم کر رہ گئی تھیں۔

ڈسٹ بن ...... کوڑے دان ...... جس میں گلی سڑی اور تعفن زدہ چیزیں نہایت کرا
ساتھ پھینک دی جاتی ہیں۔ اسے اپنا وجود کوڑے دان میں گلتا سڑتا محسوس ہوا تھا۔

''جمعہ کو تمہارا نکاح ہے۔ یہی کہا ناں اماں نے؟''

روبی کو کو بھی غالباً اس کی طرح اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا تھا۔

''تم ٹھہرو میں ابھی ٹھیک طرح سے معلوم کر کے آتی ہوں۔'' وہ اس کے پاس
گئی۔ تب ہی اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے دھندلائی ہوئی
سے دیکھا۔ جینا متفکر چہرہ لیے اس کے نہایت قریب کھڑی تھی۔

''باجی جی ...... یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ نہ کوئی بات چیت کا سلسلہ ...... نہ منگنی شگنی
سادا نکاح اور وہ بھی جمعہ کو۔'' جینا نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی انگلیوں کو گنا۔

''اور جمعہ میں بھی تو بس چار دن باقی ہیں۔'' اس نے جی بھر کے پریشان ہوتے ہوئے بغور گم
ی ثانیہ کو دیکھا اور فی الحال اسے اپنی رائے دینے پر آمادہ نہ ہوتے دیکھ کر وہ اصل صورتحال
نچ پڑتال کے لیے روبی کے پیچھے بھاگ گئی۔ ثانیہ نے سہمی سہمی نظروں سے باورچی خانے
ی دروازے کو دیکھا اور ٹوٹتی ہوئی سانسوں کے ساتھ سہارے کے لیے سنگی ستون سے سر ٹکا
نے ہی لمحے خود کو دلاسا دینے کے بعد وہ سیدھی ہوئی۔ جینا پانی کا پائپ یونہی پھینک کر چلی گئی
ھل بھل بہتے پانی نے پورے برآمدے اور سیڑھیوں کو بھگو دیا تھا اور سیڑھیوں کے سامنے بنی
ں اسی پانی سے بھر سی گئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر پانی بند کیا۔ واشنگ مشین کا سوئچ آف
ے اسے برآمدے کا پانی صاف کرنے لگی۔ اسے اپنے ہاتھ کپکپاتے ہوئے محسوس ہو رہے
ہ خود کو نارمل رکھنے کی شعوری کوشش کر رہی تھی اور جب یہ ممکن نہ ہو سکا تو وہ جھاڑو پھینک کر
ھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر باورچی خانے کے خالی دروازے کو دیکھا اور پھر چلتی
روازے کے باہر آ رکی۔ تائی اماں کی آواز یہاں بھی بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ اسے اندر
ی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''اچھے خاصے کھاتے پیتے خوشحال لوگ ہیں۔ اس کے تو عیش ہو جائیں گے۔''

''لیکن اماں، اتنی جلدی کیوں؟ ابھی تو ہم لوگوں نے کچھ تیاری بھی ......'' روبی نے سوال
مگر تائی اماں نے تلخ لہجے میں اسے ٹوک دیا۔

''تیاری کیسی؟ لاکھوں، کروڑوں کا مال نہیں چھوڑا اس کے اماں باوا نے کہ ٹرک بھر بھر کے
ے بھجواؤں گی۔ تم بازار جا کر دو چار بنے بنائے سوٹ لے آنا۔ زیور وہ لوگ خود ہی لائیں

اس سے پہلے کہ روبی مزید استفسار کرتی اور تائی اماں اسے مزید جلی کٹی سناتیں وہ وہاں سے
اٹھی اور کمرے میں آ کر اپنی چارپائی پر گر سی گئی تھی۔

وجود میں کچھ ایسا تھا جو ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھیں سمندر بہا دینے کو تیار تھیں مگر اس وقت وہ رونا
چاہتی تھی۔ اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور دھیرے دھیرے اپنے اندر کی
بھکنے لگی جس کی سسکیاں کرب بن کر اسے نڈھال کر رہی تھیں۔ جینا کمرے میں آئی تو اسے
الت میں پڑے دیکھ کر طویل سانس لے کر رہ گئی۔

وہ ابھی تک ان ہی کپڑوں میں تھی جو کپڑوں کی دھلائی کے درمیان آدھے سے زیادہ بھیگ
تے۔ پہلی نظر میں جینا کو یہ ہی شبہ ہوا تھا کہ شاید وہ سو رہی ہے لیکن اس کے مسلسل ہلتے پاؤں

نے جینا کے شبے کو رد کر دیا تھا۔

”باجی جی ......“ جینا کے لہجے میں ہلکا ہلکا جوش نمایاں تھا۔ اس کی آواز پر ثانیہ کا ہا
ساکت ہو گیا تھا لیکن انداز میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”ثانیہ باجی ...... میں نے سارا پتا کر لیا ہے جی۔ آپ کو تو بڑی اچھی جگہ شادی
ہے۔“ جینا نے فوراً آگے بڑھ کر ثانیہ کا بازو ہٹایا تو وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔
خوش نظر آ رہی تھی۔

”پتا ہے اماں جی نے آپ کی تصویر لڑکے والوں کو دکھائی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی
کر لیا۔ لڑکے کو آپ کے تایا دیکھ آئے تھے۔ ان کا گھر تو ایسا ہے جی کہ دیکھو تو آنکھیں کھ
کئی کئی فیکٹریاں ہیں ان کی۔“ جینا یوں بتا رہی تھی گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ

”اگر اتنے ہی امیر کبیر ہیں تو یہاں اس پانچ مرلے کے مکان تک کیوں آ گئے؟ او
بھی گئے تو تایا، تائی مجھ پر اتنے مہربان کب سے ہو گئے کہ روبی کے بجائے مجھے اس
مزے لوٹنے کے لیے بھیج رہے ہیں؟“ وہ بری طرح الجھ رہی تھی، مگر جینا سے کچھ کہنا م
سمجھا تھا سو چپ چاپ اس کی بچکانہ باتیں سنتی رہی۔

”ہائے باجی! کتنا مزہ آئے گا۔ میں نے ابھی پچھلے دنوں ہی اپنی سہیلی سے نیا
ہے۔ بس اس میں گھنگھرو لگانے رہتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی تو چار دن باقی ہی
ڈھولک بجائیں گے یا پرات ...... ڈھولک تو مجھے بجانی نہیں آتی۔ چلو میں اپنے حصے کی
لوں گی۔“

ثانیہ نے قدرے جھنجلا کر جینا کو دیکھا جو کسی خودکار مشین کی طرح کھٹا کھٹ اپنے
ڈھیر لگاتی جا رہی تھی۔

”ہاہائے باجی۔ آپ نے اس طرح منہ کیوں بنایا ہوا ہے؟ اچھا ...... اچھا ...... سمجھ
میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔“ جینا چہکی تو وہ بری طرح چڑ گئی۔

”جینا ......! ایویں خاموش ہو جاؤ۔ اتنا خوشی کا موقع ہے ...... ہائے باجی
قسمت والی ہیں۔ اتنی جلدی شادی ہو جائے گی آپ کی اور وہ بھی اتنے اچھے گھر میں۔ آ
...... ہک ہا ...... بس اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں اب تو ......“

جینا کو بڑی شدت سے اپنی بدقسمتی کا احساس ہو رہا تھا۔ ثانیہ اس کے چہر
حسرتوں کو دیکھتی رہ گئی۔

ہی بات تو ہولائے دے رہی ہے۔ جینا! ایسی قسمت والی کہاں سے ہو گئی میں؟ آج تک
ب کیا ہے ...... نہیں ملا۔ اب بن چاہے، بن مانگے مل رہا ہے تو کیوں؟ انجانے میں کون سی
د ہو گئی کہ سب ہی خدا مجھ پر مہربان ہونے لگے۔ وہ جو آسمانوں پر ہے اور وہ بھی جو زمین پر
ہیں۔

ے شکوہ کرنے کی عادت نہیں تھی سو چپ چاپ بستر کی چادر سے نادیدہ گرد جھاڑتی رہی۔

”ثانیہ! عاطف آنے والا ہوگا۔ تم روٹیاں پکا لو۔“

ائی اماں کی آواز گونجی تو وہ بری طرح جھنجلا گئی۔

”اف یہ روز کے دھندے ...... معلوم نہیں کب جان چھوٹے گی ان سے۔“

”باجی! آپ رہنے دیں۔ میں روٹیاں پکا لیتی ہوں۔ آپ تو ویسے بھی تھک گئی ہوں گی۔ ابھی
ڈھیر سارے کپڑے دھوئے ہیں۔“ جینا نے اسکے چہرے پر پھیلی تھکن اور بیزاری دیکھ کر کہا
راہی اٹھ گئی۔

”تھینک یو جینا۔“ اس نے تشکرانہ انداز میں جینا سے کہا اور پھر دکھتے ہوئے سر کو تکیے پر گرا
وچ کے دھاگے ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے میں الجھنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
ائی اچانک کیوں اور کیسے ہو رہا ہے۔ تائی اماں تو ان دنوں روبی کے رشتے کے لیے سرگرداں
پھر روبی کے بجائے اس کی رخصتی کا پروگرام کیسے بن گیا۔ وہ درحقیقت الجھ کر رہ گئی تھی۔

بیس سال میں کوئی لمحہ بھی تو ایسا نہیں تھا، جب اس نے صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچا
اس گھر میں اسے اس قابل رہنے ہی نہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے لیے کچھ اچھا یا برا سوچ سکتی۔
بس حکم ماننے کا درس دیا گیا تھا اور ان بیس سالوں میں اس نے ایک بے دام غلام کی مانند
ں پر تندہی سے عمل کیا تھا اور شاید اسی وجہ سے اس کی حیثیت اس گھر میں جینا سے بھی کمتر ہو
ئی تھی۔

تایا ابا کا حکم چلتا تھا تو اسی پر، تائی اماں کی ڈانٹ ڈپٹ، جھڑکیاں سنتی تھی تو صرف ثانیہ، غلطی
ائی اور کسی بھی عمل کی وضاحت کی اسے اجازت نہ تھی۔ فروا آپی اور روبی کالج سے واپس
تو ثانیہ ان کی خدمت گزاری کے لیے پہلے سے وہاں موجود ہوتی۔ عاطف کی ہر بدتمیزی
ت نہ کرنے اور شکایت نہ لگانے کا فریضہ بھی اسے ہی انجام دینا ہوتا تھا۔

اور یہ سب کرتے کرتے اس کے پاس اتنا وقت ہی نہ بچتا تھا کہ وہ اپنے لیے کچھ سوچتی۔ کوئی
ئے خواب پلکوں پر روشن کرتی۔ آتی بہاروں کا سندیسہ سنتی یا جاتی خزاؤں کی آہٹ پر کان

دھرتی۔ اس نے تو کبھی خود کو اس قابل بھی نہ سمجھا تھا کہ وہ چودھویں کے چاند کی فسوں خیز
محسوس کر سکے۔ اس نے آسمان پر بکھرے ستاروں کو کبھی نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ا
پنے تھکن سے چور نڈھال وجود کو بستر پر گراتی تو اس کے لبوں سے ایک ہی دعا نکلتی تھی کہ
وہ مر جائے۔ اسے اپنی زندگی سے جو بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی، سخت نفرت تھی۔

وہ جینا نہیں چاہتی تھی۔ کبھی کبھار اس کی بے بسی اپنی انتہاؤں پر پہنچ کر بغاوت میں
اسے لگتا وہ ایک پل میں سب کو تہس نہس کر دے گی۔ مگر یہ باغی پن تایا کی آنکھوں سے
اور تائی کے طعنے اور طنز و تمسخر کے سامنے دم توڑ جاتا۔

تائی اپنی انگلیوں پر گنتے ہوئے ایک ایک احسان جتانے لگتیں جو ان بیس سالوں
نے اس پر کیے تھے۔ اس کی ساری سرکشی ساری بغاوت، ساری جرأت لمحوں میں غائب
وہ...... دونوں ہاتھ باندھے ایک بار پھر حکم کی غلام بن جاتی۔ ہاں، ایسا نہ ہوتا اگر وہ اندر
ہوتی اور اس کی ذات کی کمزوری ہی تھی جو ہر مقام پر اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیتی تھی۔

بچپن سے ہی اس کی شخصیت کو اس طرح مسخ کیا گیا تھا کہ اب اس کی زبان ان
ساتھ نہیں دیتی تھی۔ اس میں سر اٹھا کر چلنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ اس نے بہت کچھ چپ
سیکھ لیا تھا۔ اپنی ڈور دوسروں کے ہاتھ میں تھما دی تھی اور اب اس کا ہر عمل اس ہاتھ کی حر
تھا۔

اور اب یہ ایک نیا فیصلہ اس کے سامنے تھا جس پر ہمیشہ کی طرح اسے نہ اعتراض کرنا
و پیش سے کام لینا تھا۔ اسے تو عمل کرنا تھا صرف عمل، ہمیشہ کی طرح۔

شام کو روبی نے اسے مارکیٹ چلنے کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ روبی
انکار پر قدرے حیرت ہوئی تھی اور جب اس نے ثانیہ نے بڑے اطمینان سے اسے کہہ دیا
"میں مارکیٹ نہیں جانا چاہتی۔ تم میرے لیے جو بھی لے کر آؤ گی مجھے اس پر
اعتراض نہیں ہوگا۔" روبی کو اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش محسوس ہوئی تھی جس پر وہ تن
بھی ہوئی مگر تائی اماں کے کہنے پر وہ جینا کو اپنے ساتھ مارکیٹ لے گئی تھی۔

چیزیں خریدنے میں اسے کوئی زیادہ وقت پیش نہیں آئی تھی۔ اس کا اور ثانیہ کا
تقریباً ایک سا تھا سو اس نے درمیانے درجے کے چار عدد سوٹ، دو جوڑی جوتوں کی اور
سونے کا سیٹ لیا تھا۔ جینا کی پر زور فرمائش پر اس نے منہ بناتے ہوئے کانچ کی چوڑیاں
سیٹ بھی ثانیہ کے لیے لے لیا تھا تاکہ وہ نکاح کے روز پہن سکے۔ یہ سب چیزیں خرید کر

نے چیزیں دیکھتے ہی منہ بنا لیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس نے ان چیزوں پر ضرورت سے
ے خرچ کر دیے ہیں۔ ان کی بات سن کر روبی بے طرح چڑ گئی تھی۔
کیا ہوا اماں! "اگر چار پیسے زیادہ لگ گئے۔ اس کے سسرال والوں کا مال تھا۔ آپ کے
تو کچھ بھی خرچ نہیں ہوا نا؟" تلخی سے کہتے ہوئے روبی نے ثانیہ کی آنکھ سے پانی چھلکتے
ا دیکھا تھا۔

کھانا لگانے کے بعد وہ کچن میں گئی تو دوبارہ واپس نہیں آئی تھی۔ حتیٰ کہ کھانے کے برتن بھی
ں اٹھانے پڑے تھے۔ اس کا موڈ آج ویسے ہی بہت خراب تھا۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے
نے والے برتن یونہی سنک میں ڈال دیئے اور کچن کا دروازہ بند کر کے ثانیہ کے کمرے کی
گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ثانیہ یقیناً اپنے لیے لائی گئی چیزیں دیکھ رہی ہوگی لیکن جب وہ
کا دروازہ کھولنے لگی تو معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔

س نے ادھ کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا تو لائٹ بند تھی اور ثانیہ منہ سر لپیٹے غالباً سو رہی تھی۔ وہ
اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ شاپنگ کا سامان
توں لاؤنج کے صوفے پر پڑا تھا۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور دھاڑ سے
بند کر لیا۔ اسے اس بات پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا کہ ثانیہ نے اس کی خریدی گئی چیزوں پر
ر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

روبی ایک لاپروا اور لاابالی قسم کی لڑکی تھی اور وہ یقیناً اس بے بس اور معصوم لڑکی کی دلی
ت جاننے سے قاصر تھی جس نے اسے مزید پستی میں دھکیل دیا تھا۔



دنیا درد نہ جانے امڑی
دل سے دور دراز
دل سے دور دراز بسے ہے
دنیا دور دراز
اشک لہو میں گھل مل جائیں
سینہ سسک سسک سہلائیں
آئیں بے آواز
دور دور تک روح میں گونجیں

خاموشی کے ساز
جانے کس نقطے پر جا کر
کھلے غموں کا راز
ابھی تو ہے آغاز نئی امڑی
ابھی تو ہے آغاز
دنیا درد نہ جانے امڑی
دل سے دور دراز

رات سیاہ پڑ چکی تھی۔ ثانیہ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اس کی
میں کسی غیر مرئی نقطے پر جم کے رہ گئی تھیں۔ لیموں کے پیڑ کے عقب سے جھانکتا چاند
اداس لگ رہا تھا۔ پورا صحن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف صحن کی داہنی دیوار تھی جو
کی زد میں نیم روشن لگ رہی تھی۔ اس کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے نکلنے والی روشنی نے
وسط میں ایک راستہ سا بنا دیا تھا۔

''میاؤں......'' چھت پر جانے والی سیڑھیوں سے اترتی مانو کی کانچ جیسی آنکھیں
میں چمکی تھیں اور اس کی ''میاؤں'' نے صحن میں بکھری خاموشی کی سپاٹ چادر پر نادید
بکھیری دی تھیں۔ مانو نے برآمدے کے ستون کے پاس رک کر ایک لمحے کے لیے اداس
سی ثانیہ کو دیکھا اور پھر لمبی چھلانگ لگا کر برآمدے کے شیڈ پر چڑھ گئی۔

ثانیہ نے ایک طویل سانس لے کر بازوؤں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ آج اس گھر
آخری رات تھی۔ کل اس کی رخصتی تھی۔ گویا آج اس کی مہندی کی رسم ہونی چاہیے تھی
تائی اماں سے کتنا اصرار کیا تھا کہ اگر محلے میں سے کسی کو دعوت نہیں دینی تو وہ اکیلی ہی
گانا وانا گا لے گی مگر جواباً تائی اماں نے اسے ایسی جھاڑ پلائی تھی کہ بے چاری ہونٹ کاٹتی
وقت سے پہلے ہی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ روبی کو بھی ماں کا رویہ ناگوار تو لگا مگر ان کی خفگی
چپکی بیٹھی رہی۔ اور خود ثانیہ...... اس کی نظروں میں فروا آپی کی مہندی کا دن گھوم رہا تھا۔
دار تو مایوں پر ہی جمع ہو گئے تھے جو باقی تھے وہ بھی مہندی کے دن آ پہنچے تھے۔ خوب رونق
ہوا تھا گھر میں۔ وہ کام کر کر کے ہلکان ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود خوش تھی۔ شادی کی رسم
بڑھ چڑھ کر تو حصہ نہیں لے سکتی تھی مگر بہرحال اس نے ہر رسم کو دیکھا ضرور تھا۔
فروا آپی کو پیلا جوڑا پہنایا گیا تھا۔ پھولوں کے ہار ڈالے گئے تھے۔ کلائیاں کانچ

وں سے بھری ہوئی تھیں۔ سات سہاگنوں نے ان کی ہتھیلیوں پر مہندی سجائی تھی۔ ڈھیروں
ئے تھے۔ ڈھولک بجی تھی۔
ر آج اس کی کوری ہتھیلیاں خود بخود اس کے سامنے پھیل گئیں جہاں لکیریں بہت زیادہ تھیں
نہیں تھا۔ سہاگ کی مہندی کی خوشبو نہیں تھی۔ اس کی کلائیاں سونی تھیں۔ ساعتیں الوداعی
نے کی تمنائی تھیں مگر اس کے آس پاس کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جو اس کی خواہشات کی تسکین بن کر
ں کو آسودہ کر دیتا۔
روازے کے پاس ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اندر آتی جینا کو دیکھ
گئی۔
''جینا تم......؟ تم ابھی تک گئیں نہیں!'' وہ جانتی تھی جینا سات بجے کام ختم کر کے ہی گھر چلی
تی تھی۔
''میں گھر سے ہی آ رہی ہوں ثانیہ باجی۔'' اس نے دوپٹے کے نیچے سے مٹی کا پیالہ باہر
ہوئے کہا۔
''یہ کیا ہے؟'' ثانیہ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر کے اس کی طرف پلٹی۔
''وہ...... باجی جی...... میں مہندی گھول کر لائی ہوں۔'' جینا نے قدرے جھجکتے ہوئے بتایا تو وہ
کے لیے خاموش سی کھڑی رہ گئی۔
''مجھے پتا تھا اماں جی نے مہندی لگانے پر بھی ڈانٹنا تھا اسی لیے میں اپنے گھر سے ہی لے کر
ں۔ آپ یہاں بیٹھیں باجی...... میں آپ کے مہندی لگاتی ہوں۔ سادگی سے نکاح کرنا ہو تو
یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی رسم نہ کی جائے۔'' اس نے ثانیہ کو پکڑ کے چارپائی پر بٹھا دیا اور خود
کا پیالہ سنبھال کر اس کے سامنے جم گئی۔
''جینا......! باقی سب لوگ......'' ثانیہ کو اپنی آواز میں نمی سی گھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔
''ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہیں جی۔ گیارہ، بارہ بجے سے پہلے کہاں اٹھنا ہے ان لوگوں نے۔''
ہاتھ اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے اس نے بڑی بے دلی سے ان لوگوں کے متعلق بتایا۔
''باجی! مجھے ڈیزائن وغیرہ تو آتا نہیں، نہ ہی آپ کے ''ان'' کا نام معلوم ہے ورنہ وہی لکھ
لیکن مجھے لکھنا بھی کب آتا ہے آپ سے ہی لکھواتی۔'' وہ خود ہی بول کر خود ہی ہنسنے لگی تھی۔
ش کے باوجود مسکرا نہ پائی۔ بس چپ چاپ اس سانولی سلونی، دبلی پتلی لڑکی کو دیکھتی رہی
کے ساتھ اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا جو اس گھر کی صرف ملازمہ تھی مگر اس کے سارے شگن

پورے کرنا چاہتی تھی۔

"لو باجی ...... میں نے تو بتاشہ بنا دیا ہے۔" جینا کی آواز پر اس نے چونک کر د
شفاف ہتھیلی کے عین وسط میں جینا نے گول دائرہ سا بنا کر مہندی لگا دی تھی اور اب انگلیو
پر مہندی کا لیپ کر رہی تھی۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ ثانیہ کے لبوں پر پھیلی اور پھر معدوم ہو

گورے گورے ہاتھوں پہ لال لال مہندی
گورے گورے......

جینا نے بڑی شرارت سے اسے دیکھا اور دھیمے دھیمے گنگنانے لگی۔

"باجی آپ بھی گاؤ ناں۔"

میں تو چھوڑ چلی بابل کا دیس
پیا کا گھر پیارا لگے......

جینا نے اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کی تنہا آواز کمرے کی خاموش سی اداس
رہی تھی۔ نجانے کیوں ثانیہ کا دل بھر آیا تو وہ اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر اپنی سسکیاں روکنے لگی۔

میں تو چھوڑ چلی بابل کا دیس
پیا کا گھر پیارا لگے......

"ثانیہ باجی! دیکھیں تو کیسی پیاری مہندی لگائی ہے میں نے۔" دوسرے ہاتھ پر
ڈیزائن بنانے کے بعد اس نے ثانیہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تو اس کا پورا وجود ہولے ہو
تھا۔

"باجی!" جینا کو شک گزرا کہ وہ رو رہی ہے۔

"آپ رو رہی ہیں ناں۔" اس نے یکدم پریشان ہو کر مہندی کا پیالہ زمین پر رکھا ا
کے نزدیک ہو کر اسے دلاسا دینے لگی۔

"روتی کیوں ہیں؟ یہ تو خوشی کا دن ہے باجی۔ اپنے گھر جاؤ گی تو اس جنجال پورے
چھوٹے گی۔ مجھے پتا ہے آپ نے اس گھر میں بڑی مشکل اور تکلیف میں دن کاٹے ہیں۔
سسرال میں آپ کو اتنی ہی خوشیاں دے گا۔ نہ روئیں باجی ......" جینا کا اپنا دل بھی ہو
لرزنے لگا۔ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"مجھے پتا ہے آپ کو اپنے امی، ابو یاد آ رہے ہوں گے۔ وہ ہوتے تو آج کچھ بھی ایسا
آپ بھی فروا باجی کی طرح دھوم دھام سے اس گھر سے رخصت ہوتیں۔ پر باجی! آپ فکر کر

ہوں نا آپ کے پاس۔ میں ہوں ناں۔"
ثانیہ کو اپنے ساتھ لگا کر خود بھی سسکنے لگی تھی اور ثانیہ کے دل کا سارا دکھ اس کی آنکھوں کے
نکلا تھا۔

ح اس کی آنکھ کھلی تو ملگجا سا اجالا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ وہ فوراً ہی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ
ہوئی۔ وضو کرنے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو سب سے پہلے ہاتھ خشک کر کے مہندی کو
، رات جاتے وقت جینا اسے تاکید کر گئی تھی۔

باجی یہ شگنوں کی مہندی ہے۔ دھو کر مت اتارنا، سوکھ کر خود ہی اتر جائے گی۔" اس نے ایسا
تھا اور اب خوب ہی رنگ چڑھا تھا مہندی کا۔ سپید ہتھیلی کے درمیان میں سرخ سرخ مہندی کا
ت خوبصورت لگ رہا تھا۔

نماز پڑھنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو رنگ دار ہتھیلیاں ایک بار پھر اس کی
کے سامنے آ گئیں۔ وہ جیسے سب ہی دعائیں بھول گئی۔ کتنی ہی دیر ہاتھوں پر جمی رہیں۔ پھر
عا کے خاتمے پر چہرے پر ہاتھ پھیرا تو مہندی کی خوشبو کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"یا اللہ!" اس کے دل سے کوئی بے آواز دعا نکلی تھی اور ہونٹ خود بخود رنگ دار ہتھیلیوں پر جم
تھے۔

"ثانیہ! ابھی تک اٹھی نہیں کیا؟" دروازے سے باہر تائی اماں کی آواز ابھری تو وہ چونک گئی۔

"اٹھ گئی ہوں تائی اماں۔" اس نے جواباً آواز لگائی اور پھر جائے نماز لپیٹ کر باہر آ گئی۔ تائی
روبی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جینا کو کوس رہی تھیں جسے انہوں نے آج جلدی آنے
اکید کی تھی۔ ثانیہ سیدھی کچن میں آ گئی۔ رات کے جھوٹے برتن سنک میں پڑے دیکھ کر وہ ایک
کے لیے جھنجھلا سی گئی۔

"مجال ہے جو روبی کی بچی کسی کام کو ہاتھ لگا لے۔"

اس نے دل ہی دل میں روبی کو کوسا اور چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر برتنوں کی طرف متوجہ ہو
ابھی نل کھولا ہی تھا جب روبی بے ترتیب حلیے کے ساتھ آدھی بند اور آدھی کھلی آنکھوں سمیت
نا میں وارد ہوئی۔ ثانیہ کو وہاں موجود دیکھ کر وہ چونکی اور پھر آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس کے سوال پر ثانیہ نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف حیرت
دیکھا تو اسے اپنے سوال کے بے تکے پن کا شدید احساس ہوا۔

"میرا مطلب ہے، تم جا کر نہا لو۔ یہ کام میں سنبھال لیتی ہوں۔" اس نے ثانیہ کو ایک طرف

ہٹایا تو وہ چپ چاپ کچن سے باہر آ گئی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس
عاطف کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے۔

"غضب خدا کا۔ وہ لوگ پہنچنے والے ہوں گے اور یہاں صاحبزادے کی نیند
ہو رہیں۔ ارے کوئی چائے پانی کا انتظام بھی کرنا ہے کہ نہیں۔ عاطف ......؟ ارے
اٹھ رہے ہو یا لگاؤں آ کر دو جوتے۔"

تایا ہر معاملے میں بہت جلد حواس باختہ ہو جایا کرتے تھے اب بھی یہی حال تھا۔
نکلی تو جینا آ چکی تھی اور اب پانی کا پائپ نل سے لگائے بیٹھک دھو رہی تھی۔ اسے د
سے مسکرائی اور شڑاپ شڑاپ جھاڑو لگانے لگی۔ روبی اس کے پیچھے ہی کمرے میں
ناقدانہ نظروں سے سرتاپا اسے دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے پلکنگ کی ضرورت نہیں۔ تمہارے آئی بروز کا شیپ ویسے بہ
ہے۔ بلیچ تم کرتی نہیں ہو۔ ہاں البتہ میرے کمرے سے نیل فائلر لے کر ناخن فائل ک
سے کوئی اچھی سی نیل پالش لے کر لگا لو۔ میں ذرا چائے کا بندوبست کر لوں۔" وہ سر
میں اسے ہدایت دے کر باہر نکل گئی۔ ثانیہ نے اس کے کمرے کے بجائے اپنی الماری
لیا اور آرام سے سارے ناخن تراش لیے۔

"لو باجی! بیٹھک تو میں نے خوب سنوار دی ہے۔ تازہ پھول لے کر آئی تھی د
گلدان میں سجا دیے ہیں۔" جینا گیلے پائنچے اڑستی اس کے کمرے میں آ گئی۔

"ماشاء اللہ! باجی مہندی کا رنگ تو خوب چڑھا ہے۔ لائیں میں آپ کے بال
اتنے تو لمبے ہیں، سوکھنے میں بھی تو وقت لگے گا۔ دس بجے تو آ جانا ہے انہوں نے۔" جینا
دی تو اس کی نظریں بے اختیار وال کلاک کی طرف اٹھ گئیں۔ صرف ایک گھنٹہ باقی
میں۔

اور پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کا دل انجانے خدشوں کے بوجھ سے لرز
کی سوئیوں کی ہر حرکت کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤ
جان سے ہو رہے تھے۔ جینا کام کی غرض سے آتے جاتے اسے دیکھتی تو اس کی حالت
مزہ لے لیتی۔

"ہائے باجی! آپ کے چہرے کا رنگ کیوں اڑتا جا رہا ہے؟ خیر کوئی بات نہیں ش
دن سب لڑکیوں کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔ گھبرائی گھبرائی، بوکھلائی ہوئی، پریشان س

ب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" جینا کی لن ترانیاں جاری تھیں جب روبی افراتفری میں اس کے
رے میں بھاگی چلی آئی۔

"وہ لگ آ گئے ہیں۔"

جینا یہ سنتے ہی فٹ سے باہر بھاگ گئی اور ثانیہ ایک ناقابل بیان سی کیفیت میں گھری رہ گئی۔
پاؤں میں سنسناہٹیں سی دوڑنے لگیں۔ اسے اپنے وجود میں ہلکی سی کپکپاہٹ اور لرزش کا احساس
ہا تھا۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر وہ خود پر قابو پانے لگی۔ نجانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔
ہی تائی اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

"مولوی صاحب آ رہے ہیں۔" بڑی سی چادر میں اس کے وجود کو چھپاتے ہوئے انہوں نے
ع دی تھی۔

ثانیہ کا دل ایک لمحے کے لیے پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا تھا اور رگوں میں خون کی گردش تیز
تھی۔

♦❖♦

کمرے کی آرائش و زیبائش سے قطعاً یہ تاثر نہیں مل رہا تھا کہ یہ کمرہ ایک نوبیاہتا دلہن کا ہے مگر
تمام تر سادگی کے باوجود ثانیہ کو یہ کمرہ کسی محل کے ایک پر آسائش گوشے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔
ر بچھا ہوا سبز قالین ایسا نرم اور دبیز تھا کہ جس پر چلتے ہوئے پاؤں کے تلوؤں میں گدگدی سی
ے لگتی تھی۔ بیڈ پر بچھی بے شکن چادر کی سرسراہٹیں کمرے کی مہیب خاموشی پر کتنی ہی نادیدہ
یں کندہ کر رہی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر لٹکتے بھاری پردوں نے کمرے کے اندرونی
ل کو بیرونی ماحول سے یکسر علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس پر اے سی کی نم آلود خنکی تھی جو اسے جاڑے کی
ر ٹھنڈک کی طرح کپکپائے دے رہی تھی۔

اور کیسی عجیب بات تھی کہ یہ پرسکون ماحول اسے کسی بھی طمانیت خیز احساس سے دوچار کرنے
بجائے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہا تھا۔ یونہی خالی خالی نظروں سے اطراف کا
لیتے ہوئے اس کی نگاہیں سامنے رکھے ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے پر جا رکی تھیں جہاں
ا اپنا ہی وجود تمام تر اجنبیت سمیت اس کے سامنے تھا۔ اس کے لیے اپنا آپ پہچاننا مشکل ہو
تھا اور ہوتا بھی کیوں ناں؟ اس کا تن تو ہمیشہ سے اس اترن پہننے کا عادی رہا تھا۔ ایسا لباس جسے
ا اصل مالک پہنتے پہنتے اکتا گیا ہو۔ بڑی فیاضی سے اس کے حوالے کر دیا جاتا تھا جبکہ آئینے میں
ر آ رہی تھی جس [illegible] تھی۔ جس کے ہاتھ میں سونے کی ایک انگوٹھی، گلے میں

سونے کا ہلکا سا لاکٹ، کانوں میں ننھے منے ٹاپس، ناک میں سونے کی کیل اور کلائیوں میں
ہر رنگ چوڑیاں جگمگا رہی تھیں۔

یہ سارا حلیہ اس کا تھا وہ جو ایک نئی نویلی دلہن تھی اور جسے اب سے کچھ دیر پہلے ا
رخصت کر کے لایا گیا تھا اور اس کی تو رخصتی بھی یوں ہوئی تھی کہ اسے اب تک خود پر تر
کسی چہرے پر خوشی مسکراہٹ بن کر اتری تھی نہ دل میں کوئی امنگ ابھری تھی۔

گھر کے آنگن میں نہ بارات رونق بن کر اتری نہ گوشت اور زردے کی دیگیں چڑھا
نہ شہنائی بجی نہ بینڈ باجے نے دھوم مچائی۔ بس چائے اور مٹھائی پر نکاح کی رسم ادا ہوگئی۔
رضا مندی کے طور پر نکاح کے کاغذات پر دستخط کر دیئے اور معاملہ ختم۔ ایک ادھیڑ عمر خا
نکاح کے بعد اس کے سر پر رسمی سا پیار دیا اور اسے ساتھ لے کر دہلیز سے باہر نکل آئی۔

وہ منتظر ہی رہی شاید تایا ابا باپ بن کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ شاید، شاید تائی ا
بن کر اسے اپنے سینے سے لگالیں اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ شاید روبی اس کی جدائی
سے سسکیاں بھرتے ہوئے اس سے لپٹ جائے۔ شاید عاطف ایک بھائی کی طرح سب
چھپے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے آنکھیں سرخ کر ڈالے۔

مگر وہاں ہر آنکھ خشک تھی۔ سب ہی ہونٹ خاموش تھے۔ ایک جینا تھی جو اس کی
وقت گھر کے نجانے کس کونے میں جا چھپی تھی۔ نہ کسی نے اس کے سر پر قرآن کا سایہ ک
سے ساعتیں لبریز ہوئیں۔ نہ اس کی آنکھوں نے نیر بہائے نہ الوداعی سسکیاں اس کے ل
آئیں۔ وہ اس گھر سے یوں رخصت ہوئی تھی جیسے کسی نومولود بچے کی میت بہت خامو
سے نکال دی جاتی ہے۔

"کیا ساری شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں؟" گاڑی کی عقبی سیٹ پر اسی ادھیڑ عمر
ساتھ بیٹھتے ہوئے اس کے دماغ میں کیڑا سا کلبلایا جسے اس نے خود ہی بے دردی سے مسل
نہیں۔ ایسی شادیاں تو صرف ان کی ہوتی ہیں جن کے سروں پر جنم دینے والو
ہو۔ جن کے تایا، تائی نہ سوتیلے ہوں اور نہ زمانے بھر کے حریص و کینہ پرور۔ ایسی شادیا
ان کی ہوتی ہیں جن کے نصیبوں پر سیاہ روشنائی سے جابجا ٹھپے لگا دیئے گئے ہوں۔
بے بسی، بے قدری، بدقسمتی اور کم مائیگی کے ٹھپے۔ ایسی پکی اور گاڑھی سیاہی ا
ہے کہ نصیبوں کا سیاہ رنگ گھلتا ہے نہ ماند پڑتا ہے۔

سارا راستہ اس کی نظریں بھاگتی دوڑتی سڑک پر جمی رہیں یا گول گول گھومتے آسما

ایک کے بعد ایک کیڑا کلبلاتا رہا۔ کچھ کو غسل دیا کچھ کو یونہی رہنے دیا۔ تب ہی گاڑی رک گئی۔
بیٹھی خاتون نے اس کے بازو کو ہلکا سا چھو کر اترنے کا اشارا کیا تو وہ چپ چاپ گاڑی کے
دروازے سے باہر آ گئی تھی۔ اس کے عقب میں ایک اور گاڑی آ کر رکی تھی۔ ٹھک ٹھک گاڑی
دروازے بند ہوئے۔ کوئی ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے پاس سے گزر کر راہداری کے کھلے
زے سے غائب ہو گیا تھا اور اپنی خوشبو اس کے آس پاس چھوڑ گیا۔ پیچھے چند اور لوگوں کے
وں اور باتوں کی ہلکی ہلکی آواز آتی رہی اور وہ خاتون اسے اپنی رہنمائی میں اس کمرے تک لا
خود نجانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔

اور اب کتنی ہی دیر سے وہ اس بھائیں بھائیں کرتے کمرے میں بیٹھی اپنے ہاتھ پر بکھری
وں کے جال میں الجھی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی ترتیب نہ تھی۔ ہر ایک لکیر دوسری لکیر کو کاٹتی چلی جا
تی۔ وہ گم صم سے انداز میں دونوں ہتھیلیاں سامنے پھیلائے ایک دوسرے سے موازنہ کرتی رہی
ال کلاک کی بہت نفیس سی "ٹک، ٹک" کو ساعتوں میں محفوظ کرتی رہی۔

کون ہوگا وہ......؟ اور کیا ہوگا......؟ ستر، اسی سالہ بوڑھا؟

دو تین بچوں کا باپ یا رنڈوا؟ ایک جھونپڑی سے اس عالیشان کوٹھی میں لایا گیا ہے مجھے، آخر
ا تو وجہ ہوگی؟ ایک بڑا سا کیڑا دوبارہ اس کے دماغ میں رینگنے لگا تھا۔ تب ہی دروازہ کھلا وہ بری
ح چونک گئی۔ نظر بے اختیار دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ وہی ادھیڑ عمر خاتون کمرے میں داخل ہو
تھیں۔ اسے جوں کا توں بیٹھے دیکھا تو بے اختیار ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

"ارے بیٹی! تم اتنی دیر سے اسی جگہ ٹکی ہوئی ہو۔ ٹھیک طرح سے بیٹھ جاؤ ناں۔ اب تو یہی
را گھر ہے۔ بڑھیا کی بھی عقل ماری گئی ہے۔ باورچی خانے میں کیا گئی تمہاری طرف پلٹ کر بھی
دیکھا۔" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگیں اور ساتھ ہی ڈریسنگ ٹیبل پر آڑی ترچھی چیزوں کو ترتیب
لگیں۔

"پوری فوج ہے نوکروں کی اس گھر میں۔ مگر مجال ہے جو کوئی کام وقت پر ہو جائے۔ گھر کے
د تو بس تین ہی ہیں۔ زارون اور ہارون میاں اور میں۔ ویسے تو میں بھی نوکر ہی ہوں۔ میاں جی
ل سے ملازمہ بنا کر ہی لائے تھے۔ ہارون کے دادا کی بات کر رہی ہوں میں۔" انہوں نے
کر میاں جی کے متعلق بتایا اور پھر پردے ہٹا کر کھڑکی کھول کر اس کے پاس آ بیٹھیں۔ کھڑکی
چھی لان کا منظر صاف دکھائی دینے لگا تھا۔

"ہارون اور زارون کو تو گودوں کھلایا ہے میں نے۔ ماں کی جگہ دے رکھی ہے انہوں نے۔

اب آگے تمہاری مرضی ہے ماں سمجھو یا ساس ...... میں تو تمہیں بیٹی بنا کر ہی رکھوں گی۔'' انہوں نے
بڑے پیار سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ یہ اجنبی مگر محبت بھرا لمس اس کی روح تک اتر گیا تھا۔
''ماشاء اللہ بہت پیاری ہو۔ اس گھر کی پہلی شادی ہے۔ جی تو چاہتا تھا دھوم دھڑکے سے
جاتے اور خوب بنا سنوار کر لاتے تمہیں یہاں مگر ہارون میاں نے منع کر دیا اور ان کی بات ہم
ٹالے۔ خیر تم فکر نہیں کرنا۔ کپڑا، زیور، لتا بہت ہے اس گھر میں، جیسے جی چاہے پہننا اوڑھنا
روک ٹوک نہیں ہوگی۔ اے لو میں تو باتوں میں ہی لگ گئی۔ کہنے تو یہ آئی تھی کہ کھانا میز پر لگ
گا تم بھی وہیں آجاؤ۔''

ثانیہ نے بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ وہ پہلے دن کی دلہن بھلا ڈائننگ ٹیبل پر جا کر
گی، مگر وہ تو بے نیازی سے اپنی بات کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہہ ڈالا۔

''ارے بھوک کیسے نہیں ہے؟ اب تو دھوپ بھی ڈھل رہی ہے گھر میں تو صرف ناشتہ ہو
گا ناں؟''

''نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو۔'' اس نے مرے مرے سے انداز میں بہانہ بنایا۔

''کہیں تم ڈائننگ ٹیبل پر جانے تو نہیں جھجک رہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو میں یہیں
ہوں۔''

انہوں نے بڑی اپنائیت سے کہا اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی باہر نکل گئیں۔
کے جانے کے بعد اس نے پہلی بار یہاں کھل کر سانس لیا تھا۔ ان کی بات چیت سے اس کی
قدرے دور ہو گئی تھی۔ اس لیے پہلے بیڈ پر ٹانگیں ذرا سیدھی کیں اور پھر نیچے اتر آئی۔

کمرے کی دائیں دیوار میں ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے
آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ یہ غالباً ڈریسنگ روم تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نظر
کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ دوسرا دروازہ غالباً باتھ روم کا تھا۔ تب ہی باتیں کرنے کی ہلکی آواز
اسے چونکا دیا جو بیرونی دروازہ کھلا ہونے کے باعث کمرے میں آ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں
ہوئے دروازے تک آ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے تک آئی اور گردن باہر نکال
ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ راہداری بالکل سنسان پڑی تھی۔ وہ دو قدم چل کر باہر نکل آئی۔ اس کے کمرے
کے عین سامنے ایک دروازہ کھلا تھا جو غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ اس سے پرے ڈائننگ روم کا منظر
صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس وقت دو ہی نفوس بیٹھے تھے۔ دونوں مرد تھے اور

بے حد خوبرو تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ یہ یقیناً زارون اور ہارون تھے۔ ''اور ان دونوں میں
ایک ''وہ'' ہے مگر کون؟'' اس نے آنکھیں پھیلا کر بڑے غور سے انہیں دیکھا گویا ان دونوں میں
سے کسی ایک چہرے پر اپنا نام پڑھنا چاہتی ہو۔ ایک ثانیہ کے بالکل سامنے بیٹھا تھا دوسرے کی
دائیں سائیڈ نظر آ رہی تھی۔ ثانیہ نے نوٹ کیا سامنے والا بے تحاشا اور بات بے بات مسکرا رہا
کھانا بھی کھا رہا تھا۔ دوسرا بس کبھی کبھار مسکرا دیتا تھا اور زیادہ توجہ کھانے کی طرف ہی تھی۔ وہ
سامنے والے کی نسبت خاصا سنجیدہ اور گم سم لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کا جائزہ لینے کے بعد
ان کی باتوں پر بھی کان دھرتی قریب ہی کہیں قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً سے پیشتر پلٹ کر
کمرے میں گھس گئی تھی۔

آنے والی اماں وزیراں ہی تھیں۔ پیچھے ایک ملازم کھانے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔ لمحوں
پر تکلف کھانا اس کے سامنے لگا کر وہ واپس چلی گئیں۔

''کیا میں اکیلی ہی کھاؤں گی؟'' دل میں ابھرتے سوال کو ہونٹوں پر لانے کی ہمت تھی نہ
تھی۔ سو وہ خاموشی سے ایک ایک لقمہ حلق سے نیچے اتارنے لگی۔ کھانے کے بعد اماں وزیراں
آرام کرنے کا کہہ کر چلی گئی تھیں۔

''معلوم نہیں ہی سب اتنا عجیب سا کیوں لگ رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ کچھ بھی معمول کے
مطابق نہیں ہو رہا۔'' نرم و گداز فوم پر کروٹیں بدلتے ہوئے اس نے سوچا تھا اور نہ جانے کب اس کی
آنکھ لگ گئی تھی۔

کسی غیر مانوس احساس کے تحت ثانیہ کی آنکھ کھلی تو ایک لمبے چوڑے وجود کو خود پر جھکے دیکھ کر
ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ فوری طور پر اسے یہ سمجھنے میں بھی دشواری پیش آئی تھی کہ وہ اس وقت کہاں
ہے جبکہ پاس کھڑا وہ شخص اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''تم مجھ سے ڈر گئیں؟ میں تو صرف تمہیں جگا رہا تھا۔'' جس استحقاق بھرے انداز میں وہ
سامنے کھڑا تھا اور اب اس سے مخاطب تھا۔ ثانیہ سمجھ گئی تھی کہ یہ زارون کے سوا اور کوئی نہیں ہو
سکتا۔ نکاح کے بعد کتنی ہی دیر تک اسے اس نام کی بازگشت سنائی دیتی رہی تھی۔ وہ ابھی بھی اس کے
اعصاب پر سوار تھا۔ ثانیہ نے بحال ہوتے حواسوں کے ساتھ سرہانے پڑا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھا اور اس کی
طرف سے قدرے رخ موڑ لیا۔ فوری طور پر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔
وہ آنکھیں بند کر کے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالنے میں لگ گئی۔ قیمتی مردانہ پرفیوم کی مہک اس
کے پاس منڈلاتے ہوئے اسے مزید بوکھلانے لگی تھی۔ زارون نہایت اطمینان سے چلتا ہوا

دیوار گیر الماری کی طرف بڑھ گیا تھا۔ الماری کھول کر اس میں سے کوئی چیز نکالنے کے بعد وہ
طرف پلٹا تھا۔

"چاکلیٹ کھاؤ گی؟"

ثانیہ کے لیے یہ پیشکش انتہائی غیر متوقع تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر ذرا کی ذرا
طرف دیکھا۔ وہ چوکلیٹ کا ریپر کھولتے ہوئے اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے فوراً نظر
لیں۔

"نہیں کھاؤ گی؟" اچھی بات ہے۔ اچھے بچے چاکلیٹ نہیں کھاتے۔ ویسے تو میں بھی
ہوں مگر کبھی کبھی گندا بچہ بن جاتا ہوں۔ چاکلیٹ کھانے کے لیے ناں۔" وہ چاکلیٹ کھانے
ثانیہ کو اس کے بچکانہ مذاق سے کوفت ہونے لگی تھی۔ یہ کوئی وقت تو نہ تھا ایسا مذاق کرنے کا۔

"اوہو...... میں نے تم سے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔" چاکلیٹ کھا کر اس نے ر
ہوا میں اچھالا اور دھم سے بیڈ پر آگرا۔ ثانیہ اپنی جگہ سمٹ سی گئی تھی۔

"ہیلو! مائی نیم از زارون۔" اس نے اپنا ہاتھ ثانیہ کے سامنے پھیلا دیا۔ ثانیہ نے
اسے دیکھا جو بڑی بے تکلفی سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ اس کی سرد ہوتی ہوئی پوریں خود بخود
ہتھیلیوں میں گڑ گئیں۔ جانے کیوں زارون کو دیکھ کر اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا
فی الحال وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

"تم دلہن ہو ناں......؟ میری دلہن......!"

ثانیہ نے اس بار بغور اسے دیکھا تھا جو کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہاتھوں کے پیالے
سجائے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس دیکھنے میں کوئی وارفتگی پنہاں نہیں تھی۔
سیاہ آنکھوں میں معصومیت اور سادگی تھی اور حد درجہ تھی۔

"میں بھائی ان کے پاس گیا تھا۔ کہنے لگے جاؤ اپنی دلہن کو کمپنی دو۔ ارے تم سوچ
ہو؟ ہاتھ بڑھاؤ ناں۔ میں تم سے دوستی کرنے آیا ہوں۔" اس نے خود ہی ثانیہ کا ہاتھ کھینچ
ہاتھوں میں لے لیا اور وہ جو ہکا بکا سی بیٹھی تھی ایک دم سٹپٹا گئی۔ فوری طور پر اپنا واپس کھینچ
جھٹ سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"یہ...... یہ تم نے ہاتھوں کو کلر کیسے کیا ہے؟ اور یہ تم نے کیا ڈال رکھا ہے ہاتھوں
اپنی آنکھوں میں بے پناہ اشتیاق سمیٹے اس کی کلائیوں میں پہنی کانچ کی چوڑیوں کو چھیڑنے
"اماں وزیراں نے تو کبھی ایسا کام نہیں کیا۔ میں نے اور بھائیان نے بھی کبھی

ہاں یہ اچھی لگ رہی ہیں۔ میں بھی اپنے ہاتھوں میں ڈالوں گا۔"
ن نے ایک دم خواہش ظاہر کی اور فوراً ہی اس کی کلائی سے چوڑیاں اتارنے لگا اور ثانیہ تو
پریشان و متعجب تھی کہ معمولی سی مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ بس دم بخود سی سانس روکے، پھٹی
ہوں سے بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ذہن اس لمحے کچھ سوچنے سے قاصر لگ رہا تھا۔
ہ لمبا چوڑا انتہائی خوبصورت نوجوان تھا مگر باتیں کرنے کا لہجہ و انداز...... اس کی حرکات
آٹھ دس سالہ بچہ ظاہر کر رہی تھیں۔

"کیا یہ کوئی مذاق ہے؟" اس نے نگاہوں میں اسے جانچا مگر وہاں مذاق کا کوئی شائبہ تک
بلکہ وہ تو انتہائی سنجیدگی سے چوڑیوں کو اپنے ہاتھوں میں چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا اور
یہ ممکن تو نہ تھا۔ ذرا سی زور آزمائی سے کتنی ہی چوڑیاں ٹوٹ کر بیڈ کی چادر پر بکھر گئی تھیں۔
نچ کا کوئی ننھا منا ٹکڑا بھی اس کے ہاتھ میں گھس گیا تھا اسی لیے وہ تڑپ کر ہاتھ جھٹکتا ہوا اپنی
اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ...... نو...... خون......" اس نے بے حد صدمے کے عالم میں اپنے ہاتھ پر ابھرتے خون
کے قطرے کو دیکھا اور جارحانہ تیوروں سے اسے گھورنے لگا۔

"تم...... تم بہت اسٹوپڈ دلہن ہو۔ ایڈیٹ۔ یہ دیکھو خون نکل آیا ہے میرے ہاتھ سے۔ اب
رے بھی خون نکال کر رہوں گا۔" اس نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑنی چاہی تو وہ فوراً ہی گھبرا
پے ہٹ گئی۔ چہرے کا رنگ یکدم ہی فق ہو گیا تھا۔

"چھوڑوں گا تو نہیں میں تمہیں۔" وہ اپنی پہلی کوشش میں ناکامی پر سخت جھنجھلا کر اس پر جھپٹا تھا
یہ کے ہاتھ پاؤں یوں بے دم ہوئے کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرک سکی تھی۔ اور اس
بزدلی و بے بسی سے فائدہ اٹھا کر زارون نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اگلے ہی لمحے ایک ہی وار
چوڑیاں توڑ ڈالیں۔

"اب مزہ آئے گا تمہیں۔" وہ بہت خوش ہوا تھا اپنی کامیابی پر اور ثانیہ کو اس بات میں کوئی
رہا تھا کہ وہ شخص ذہنی طور پر معذور تھا۔ اس یقین نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹیں سی
ی تھیں۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروایا اور بیڈ سے نیچے اتر
جبکہ زارون بڑے خوش باش انداز میں ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ ثانیہ دم بخود سی
اسے باہر جاتے دیکھ رہی تھی۔

"دھوکا......" کوئی بجلی سے گری تھی اور اس کے دل و دماغ اور پورے وجود کو راکھ کر گئی تھی۔

بہت بڑا دھوکا دیا گیا تھا اسے مگر دھوکے باز تھا کون؟

اس کے اپنے جنہیں وہ چھوڑ کر آئی تھی یا وہ جو اسے اپنا بنا کر یہاں لائے تھے۔ اس میں صحرا اگ آیا تھا اور حلق تک ریت بھر گئی تھی۔ سانس سینے میں گئی تھی تو وہیں کہیں اٹک تھی۔

"ہا...... ہا...... میں نے بھی دلہن کے خون نکال دیا۔" زارون باہر جا کر چکا تھا واقعی ہو گیا تھا...... اس کی آرزوؤں کا...... خوابوں کا...... خواہشوں کا......

اماں وزیراں زارون کی بات سن کر بوکھلا کر کمرے کی طرف بھاگیں اور کمرے ہوتے ہی اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں۔

"ارے بیٹی...... کیا ہوا یہ؟" وہ لپک کر اس تک آئیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگیں سے قطرہ قطرہ خون رس رہا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ فکر کی بات یہ تھی۔ ایک دم چپ چا حس و حرکت۔

"ثانیہ بیٹی......" انہوں نے دھیرے سے اس کا شانہ ہلایا تو وہ غائب دماغی سے ا گی۔

"نہیں...... یہ...... یہ نہیں ہو سکتا......" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

"وہ...... وہ پاگل ہے ناں......؟ اسی لیے میری شادی اس سے...... نہیں...... ایسا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔" وہ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے دیوار سے جا لگی تھی۔ اماں اس کی حالت دیکھ کر ایک دم گھبرا گئیں۔

"اے بیٹی! کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ارے ہا ہارون میاں......" انہوں نے ایک ساتھ کتنی ہی آوازیں دے ڈالیں۔

"کیا بات ہے اماں؟ اور کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

ہارون نے قدرے برہم لہجے میں دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھا مگر ثانیہ پر نظر وہ بری طرح چونک گئے تھے۔

سخت تشویش کے عالم میں وہ دو قدم آگے بڑھ آئے تھے۔

"کیا ہوا اسے؟" ثانیہ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اماں سے پوچھا تھا۔

"بہت برا ہوا ہے ہارون میاں! بہت برا۔ یہ بچی تو ہر بات سے بے خبر ہے۔ گھر وا اسے کچھ بتلائے بغیر ہی......" بوا کو اس معصوم پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا جواب تک عالم بے

ی تھی۔

ڈ......" یہ بات ہارون کے لیے بھی دکھ کا باعث تھی مگر فی الحال ثانیہ کی ظاہر حالت مزید کچھ سوچنے کا وقت نہیں دیا۔ ایسی صورت حال میں ثانیہ کا ردعمل اگرچہ شدید تھا مگر ہرگز نہیں۔ اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی یقیناً اسے ایسا ہی شاک پہنچتا۔

ھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے مگر ثانیہ جیسے ان کی آمد سے خبر تھی۔ اس کا رنگ دھلے لٹھے کی مانند خطرناک حد تک سفید ہو چکا تھا۔ آنکھیں حد درجہ ران تھیں۔

انیہ......!" اس کے نزدیک جا کر انہوں نے آہستگی سے پکارا مگر ثانیہ کا چہرہ بے تاثر ہی کا دوپٹہ اٹھایا اور آہستگی سے اس کے شانے پر ڈال دیا۔ تب اس کی ساکت پتلیوں میں اور پلکوں پر لرزش سی اتر آئی۔

انیہ......! تم ٹھیک تو ہو نا؟" انہوں نے اطمینان کرنا چاہا مگر وہ سختی سے ان کا ہاتھ جھٹک کر قدم دور ہٹ گئی تھی۔

...... یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے حواسوں سے باہر لگ

ھوکا ہوا ہے میرے ساتھ۔" وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔

آپ سب لوگوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ فریب دیا ہے مجھے۔"

ثانیہ! ایسی بات نہیں ہے۔" ہارون نے اسے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے موقع نہیں دیا۔

تم لوگوں نے میری غربت اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہروں گی۔" وہ ہسٹریائی انداز میں دروازے کی طرف بھاگی ہارون نے ایک لمحہ کی بھی دیر کیے بغیر اسے بازو سے پکڑ کر واپس گھسیٹا تھا اور اگلے ہی پل سے دروازے بند کر چکے تھے۔ دروازہ لاک کر کے وہ پلٹے تو ان کے چہرے پر برہمی کے ال تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ گھر کے ملازمین ثانیہ کو غیر حالت میں گھر سے باہر نکلتے

پلیز مجھے مت روکو۔ مجھے جانے دو۔ ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا یہاں۔" وہ چلائی تھی مگر اس میں ایک خوف تھا۔ سراسیمگی تھی جسے نوٹ کرتے ہوئے ہارون نے حتی الوسع اپنا لہجہ نرم کوشش کی تھی، لیکن اس کے باوجود انکے سپاٹ اور دوٹوک لہجے نے اسے بری طرح سہا دیا

تھا۔

"دیکھو ثانیہ! جیسا تم سمجھ رہی ہو، ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ تمہار
دھوکا ہوا ہے لیکن اگر کوئی دھوکے باز اور فریبی ہے تو وہ ہم نہیں تمہارے اپنے پیرنٹس ہیں
آل ریڈی یہ معلوم تھا کہ زارون ابنارمل ہے۔"

"وہ...... سب کچھ جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ......" اس کے پورے جسم پر لرز
ہو گیا تھا۔

"ہاں انہیں سب معلوم تھا۔ اور مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہے کہ انہوں
اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بہرحال میں ابھی انہیں یہاں بلاتا ہوں اور ان
پر ہی فیصلہ ہوگا کہ تم یہاں رہو گی یا نہیں۔ لیکن اس بات کا اطمینان رکھو کہ تمہارے ساتھ
زبردستی نہیں کی جائے گی۔ تمہیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔"

وہ تسلی آمیز لہجے میں کہہ رہے تھے مگر ثانیہ کچھ بھی سن نہ پائی تھی۔ دل سے اٹھتی آواز
اس قدر تھا کہ کان میں کوئی دوسری آواز سما نہ سکی تھی۔ وہ لڑکھڑا گئی تھی اور گرنے سے بچ
اس نے بے اختیار ہی کرسی کی پشت کو تھام لیا تھا۔

اور کتنا چاہا تھا اس نے کہ ہمیشہ کی طرح چپ چاپ، خاموشی سے، بڑی بہادری
بھی سہہ جائے مگر بہرحال تھی تو انسان ہی ناں۔ ایک کمزور ناتوان سی لڑکی۔ پہلا صدمہ ہی
دینے والا تھا اس پر یہ جان لیوا انکشاف کہ سب جانتے بوجھتے کیا گیا۔ وہ جو ساری عمر
موت دیتے رہے۔ تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونکی تو ان ہی ہاتھوں نے۔ بیس سال
اژدھے قطرہ قطرہ زہریلا ڈنک مارا تھا کہ اس کا سارا جسم نیل و نیل ہو گیا تھا۔

بہت کوشش کی تھی اس نے کہ نصیب کی سیاہی ذہن و دل پر حاوی نہ ہو مگر نجانے کیا
ہر کوشش بے کار ہوتی چلی گئی۔ سیاہ رات اسے اپنی آغوش میں لینے کو آگے بڑھی تو آنکھوں
چلی گئی اور وہ بھربھری مٹی کی طرح زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

اماں وزیراں نے لپک کر اسے سنبھالنا چاہا مگر اس نے سخت دیوانگی کے عالم میں
سے دور ہٹا دیا تھا۔ وہ زمین پر گری آسمان کی طرف بانہیں پھیلائے بری طرح چلا رہی تھی۔
دلدوز چیخوں نے گھر کے در و دیوار کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنکھ آنسو بہانے
تھی۔ وجود میں ایک طوفان برپا تھا جسے نکلنے کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔

وہ آج پہلی بار یتیمی کے دکھ سے آگاہ ہوئی تھی۔

آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے مرے ہوئے باپ کو پکارا تھا۔
آج ہی ان کی موت پر بین کیے تھے۔ آج ہی اس کا دل کرلایا تھا۔
اماں وزیراں نے اس کی حالت دیکھی تو دوپٹے میں منہ چھپا کر خود بھی سسک اٹھیں۔ ہارون
بیچ بس اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔



صدیوں سے بنجر آنکھ کی کوکھ سے پہلے سپنے نے جنم لیا تھا اور تعبیر کی آنکھ کھلنے سے پہلے مر گیا تھا
...... آنکھ کا خدائی پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔
تتلی کے بے حد رنگ پروں پر پہلی بار بہار اتری تھی مگر کڑی دھوپ کے لمس نے تتلی کے پر ہی
لے تھے۔
پتھریلی زمین سے اولین خواہشوں کی نوخیز فصل ابھری تھی جسے بارش کے زہریلے قطروں نے
ر رکھ دیا تھا۔
اور وہ...... اس سنگلاخ، بے آباد زمین کے کنارے کھڑی تھی۔
تہی داماں...... تہی دست
اور سوچ رہی تھی۔
"بعض لوگوں کی زندگی میں خوشی اور غم کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔"
ثانیہ کی زندگی میں بھی نہیں تھا۔ وہ خوشی کے لمس سے بھی نا آشنا تھی اور غم کو اس کی تمام تر
ائیوں سمیت کھوج آئی تھی۔ اس بے کراں سمندر کی سرکش موجوں نے دکھ کے بے پایاں
اس سے مالا مال کر کے اسے ساحل پر لا پھینکا تھا اور وہ اب وہ کتنی ہی دیر سے نیم جان، نڈھال
پڑی اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق تھی۔
اماں وزیراں نے اس وقت سے ایک لمحے کے لیے بھی اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کے
پاس بیٹھی مسلسل اس کا سر سہلا رہی تھی۔ بغیر کچھ کہے۔ ایک دبیز خاموشی تھی جس میں ان دونوں کی
بوجھل سانسوں کے سوا کوئی اور آواز نہیں تھی۔
تب ہی ڈرائنگ روم سے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینا شروع ہوئیں۔
"میرا خیال ہے تمہارے ابا آ گئے ہیں......" اماں وزیراں نے خیال ظاہر کیا۔
"میرا باپ مر چکا ہے......" اس کا لہجہ کسی بھی احساس سے عاری تھا۔
"مگر......"

"میری ماں بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔" اس نے اماں کو کچھ بولنے نہیں دیا تھا۔
"تو کیا یہ تمہارے ماں باپ......؟"
"کیا ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں؟" ثانیہ کے زہر خند لہجے پر اما
نے آنکھیں چرالی تھیں۔
"اگر کر سکتے تو آج میری جگہ روبی یہاں ہوتی۔"
"اچھا تم بیٹھو میں ذرا وہاں دیکھ آؤں۔ ہارون ناراضگی میں ان سے نجانے ک
دے۔" اماں کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا سو وہاں سے اٹھ جانے میں
سمجھی۔ ثانیہ ان کے جانے کے بعد چند لمحے چھت پر نظریں جمائے لیٹی رہی اور اس کے ب
ی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اب اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ا
کہیں یہ بھی ٹھان رکھی تھی کہ اب اپنے بارے میں فیصلہ وہ خود کرے گی۔
اس نے دوپٹہ کھینچ کر گلے میں ڈالا اور ننگے پاؤں چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ ڈرائنگ
دروازے تک آ کر اس کے قدم غیر ارادی طور پر سست پڑ گئے تھے۔ دروازے کا پردہ اٹھا کر
اندر جھانکا۔ ہارون صوفے کی بیک پر دونوں ہاتھ جمائے سخت و غصے میں لگ رہے تھے۔ تا
اڑی رنگت لیے سر جھکائے بیٹھے تھے۔
"کمال صاحب! آپ نے ثانیہ کو ہی نہیں مجھے بھی دھوکا دیا ہے۔ میں آپ پر یہ با
کر چکا تھا کہ زارون نارمل نہیں ہے اور اسے ایک بیوی سے زیادہ ایک کیئر ٹیکر کی ضرور
چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہ کر خوش دلی سے اس کی ضروریات نبھا سکے اور اس کے لیے
ایسی لڑکی کی ضرورت تھی جو نہ صرف تمام حقائق سے واقف ہو بلکہ تمام حالات کو بہادری
فیس کر سکے، لیکن آپ کمال صاحب! آپ نے محض آٹھ لاکھ روپے کے بدلے اس معصوم
عذاب میں دھکیل دیا ہے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ نے اسے اصل بات سے بے
اس پر کتنا ظلم کیا ہے۔" وہ سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ غصیلے لہجے میں بول رہے
کھڑی ثانیہ کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا تھا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے
اپنی پشت ٹکا دی تھی۔
"میں مانتا ہوں ہارون صاحب! کہ مجھ سے غلطی ہو گئی، لیکن آپ فکر مت کیجیے،
سمجھ دار ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا تو وہ......" تایا ابا دھیمی آواز میں منمنائے تھے۔
"ہونہار محترم! بات اگر صرف سمجھانے کی ہے تو میرا خیال ہے، یہ کام میں آپ

بات تو پھر وہیں آ جاتی ہے ناں کہ پہلے ثانیہ کا مائنڈ میک اپ کرو، اسے اس قابل
یکن بات تو پھر وہیں آ جاتی ہے کہ پہلے... بچے کو سنبھالنے لگے اور تب زارون کو اس کے حوالے کرو۔ یعنی میری
یں بائیس سالہ بچے کو سنبھالنے لگے اور تب زارون کو اس کے حوالے کرو۔ یعنی میری
ٹنشن میں تو صرف اضافہ ہی ہوا ناں؟ یو نو مسٹر کمال! کہ مجھ جیسا بزنس مین چوبیس گھنٹوں
شکل چار پانچ گھنٹے اپنے لیے نکال پاتا ہے۔ میں اگر زارون کی شادی کرنے پر آمادہ ہوا
اس واسطے کہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کی شادی ہو جائے تو اس کے ٹھیک ہو جانے کا
ہے۔ میں اسے وہ وقت، وہ توجہ نہیں دے پاتا تھا جو وہ ڈیزرو کرتا ہے۔ میں زارون کی
مطمئن ہو کر اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔ یکسو ہو کر اپنے کاروبار کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب ایک
مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ہم اسے اس گھر میں لے آئے ہیں اور اس کے باوجود آفس فائلوں
ھپاتے ہوئے میرا دھیان گھر میں اٹکا رہے تو آپ بتائیے کہ اس شادی سے ہمیں کیا فائدہ
ہوا؟
پرابلم تو وہیں کا وہیں ہے جسے حل کرنے کے لیے میں نے آٹھ لاکھ کی رقم ڈبوئی اور آپ نے
یتی جاگتی لڑکی کی زندگی برباد کر ڈالی۔" ہارون کے طیش کا تو یہ عالم تھا کہ تایا ابا کی تو گردن جھکی
تھی۔ اماں وزیراں نے بھی سانس روک لی تھی۔ ان کے دبنگ لہجے کے سامنے تو بڑے بڑوں
بان نکل جاتی تھی سو تایا ابا بھی چپکے بیٹھے تھے۔ ہارون چند لمحے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے خود پر
پاتے رہے پھر اماں وزیراں کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"اماں! آپ ثانیہ کو بلا لائیں۔ وہ ان کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"
صوفے پر بیٹھ کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگے تھے۔
"ہارون صاحب! آپ پریشان مت ہوں۔ میں نے کہا ناں، میں ثانیہ کو سمجھا دوں گا۔ وہ
پ کے لیے ہرگز مسئلہ نہیں بنے گی۔ بڑی سمجھ دار بچی ہے وہ۔"
تایا ابا اماں وزیراں کے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر...... گھگیائے تھے۔
ان کی بات پر ہارون نے بھنویں اچکا کر ایک لحظے کے لیے انہیں دیکھا اور پھر سر جھٹک کر
گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگے۔
"میرا خیال ہے، ثانیہ سے زیادہ آپ کو اس رقم کی فکر ہے۔ بے فکر رہیے میں دی ہوئی چیز
واپس نہیں لیا کرتا۔ یوں بھی میں نے وہ رقم آپ کی مالی امداد کے طور پر آپ کو دی تھی۔ ثانیہ کے
عوض نہیں، کیونکہ بقول آپ کے آپ ایک بے روزگار شخص ہیں اور آپ کے ناتواں کندھوں پر
ذے کا بے تحاشا بوجھ...... حالانکہ اب تو مجھے اس بات پر بھی شک ہے۔" ہارون کا طنزیہ لہجہ انہیں

پانی پانی کر گیا تھا۔ تب ہی اماں گھبرائی گھبرائی سی چلی آئیں۔

"ہارون میاں وہ......"

"کیا ہوا؟ ثانیہ نہیں آئی؟"

"وہ تو اپنے کمرے میں بند ہو گئی ہے۔ دروازہ ہی نہیں کھول رہی۔" اماں پریشان تھیں

"اسے کمال صاحب کی آمد کا علم ہے؟"

"جی ہاں اسے معلوم ہے۔"

"ہوں۔" انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر ثانیہ کے تایا کی طرف پلٹے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ جائیں۔ ثانیہ جو بھی فیصلہ کرے گی، ہم آپ کو آگاہ کر دیں گے واپس جانا چاہے گی تو میں خود اسے لے آؤں گا۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہہ کر گلاس رکھا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

تایا ابا نے گھبرائے گھبرائے سے انداز میں اماں وزیراں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھو ان کے لیے اتنا تنفر تھا کہ وہ گھبرا کر فوراً وہاں سے چل دیئے تھے۔



آفس سے واپسی پر گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد ہارون اپنے کمرے کی طر تو اماں وزیراں ستا ستا چہرہ لیے ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں۔ ان کا پہلا خیال حسب زارون کی طرف گیا تھا۔ سو بریف کیس رکھتے ہوئے سب سے پہلے اسی کے متعلق استفسار کیا

"وہ پچھلے لان میں ہے۔"

"اکیلا۔" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکے۔

"نہیں، دینو ہے اس کے پاس۔"

"کھانا کھا لیا اس نے؟" انہوں نے کوٹ اتار کر بیڈ پر رکھا اور بیڈ پر بیٹھ کر جوتے ا لگے۔

"نہیں دودھ پی لیا تھا۔ ویسے آج سارا دن وہ اپنے کمرے میں جانے کی ضد کرتا رہا۔ اماں لگے ہاتھوں اپنے مطلوبہ موضوع کی طرف آئیں۔

"تو......؟" انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر استفہامیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"دروازہ تو اندر سے بند ہے میاں۔ ثانیہ نے......"

"واٹ...... کیا وہ ابھی تک کمرے سے باہر نہیں آئی۔" وہ شدید حیرت کے زیر اثر ا

ڑے ہوئے تھے۔

ر بریک فاسٹ...... لنچ......؟" اماں کا سر نفی میں ہلتے دیکھ کر ان کی تشویش میں اضافہ ہوا

چھ بھی نہیں میاں! کل سے جوں کی توں کمرے میں بند ہے۔ میں تو صبح سے دروازہ بجا گئی۔"

کمال ہے۔ اگر ایسی بات تھی تو آپ کو میرے آفس فون کر دینا چاہیے تھا۔" وہ ایک دم ے گئے۔

حد ہو گئی یعنی کہ...... شام بھی ڈھلنے کو ہے اور وہ کل رات سے......" وہ منہ ہی منہ میں ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھے اور دراز کھول کر اس میں سے چابیوں کا ایک گچھا یک چابی نکالی اور دراز بند کر کے اماں کی طرف پلٹے۔

یہ لیں چابی اور باہر سے دروازہ کھول لیں۔ دیکھیں جا کر اس کو کہیں کچھ کر کرا نہ بیٹھی ہو۔"

نے چابی اماں کے ہاتھ میں تھمائی اور خود سلیپروں کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔ اماں سلیپر نکال کر ان کے سامنے رکھے اور خود باہر کی طرف لپکیں۔

کپکپاتے ہاتھوں سے لاک کھولا اور ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا یہ دونوں ہاتھ سینے پر دھرے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اماں نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور چاک کمرے کی ساری لائٹس آن کر دیں۔ کمرہ سفید دودھیا روشنی میں نہا سا گیا تھا۔ ثانیہ ی سے بچنے کے لیے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

اسے صحیح سلامت دیکھ کر اماں وزیراں نے دل ہی دل میں خدا کا ہزاروں بار شکر ادا کر ڈالا۔

"ثانیہ! تم ٹھیک تو ہو ناں؟" اماں نے اس کا بازو آنکھوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے زاحمت نہ کی تھی۔

"ٹھیک ہوں اماں! مجھے کیا ہونا تھا؟" اس نے اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

"تم نے...... تم نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بہت ڈھیٹ ہوں اماں اور میری ڈھٹائی کا اندازہ اسی بات لگائیں کہ اتنی بڑی بات ہو گزری مگر میرا نروس بریک ڈاؤن ہوا' نہ دل نے دھڑکنا چھوڑا۔ میں بھی ویسی کی ویسی ہوں۔ ایک دم فٹ فاٹ۔"

اب اس نے آنکھیں کھول کر چھت پر جما دی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر پھیلی زہر خندی سی

مسکراہٹ دیکھ کر اماں کو خوف سا محسوس ہوا تھا۔

"تم فکر کیوں کرتی ہو...... سب۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں ...... مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے کر
بازوؤں میں چہرہ چھپا لیا تھا۔

"مگر...... مگر مجھے کچھ وقت چاہیے۔ زیادہ نہیں۔ صرف آج کی رات مجھے خود کو
دیں پھر اس کے بعد کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

"لیکن بیٹی۔"

"آپ جائیں اماں اور لائٹ بھی بند کر دیں۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"مگر ...... میں بھی تمہارے ساتھ رات یہیں گزاروں گی۔" اماں کو ڈر تھا کہیں وہ
اٹھالے اور ثانیہ بھی جیسے ان کے خدشات جان کر پھیکی سی ہنسی ہنس دی تھی۔

"کن خدشوں میں پڑی ہو اماں ......! میں بہت بزدل ہوں، خود کو تکلیف نہیں د
ایسی ہی بہادر ہوتی تو ان بیس سالوں میں کئی بار اپنی شہ رگ کاٹ چکی ہوتی یا پھندا ڈال کر

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹی! خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" اماں کا تو دل ہی
اور وہ کیسے اطمینان سے کہے جا رہی تھی۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کچ
سے روک دیا۔

"ارے میں نے تو تجھے دیکھتے ہی اپنی بیٹی بنا لیا تھا اور تو کیسی بیٹی ہے کہ اپنے ہاتھوں
کا کلیجہ نوچے جا رہی ہے۔ تجھے میری قسم جواب تو نے ایسا کچھ کہا۔" اماں وزیراں کی آو
کھل گئی تھی۔

ثانیہ نے سر اٹھا کر گہری نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر طویل سانس لے کر اثبا
ہلاتے ہوئے گویا ان کی بات مان لی تھی۔

"اچھا...... میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔" انہوں نے اسے ڈھیلا پڑتے دیکھا تو فوراً
ہوئیں۔

"اماں! ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بھوک لگی تو خود اٹھ کر آپ سے مانگ لوں گی۔"
دوٹوک انکار پر اماں نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر سر جھکا کر کمرے
گئیں اور کمرہ ایک مرتبہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔



ہارون آفس جا چکے تھے اور زارون ایک مرتبہ پھر دروازے پر کھڑا ہنگامہ مچا رہا تھا۔

"یہ بہت اسٹوپڈ دلہن ہے۔ اسے نکالو میرے کمرے سے باہر۔" وہ دروازہ پیٹتے ہوئے بری
ح چلا رہا تھا۔

"زارون میاں ...... کیا ہوا؟" اماں وزیراں کچن سے بھاگی آئی تھیں۔

"وہ...... وہ اندر میری ساری چیزیں خراب کر دے گی۔ میرے کھلونے، مجھے چاہئیں۔ تم باہر
داس ایڈیٹ کو۔" وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔

"بیٹا......! آپ ٹھہرو تو سہی میں......" اس سے پہلے کہ وہ زارون کو کچھ سمجھاتیں اندر سے
ازے کی چٹخنی گرانے کی آواز آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

"تم...... تم اندر کیا کر رہی تھیں ہاں۔ یہ کمرہ تمہارا ہے کیا؟" زارون نے ثانیہ کو دیکھتے ہی
ے بڑھ کر زور سے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا سی گئی۔

"اگر آئندہ...... آئندہ تم میرے کمرے میں گھسیں تو...... تو میں تمہیں یہ ماروں گا۔" اس نے
ل کا بڑا گلدان ہاتھوں میں لیا تو اماں وزیراں فوراً اس کے سامنے آ گئیں۔

"ارے...... ارے لو بیٹا! یہ مجھے دے دو۔ اس سے چوٹ لگ جائے گی۔ میں...... میں اسے
ٹھا دوں گی۔ اب یہ تمہارے کمرے میں نہیں آئے گی۔" اماں نے فوراً اسے بہلا پھسلا کر گلدان
ے ہاتھوں سے لے لیا تھا ورنہ اس کچھ بعید نہیں تھا کہ کسی کا سر ہی پھوڑ دیتا۔

"آؤ ثانیہ! تم میرے ساتھ آؤ۔" انہوں نے پلٹ کر ثانیہ سے کہا جو بے تاثر چہرہ لیے بکھرے
الوں کو کانوں کے پیچھے چل دی تھی۔ وہ پہلی بار اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ ڈسٹنگ کرتی ہوئی
زمہ نے بڑے اشتیاق سے اسے دیکھ کر سلام جھاڑا تھا۔

"سلام باجی......!" اور ثانیہ کو بے اختیار جینا کی یاد آ گئی تھی۔

"ثانیہ! ناشتے میں کیا لو گی۔" کچن میں داخل ہوتے ہی اماں نے اس سے پوچھا۔ مگر وہ اپنی
ا سوچوں میں گم رہی۔ اماں نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر خود ہی اس کے لیے ناشتہ بنانے لگیں۔
ب تک اماں کام میں مصروف رہیں ثانیہ کرسی پر بیٹھی کچن کی ٹیبل پر انگلی سے نادیدہ لکیریں کھینچتی
ہی۔

"لو بیٹی! شروع کرو۔" اماں نے چائے کے ساتھ اور بہت سی چیزیں اس کے سامنے میز پر
رکھ دی تھیں۔ اس نے ابھی چائے کا پہلا گھونٹ بھرا تھا جب زارون وہاں چلا آیا۔ عجیب بے ترتیب
ا حلیہ ہو رہا تھا اس کا۔ شرٹ ٹراؤزر سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ کھلے کف ہاتھوں پر لٹک رہے تھے۔

گریبان کے دو بٹن کھلے تھے اور گلے میں جھولتی سونے کی چین اس نے سامنے سے اٹھا
ڈال رکھی تھی۔

"اماں......" اس نے آتے ہی ادھر ادھر دیکھے بغیر انہیں پکارا۔

"جی زارون میاں۔"

"اماں! میں کیا کروں؟"

"کیوں کیا ہوا؟" اماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں...... میں کیا کروں...... تم...... تم آؤ...... میرے ساتھ کھیلو۔" وہ اپنی بے پناہ
سے سخت نالاں لگ رہا تھا۔

"ارے بیٹا! اب مجھے تو بخشو تم۔ ثانیہ آ گئی ہے ناں۔ اب اس کے ساتھ کھیلا کرو تم۔"

"کون ثانیہ؟" وہ بے تکلفی سے میز پر سوار ہو کر بسکٹ اٹھا کر کترانے لگا تھا۔

"تمہاری دلہن کی بات کر رہی ہوں۔ اس کا نام ثانیہ ہے ناں۔" اماں کے تعارف کر
اس نے ایک لمحہ بغور اسے دیکھا اور اگلے ہی پل میز سے اتر کر دھم سے اس کے برابر کر
گیا۔ ثانیہ ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ زارون اس کی گھبراہٹ پر بے ہنگم طریقے
دیا تھا۔

"ثانیہ! بیٹھو تم۔ کچھ نہیں کہے گا تمہیں۔ یہ تو بہت معصوم ہے۔" اماں نے کہا تو درمیا
ایک کرسی چھوڑ کر وہ اگلی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ اب یہاں رہے گی۔؟" اس نے اماں سے سوال کرنا شروع کر دیئے۔

"ہاں۔"

"سارے دن ہمارے پاس رہے گی؟"

"ہاں۔ ہمیشہ یہاں رہے گی۔"

"یہ میرے ساتھ فائٹ تو نہیں کرے گی ناں؟"

"ارے بابا نہیں کرے گی۔ یہ تو بہت اچھی ہے۔" اماں عادی ہو چکی تھیں سو مستقل م
سے اس کے سوالوں کا جواب دیئے جا رہی تھیں۔

"اچھی تو نہیں ہے۔ کل سے میرے کمرے میں گھسی بیٹھی تھی۔ مجھے اس نے اندر نہیں جا
دیا۔"

اس نے بھرپور شکایتی لہجے میں کہتے ہوئے ثانیہ کو گھورا۔

دہیئ اب ثانیہ کا بھی وہی کمرہ ہے۔ کیونکہ تمہاری دلہن ہے اس لیے تمہارے کمرے میں
؟" اماں نے اسے سمجھایا اور ثانیہ نے غیر ارادی طور پر اپنا ہونٹ کاٹ کاٹ کر سرخ کر ڈالا

میری دلہن ہے۔ جیسے پنک پینتھر اور ڈیزی میرے ہیں، ویسے ہی؟" اس نے اپنے
کے نام لیے جن سے وہ دن رات کھیلتا تھا اور ثانیہ کو نجانے کیا ہوا، کپ اس کے ہاتھ سے
تھا اور وہ خود بھاگتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی تھی۔

ثانیہ!" اماں اسے پکارتی ہوئی اس کے پیچھے لپکیں۔ وہ کوریڈور میں دیوار سے لگی کھڑی تھی
ہاتھ منہ پر رکھے سسکیاں روکتے ہوئے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

ثانیہ! میری جان کیا ہو گیا؟" انہوں نے فوراً اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

اماں! بہت مشکل ہے، بہت مشکل ہے یہ سب سہنا۔" وہ ایک بار پھر بری طرح بکھر گئی تھی۔

ولاسا کیا دیتیں بس چپ چاپ اس کے بال سنوارتی اور پیٹھ سہلاتی خاموش کرواتی

ب کہ ان کے عقب میں کھڑا زارون حیران حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تاسف
رہا تھا۔

یہ تو ہر وقت روتی رہتی ہے۔ میری اور اس کی فرینڈ شپ نہیں ہو سکتی۔" وہ برا سا منہ بناتے
رہا تھا۔



گی بہت خوبصورت تو پہلے بھی نہ تھی، مگر اس بار جو اس نے اپنے چہرے سے نقاب الٹا تھا
کی کریہہ صورت دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ خود اذیتی کا عمل اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا ثانیہ نے
۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ تقدیر کے اس وار کو بھی سہہ جائے گی۔

خود کو مار کر زندہ رکھنا آسان ہوتا ہے کیا؟

ود پر جبر کر بھی لیتی، مگر اس احساس کا کیا کرتی جو شادی کے نام پر اس کے کنوارے
ں ہلچل مچا گیا تھا۔

ہو کی مضبوط شانے پر سر رکھ کر ٹوٹ کر رو دینے کی معصوم سی خواہش دل میں جاگی تھی اسے
یے سلا دیتی۔

اماں وزیراں نے اس سے کہا تھا۔

"وہ معصوم ہے' سادہ ہے' اللہ لوک ہے۔ تم اسے اپنی توجہ اور محبت دوگی تو وہ تمہ
بڑھ کر چاہے گا۔"

"مگر کیسے؟ یہ دل اس کی طرف مائل ہو اسے اپنا سمجھے تب ناں؟"

اس نے بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے اپنا سر کھڑکی کے ٹکا دیا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ کھڑکی کے اس پار پوری کائنات گھور اندھیرے میں ڈوبی طویل قامت درخت' پھول' بوٹے' پتے' ہر چیز غیر معمولی طور پر سنسان اور گمبھیر چپ تھے۔ سبک خرام ہوا قدرے ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر کھڑکی کے بند کردیئے اور پھر پلٹ کر زارون کو دیکھنے لگی جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کی وادیوں تھا۔

نائٹ بلب کی نہایت مدھم روشنی میں زارون کے ساحرانہ نقوش سے نظر ہٹانا اس ایسا آسان نہ تھا۔ وہ بلاشبہ ایک انتہائی خوبصورت اور حسین نوجوان تھا۔ ہاں اس کے چہر ہوئی حد درجہ معصومیت ہی تھی جو دیکھنے پوری طرح بند نہ تھیں۔ وقفے وقفے سے ہلتے ہو اس بات کی علامت تھے کہ اسے نیند میں بڑبڑانے کی عادت بھی تھی۔ اس کے حلق سے آوازیں ثانیہ کو رات کی اس تنہائی میں بری طرح خوفزدہ کردیتی تھیں۔

لیکن کیا کرتی...... اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود پر ظلم ڈھا آٹھ لاکھ روپوں کا حق ادا کرتی جو اس کے بدلے اس کے تایا کو ادا کیے گئے تھے۔

تب ہی ایک دم زارون سوتے سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ثانیہ سہمی سہمی نگاہوں سے ا لگی۔ اس نے یونہی بڑبڑاتے ہوئے خمار آلود نظریں ادھر ادھر دوڑائیں اور پھر ثانیہ کو عجیب بے تاثر اور خالی خالی نظریں تھیں اس کی۔ وہ یقیناً اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ اس سکنات سے لگ رہا تھا کہ اس پر ابھی تک نیند کا غلبہ ہے۔ کچھ دیر تک وہ یونہی ٹکٹکی باند دیکھتا رہا۔ ثانیہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر زارون کی بوجھل پلکیں مندنے ہونے وہ دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا اور چند لمحوں بعد اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی اپنا رکا ہوا سانس خارج کیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ تک آئی۔ ایک خالی نظر زارون پھر بیڈ کے کنارے پر سمٹ کر لیٹ گئی رات تو بہرطور بسر کرنی ہی تھی۔



وہ اماں وزیراں کی تلاش میں ہارون کے کمرے کی طرف آئی تو کھلے دروازے

ہارون آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا اور اماں وزیراں خفگی آمیز اپنائیت سے ان کے سر بول رہی تھیں۔

"نہ دوپہر کا کھانا' نہ رات کا۔ میاں! کیا ہوا کھا کر زندہ رہتے ہو۔"

"اماں! دفتر میں......"

"تو کیا ملتا ہوگا دفتر میں۔ مجھے تو لگتا ہے سارا دن چائے پی پی کر گزارہ کرتے ہو۔ رنگ بھی تو سنولا گیا ہے۔ پہلے تو ماشاء اللہ نظر نہ ٹکتی تھی چہرے پر۔"

"تو اب کیا پھٹکار برستی ہے چہرے پر۔" ہارون جوتا پہن کر ہاتھ دھونے واش روم میں گھس

"اے لو! خدا نہ کرے۔ پھٹکار کیوں برسنے لگی۔ میں تو بس اتنا کہتی ہوں کہ کاروبار تو سب کا چلتا ہے اور چلتا ہی رہتا ہے۔ پھر ایسا بھی کیا کہ بندہ کھانے پینے کا ہوش ہی بھلا دے۔ کم صحت' اپنے آرام کا خیال تو رکھنا چاہیے نا انسان کو۔"

"بالکل ٹھیک فرما رہی ہیں آپ۔" واش روم سے باہر نکل کر وہ آئینے کے سامنے آ کھڑے اور ڈھیر ساری پرفیوم خود پر انڈیلی۔

"تو پھر دوپہر کے کھانے پر گھر آرہے ہونا؟" اماں نے بڑی امید سے پوچھا۔

"یہ میں نے کب کہا؟" ان کے ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"اے لو! تو میں جو گھنٹے بھر سے بول رہی ہوں وہ سب بے کار گیا۔" اماں ایک دم ہی بگڑ گئی

"میں نے یہ بھی کہا؟" وہ کبھی کبھار ہی ایسے موڈ میں نظر آتے تھے۔ اماں وزیراں گہری لے کر رہ گئیں۔

"ہارون میاں! مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ سیدھے سیدھے بس اتنا بتا دو کہ دوپہر کو کھانے پر گے کہ نہیں؟"

"آپ تو ناراض ہونے لگیں۔" انہوں نے والٹ چیک کر کے جیب میں رکھا اور موبائل تے ہوئے ان کی طرف پلٹے۔

"ایسا ہے اماں کہ دوپہر میں آنا بہت مشکل ہے۔ ڈنر البتہ میں گھر میں کرسکتا ہوں۔"

"سوچ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ بڑھیا سارا دن کچن میں سر کھپائے اور رات کو بیٹھی کی بیٹھی رہ

''نہیں میں آجاؤں گا۔'' انہوں نے اماں کو تسلی دی۔

ہارون کو باہر نکلنے کے لئے تیار دیکھ کر ثانیہ وہاں سے ہٹ کر لاؤنج میں آ گئی
ملازم نے آکر ہارون کو کسی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اور آنے والے کا نام سن کر ثانیہ ا
میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہارون نے ایک نظر اسے
ملازم کی طرف پلٹے۔

''کمال صاحب کو یہیں لے آؤ۔'' ثانیہ نے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے ایک
سوچا اور پھر قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیئے۔

''ثانیہ!''

ہارون کی آواز پر وہ رکی ضرور تھی مگر پلٹی نہیں تھی۔

''کمال صاحب آئے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' اس کے سپاٹ لہجے پر ہارون نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''وہ تم سے ملنے آئے ہیں۔'' ہارون نے جیسے اسے اطلاع دی تھی۔

''لیکن میں ان سے ملنا نہیں چاہتی۔''

''مگر کیوں؟'' ان کے لہجے میں پوچھتے وقت حیرت آئی تھی۔

''ہارون صاحب! دکاندار اپنے شوکیس میں سجی کوئی چیز فروخت کر ڈالے تو پھ
اس کا کوئی تعلق رہتا اور نہ واسطہ۔ کمال صاحب آپ سے میری قیمت وصول کر چکے ہیں
کس رشتے' کس ناتے سے مجھ سے ملنے آئے ہیں۔'' ثانیہ کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھ
تھی۔ ہارون اپنی جگہ دم بخود سا کھڑے رہ گئے تھے۔

''میں نے تاعمر اس گھر میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے ہارون صاحب۔ اس لیے ن
پاس کوئی جائے پناہ نہیں رہی۔ اس لیے کہ آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔
انمول کر دیا ہے، آپ لوگوں نے۔ اتنی بڑی قیمت ادا کر دی میری اپنی نہ سہی دوسروں
تو معتبر ہو گئی ناں میں۔ مجھ جیسی کم مایہ کو تو اونے پونے داموں میں خریدا جا سکتا تھا مگر
آپ واقعی بہت سخی ہیں ہارون صاحب۔ آپ نے تو واقعی بہت سخی ہیں ہارون صاحب
واقعی مجھے خرید لیا ہے۔''

''ثانیہ!'' وہ گڑبڑا سے گئے۔ ثانیہ کی باتوں نے ان کا قد ان ہی کی نظروں میں

''اب ایک مہربانی اور کیجئے۔ اگر آپ نے اس شخص کو مزید دینے دلانے کا وعدہ

یہاں آنے سے منع کر دیجئے۔'' اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو سختی سے رگڑ ڈالا۔

''لیکن ثانیہ! میں انہیں تم سے ملنے سے کیسے منع کر سکتا ہوں آخر وہ تمہارے......''

''وہ میرے کچھ نہیں لگتے اور انہیں مجھ سے ملنے سے آپ منع نہیں کر رہے، میں نے خود ان کا
ہے۔ اگر آپ اپنے طور پر ان سے میل جول رکھنا چاہیں تو بصد شوق مگر خدارا مجھے ان سے
پر مجبور مت کیجئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ مزید وہاں نہ رک سکی تھی۔

ہارون لب بھینچے اسے وہاں سے جاتے دیکھتے رہے۔

''اماں! کمال صاحب سے کہلوا دیجئے کہ ثانیہ ان سے ملنا نہیں چاہتی اور...... وہ آئندہ
ں آنے کی زحمت نہ کریں۔'' انہوں نے اماں سے کہا اور خود وہیں صوفے پر گرنے کے سے
از میں بیٹھ گئے۔ ان کی سوچ پر بڑی کاری ضرب لگی تھی۔



''ثانیہ!'' وہ کتنی ہی دیر سے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ ٹکائے
ڑی تھی جب زارون بے تکلفی سے اسے پکارتا کمرے میں آ گیا۔

''ثانیہ!'' اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا وہ اس کے نزدیک کھڑا تھا اور غالباً اس کے متوجہ ہونے
انتظار میں تھا۔ سو اس سے نگاہ ملتے ہی بول اٹھا۔

''چلو کھانا کھائیں۔'' وہ بڑی آمادگی کے ساتھ اسے بلا رہا تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ خود بخود روکھا سا ہو گیا تھا۔

''نہیں، تم چلو میرے ساتھ۔''

ثانیہ نے ایک سپاٹ سی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر رخ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''بھائیان بھی ہیں وہاں...... کھانے پر...... تم بھی آؤ......'' وہ اپنے مخصوص اٹکے اٹکے انداز
بات کر رہا تھا۔

''ثانیہ! سنتی نہیں ہو۔'' اس نے اس کے دوپٹے کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ جھنجھلا گئی۔

''زارون! مجھے بھوک نہیں لگی۔ تم جا کر کھانا کھا لو۔'' اس نے چبا چبا کر کہا۔ مگر وہ زارون اپنی
ے سے مس نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھ بوجھ سے عاری ایک معصوم انسان تھا۔ ثانیہ کی جھنجھلاہٹ،
ریز یا نفرت کو سمجھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ تو ثانیہ کو ہمہ وقت اس گھر میں موجود دیکھ کر اس
ماؤس ہو چلا تھا۔ مگر ثانیہ کے لیے فوری طور پر سمجھوتا کرنا ممکن نہیں تھا۔
وحتی الامکان کوشش کرتی تھی کہ زارون کی ضروریات کا خیال رکھے۔ سو اس کے کپڑے تیار

رکھنا، اس کے لیے کوئی غذا تیار کروانے کا کام وہ کرلیتی تھی مگر زارون کی جذباتی تسکین وہ نہ
تھی۔ اس لیے اکثر اوقات چڑ جاتی تھی۔ یہ اماں وزیراں ہی تھیں جو ایک بچے کی سطح پر آ
پٹانگ حرکتیں کرتے ہوئے اس کا دل بہلائے رکھتی تھیں یا وہ ملازم تھے جو چوبیس گھنٹے
زارون کے گرد گھومتے رہتے تھے۔

"ثانیہ! چلونا۔" زارون دل کی بات پوری کیے بنا چین نہیں لیتا تھا سو اب بھی اس
پر سوار تھا۔

"اوہ خدایا۔" اس نے بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ ڈالے۔

"ٹھیک ہے تم چلو میں آ رہی ہوں۔" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے دھیمی آواز میں ب
خیال یہی تھا کہ اسے ٹال دے گی مگر زارون اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچنے لگا تھا۔ مجبوراً ا
سے اٹھنا ہی پڑا تھا۔

ہارون نے واش بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے دیکھا، زارون خوشی خوشی ثانیہ کا ہاتھ پکڑ
میز پر لا رہا تھا جبکہ ثانیہ کے چہرے پر کوفت و بیزاری کے تاثرات نمایاں تھے۔ انہوں نے
ٹوکنے کا ارادہ کیا مگر پھر خاموش ہو رہے۔

"شاید اسی طرح زارون ثانیہ کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔" ا
صابن ہاتھوں پر رگڑتے ہوئے پل بھر کے لیے سوچا تھا۔

"آ جائیے ہارون میاں!" مختلف ڈشز ڈائننگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اماں نے
تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ٹیبل تک آ گئے۔ کھانے کے دوران وہ ان الفاظ اور
ترتیب دیتے رہے جو ثانیہ کو حقیقت حال سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تسلی و تشفی
کر دیتے۔ وہ اسے بتانا چاہ رہے تھے کہ کمال احمد کو وہ رقم بطور قرض انہوں نے اس وقت
جبکہ ان کے ذہن میں زارون کی شادی کا خیال تک نہیں تھا اور وہ بھی صرف اس وجہ سے
کے پرانے خدمت گزاروں میں سے تھے۔

لیکن جب زارون کی شادی کے بارے میں ڈاکٹروں نے کہا تو انہوں نے اکا دکا لو
مشورہ کیا تو بات کسی طرح کمال احمد تک بھی جا پہنچی اور وہ اگلے ہی روز اس کے آفس میں
ہوئے۔

"میری ایک بچی بے حد نیک، سمجھ دار اور نہایت خدمت گزار ہے۔ اور پھر یہ تو نیکی
کا کام ہے۔ وہ زارون میاں کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی۔"

"ٹھیک ہے کمال صاحب! مگر اس بات کا خیال رہے کہ لڑکی نہ صرف میچور بلکہ تمام صورتحال
خبر بھی ہونی چاہیے تاکہ وہ کام...... خوش اسلوبی سے نبھا سکے۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ آپ
وں کے ساتھ اپنی بچی کی مرضی بھی معلوم کر لیں۔"

"ایسا ہی ہوگا صاحب! مگر ایک اور بات بھی ہے۔"

"وہ کون سی؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا اور جواباً انہوں نے بغیر کسی جھجک اور ہچکچاہٹ
بات انہیں بتا دی تھی جس میں انہوں نے واضح طور پر ان سے کہہ دیا تھا کہ ایسی صورت میں
نہوں نے بطور قرض لی ہے وہ واپس نہ لی جائے۔

"تو گویا آپ اپنی بیٹی کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔" وہ یکدم بگڑ گئے تھے۔

"ایسی بات نہیں۔ ابھی کچھ ماہ پہلے میں نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کی ہے جو اسٹور میں چلاتا
وہاں سے بھی آمدنی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اب اتنی جلدی دوسری بیٹی کی شادی......
ھ رہے ہیں نا......؟ میرا مطلب ہے رشتے داری میں تو......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ
اور وہ طویل سانس لے کر رہ گئے۔

دل میں بس یہ ہی سوچا تھا کہ وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی ایک ابنارمل شخص سے بیاہنے کو تیار ہیں
ان کا لگا بھائی ہے تو انہیں بھی ان کی مجبوری کا کچھ خیال کرنا چاہیے۔ سو اس نے اثبات میں سر
نہ صرف ان کا مطالبہ تسلیم کیا تھا بلکہ کچھ رقم شادی کی تیاری کے لیے بھی دی تھی۔

اور اب یہ ہی بات وہ ثانیہ کے سامنے کھول کے رکھ دینا چاہتے تھے۔ اس نے ہمیشہ اس گھر
ہا تھا تو ضروری تھا کہ اپنے دل سے تمام کدورتیں نکال کر وہ اس گھر میں اپنے اصل مقام کو
لے۔ یہ ہی سوچتے ہوئے انہوں نے پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے سامنے رکھا اور ثانیہ کی طرف
ہو گئے۔

لیکن ثانیہ کے چہرے پر پھیلے تاثرات نے انہیں بری طرح چونکا دیا تھا۔ اس کے ماتھے پر
وں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، اپنی پلیٹ پہ سختی سے نظریں جمائے
ہ خود پر کڑا ضبط کیے بیٹھی تھی۔

انہوں نے الجھن آمیز نظروں سے پہلے اسے اور پھر زارون کو دیکھا تو بات جیسے ایک پل میں
کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں تقریباً پھینکتے ہوئے وہ عجلت میں اٹھ کھڑے
ئے تھے۔

زارون فروٹ ٹرائفل کھا رہا تھا اور عموماً اماں وزیراں ہی اسے کھانا کھلایا کرتی تھیں اس وقت

وہ غالباً کسی کام سے کچن میں مصروف تھیں یا ویسے خیال نہیں رہا تھا۔ اسی لیے زارون نے
ہوئے نہ صرف اپنا چہرہ خراب کر رکھا تھا' بلکہ بہت سا ٹرائفل کپڑوں پر بھی گرا رکھا تھا۔ ہا
اٹھتے ہی نیپکن لے کر اس کے ہونٹ اور ٹھوڑی صاف کی اور اماں کو پکارتے ہوئے اس
بھی صاف کرنے لگے۔ زارون نے بھائیان کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو خوامخواہ ہی منہ کھ
ہنگم انداز میں ہنسنے لگا تھا اور ثانیہ جو بالکل غیر ارادی طور پر اس کے چہرے پر نظریں جما
ایک دم ہی کرسی دھکیل کر اس کا دل ایک دم ہی الٹنے لگا تھا۔ ہارون نے ایک کڑی نگاہ
ثانیہ پر ڈالی اور پھر تقریباً دھاڑتے ہوئے اماں کو پکارنے لگے۔ اماں بے چاری حواس
بھاگتی چلی آئیں۔

''اماں ! کم از کم کھانا تو ڈھنگ سے کھلا دیا کریں اسے۔'' وہ اماں پر خوامخواہ
ہونے لگے۔

''بیٹا! میں تو بس پانی .....'' وہ منہ ہی منہ میں وضاحت کرنے لگیں۔ جواباً ہارون ہا
نیپکن ٹیبل پر پھینک کر دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہیں ثانیہ کا رویہ درحقیقت بری طر
تھا۔ زارون بھائیان کی ڈانٹ پر سہم گیا تھا اور اب چپ چاپ پلکیں جھپکتے ہوئے انہیں د
ہارون کی اٹھتی گرتی نظریں اس پر پڑیں تو انہیں ایک دم ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا جس
مسکرا دیئے۔

''آئم سوری۔ لیکن بیٹا! میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔ آپ کھائیں ناں؟''

ان کے ایک ہی جملے سے زارون خوش باش ہو گیا تھا اور پھر جتنی دیر زارون ڈائنگ
موجود رہا وہ اس کے سامنے بیٹھے خاموش نظروں سے اسے تکتے رہے اور پھر اماں کا کا
اپنے کمرے میں آ گئے اور کافی دیر تک ٹھنڈے دماغ سے سوچنے پر احساس ہوا کہ ثانیہ
میں کوئی قصور نہیں تھا۔

وہ زارون سے تقریباً سات آٹھ سال بڑے تھے۔ لیکن جوں جوں وہ سمجھ بوجھ کی من
کرتے گئے انہیں یہ احساس ہوتا گیا کہ زارون کا ان کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ا
شخصیت ایسی ہے کہ لوگ اس ہمدردی تو کر سکتے ہیں محبت اور چاہت نہیں دے سکتے۔ سوا
اپنی تمام تر محبت اسے دی تھی۔ ایک بیٹے کی طرح چاہا تھا اسے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی
خیال رکھا تھا۔ اتنی محبت میں کراہت، نفرت یا گریز کو جگہ کہاں ملتی؟ وہ ان کا سگا بھائی تھا
کے ساتھ ان کا خون کا رشتہ موجود تھا۔

اور ثانیہ! ثانیہ کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔
نہ خون کا، نہ محبت کا، نہ دوستی کا، نہ چاہت کا رشتہ، صرف ایک نکاح کا رشتہ تھا۔ ایک کاغذی
، جو عام حالات میں ایک لڑکی کے لیے تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ مگر ان حالات میں
ثانیہ اس رشتے کو تسلیم بھی نہیں کر سکی تھی۔ وہ آج بھی ان سب کے لیے غیر تھی، اجنبی تھی، وہ
آئی ہوئی لڑکی تھی۔ اتنی جلدی اس سے بہترین رویے کی توقع رکھنا یقیناً حماقت تھی مگر اس
وجود ہارون کو رہ رہ کر یہ سوچ پریشان کر رہی تھی کہ انہوں نے ثانیہ کو اس گھر میں لا کر غلطی تو
ی؟

فوری طور پر نہ سہی مگر کیا آئندہ وہ ان کے مطلوبہ رویے کو اپنا سکے گی؟ زارون ہمیشہ اس کی
کا شکار رہے گا یا اس کے دل میں اپنے لیے کوئی نرم گوشہ بیدار کر سکے گا؟

ان کا ذہن ایک کے بعد دوسری سوچ میں الجھتا رہا اور رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔



ثانیہ کو محسوس ہوا تھا جیسے اچانک ہی اس کے سینے پر بے تحاشا بوجھ آ پڑا ہو۔ کچھ دیر وہ یونہی
ں میں پڑی رہی مگر جب یہ احساس بڑھتا ہی گیا تب اچانک اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی
۔ چند لمحے لگے تھے سوئے ہوئے حواس بیدار ہونے میں اور پھر جونہی شعور پوری طرح جاگا وہ
ڈا کر رہ گئی تھی۔

اگلا پل اسے شدید گھبراہٹ سے دوچار کر گیا تھا۔ زارون کا بھاری بازو اس کے سینے پر پڑا تھا
اس کے شانے کو چھو رہا تھا۔ صورتحال کا ادراک ہوتے ہی اس کے پورے جسم میں جیسے کرنٹ
لیا تھا۔ تکیے سے سر اٹھا کر اس نے نائٹ بلب کی خوابناک روشنی میں بغور زارون کا چہرہ دیکھا
وہاں نیند کا غلبہ تھا۔

گویا نیند کے دوران کروٹ بدلتے ہوئے غیر ارادی طور پر ہی زارون کا بازو اس کے سینے پر
آ تھا۔ اپنی اتھل پتھل سانسوں کو ہموار کرتے ہوئے اس نے زارون کا بازو پیچھے ہٹایا۔ اس کے
ذرا سا سرکا کر اپنے شانے کو آزاد کرواتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ گہری گہری
سانس لے کر اس نے اپنے بے تحاشا دھڑکتے دل کو سنبھالا۔ حلق میں الگ کانٹے سے چبھنے لگ
تھے۔ بدن کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی تھی۔ لائٹ جلا کر روم ریفریجریٹر
پانی کی بوتل نکال کر اس نے لبوں سے لگائی تو پھر غٹاغٹ پانی چڑھاتی چلی گئی۔
ابھی خاصہ خنک تھ
۔ اسے اپنے مساموں سے پسینے کے قطرے پھوٹتے ہوئے محسوس ہو

رہے تھے۔ اپنی آستین سے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے پانی کی بوتل وا
کندھے پر لٹکتا دوپٹہ کھینچ کر کرسی پر پھینکا اور پھر عقبی لان میں کھلنے والی کھڑکی کھول کر
سانس لینے لگی۔ بہت عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔

اس کے کنوارے بدن نے پہلی بار کسی مرد کے لمس سے آشنائی حاصل کی تھی اور م
غیر نہیں اس کا اپنا شوہر تھا۔ مگر پھر بھی اسے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ہاں مگر ناگوار نہ
اپنے شانے پر اب بھی گرم گرم سانسوں کی حدت محسوس ہو رہی تھی اور سینے پہ جیسے ابھی بھی
بوجھ دھرا تھا۔

اس نے طویل سانسیں لیتے ہوئے چور نگاہوں سے زارون کی طرف دیکھا۔ وہ اُسی
زاویے میں سو رہا تھا۔ خوبصورت چہرے پر ازلی معصومیت کا راج تھا۔ سیاہ گھنے بالوں
پیشانی کو چھپا رکھا تھا۔ سیاہ پلکیں آپس میں جڑی ہونے کے باوجود دھیرے دھیرے لرز
تیز روشنی میں اس کے چہرے پر شیو کی نیلاہٹیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ بے خود سے انداز
اس کی طرف بڑھ آئی۔ بیڈ کے کنارے پر ٹکتے ہوئے بے تحاشا دل چاہا تھا کہ وہ ڈھیرے
کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو ہٹا دے مگر نجانے کیوں وہ جھجک سی گئی۔

''وہ ایک ابنارمل انسان ہے۔ نہ اسے احساس ہے نہ ادراک اور میں ......'' اسے اپ
کیفیت پر بے پناہ خجالت محسوس ہوئی تھی۔ چند لمحے وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر اس
اب شاید وہ دوبارہ اس کے برابر نہیں سو پائے گی۔ کچھ دیر تذبذب کے بعد وہ اپنی جگہ سے ا
نے صوفے پر سونے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اپنا تکیہ اٹھانے سے پہلے اس نے زارون کا بازو تکیے پر
تو نظریں بھٹکتی ہوئی اس کے ہاتھ پر جا رکی تھیں۔ سرخ پوروں والا سفید ہاتھ جسے سیاہ با
ہلکے روئیں، نے مزید خوبصورت اور دلکش بنا دیا تھا۔ اپنا تکیہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک بار
دیکھا جو ہنوز غافل پڑا تھا اور پہلی بار ...... اس تمام عرصے میں پہلی بار اس نے سوچا تھا۔

''کاش ...... کاش زارون ...... تم ایسے نہ ہوتے ......'' اس کی آنکھوں میں دھند سی ا
تھی جسے اپنی ہتھیلیوں سے رگڑتے ہوئے اس نے لائٹ بجھا دی تھی۔



ہارون کی طبیعت کچھ ناساز تھی سو وہ آج بے وقت ہی گھر چلے آئے تھے۔ زارون
ریڈور میں ہی مل گیا تھا۔

''ہیلو بھائیان!''

ہارون جو اپنی ہی دھن میں آگے بڑھے جا رہے تھے عقب سے اسی کی آواز سن کر ٹھٹک گئے۔
''ہیلو! کہاں سے آ رہے ہیں جناب؟'' انہوں نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور بغور
رانا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

ننگے پاؤں تھا۔ شرٹ کی آستین نجانے کس طرح پھٹ کر لٹک رہی تھی۔ بال گرد آلود اور
ہوئے تھے۔ وہ اتنا ابنارمل تھا نہیں جتنا اس وقت لگ رہا تھا۔ ہارون کے چہرے پر پھیلی
یکلخت ہی غائب ہو گئی تھی۔

''میں ...... وہ ...... ادھر لان میں تھا۔'' زارون نے بازو جھلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اماں وزیراں کہاں ہیں؟''

''اماں ......؟'' وہ اپنے بال کھجانے لگا تھا یعنی قطعی لاعلمی کا اظہار۔

''اشرف۔'' انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے ملازم کو پکارا تھا اور یہ پکار بھی کسی دھاڑ سے
جو یقیناً ثانیہ کے کمرے تک بھی پہنچی تھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں گم تھی۔ بری طرح چونک گئی۔

''لگتا ہے پھر کس کی شامت آئی ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور چونکہ شامت
آتی تھی اس لیے وہ وجہ معلوم کرنے کے لیے ہی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی مگر لاؤنج کا
دروازے پر ہی رک گئی تھی۔ تینوں ملازم سر جھکائے کھڑے تھے اور ہارون کے غیض
کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں جیسے برس جانے کو بے
ثانیہ کو اس کے لہجے میں غصے کے ساتھ دکھ کا عنصر بھی محسوس ہوا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، وہ کون سے ایسے کام ہیں جو زارون سے زیادہ اہم ہو سکتے
آپ لوگوں کو تنخواہ کس کام کی ملتی ہے؟ گھاس کھودنی پڑتی ہے؟ باہر کے کام ہیں آپ کے
پھر یہ سارا گھر آپ نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے؟ آپ کو یہاں ملازمت دی گئی اس
کے ساتھ کہ زارون جوں ہی کوریڈور کی حد پار کرتا ہے آپ میں سے کوئی نہ کوئی اس کے
بعض اوقات گیٹ کھلا ہوتا ہے زارون گیٹ سے باہر جا سکتا ہے یا خدانخواستہ اسے کوئی اور
پہنچ سکتا ہے۔ آج لاج کی باڑ سے اس کی شرٹ کا بازو ادھڑ گیا کل لوہے کی وہ تاریں اس
کا گوشت ادھیڑ کر رکھ دیں گی تب کیا کر سکیں گے آپ لوگ۔ دو ماہ بعد اماں وزیراں مارکیٹ
اور آپ کی ذمے داری کا یہ عالم ہے یعنی اگر اماں پوچھ گچھ کرنے کے لیے موجود نہ ہو تو
اس گھر میں لاوارثوں کی طرح پھرتا رہے گا۔ ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ میں ہر
کسی ہر کوتاہی کو برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن زارون کے معاملے میں کوئی غفلت، کوئی کوتاہی،

کوئی لاپروائی میں ہرگز ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ یہ میری پہلی اور آخری وارننگ ہے۔
بعد اگر کچھ ایسا ہوا تو میں کھڑے کھڑے آپ کو نکال باہر کروں گا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ فرام مائی
تینوں ملازم دم سادھے کمرے سے باہر نکل گئے تھے اور وہ وہیں صوفہ چیئر پر گر
تھے۔ کچھ دیر یونہی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے خود کو نارمل کرتے رہے اور پھر صوفے
سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگے۔

"دینو بابا...... پانی لے کر آؤ۔" انہوں نے ہلکی سی آواز میں پکارا تھا۔ ثانیہ ان کے
انداز میں تھکاوٹ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکی تھی۔ ہارون اپنے کمرے میں جانے کے لیے
ثانیہ بھی فوراً وہاں سے کھسک آئی۔ کمرے میں آ کر اسے احساس ہوا کہ اس کی ٹانگیں کا
تھیں اور ہاتھ سرد ہو رہے تھے۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو ان ملازمین کی قطار میں کھڑا محسوس
تھی جنہیں ابھی ابھی زبردست قسم کی جھاڑ پڑی تھی۔ اسے بھی تو اسی مقصد کے لیے یہاں لایا
اور حیرت کی بات یہ کہ ابھی تک اس کی ہر کوتاہی بڑی آسانی اور کمال مہربانی سے نظر انداز کر
تھی۔

"اور اگر جو کبھی مجھے بھی اس قطار میں لا کھڑا کر دیا گیا تو......؟" وہ جھرجھری لے کر
وہ ایک خوف جو بچپن سے اس کے دل میں پڑا تھا ایک دم سے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔

"زارون! تمہارے کپڑے بہت خراب ہو رہے ہیں، تم نہا لو، میں تمہارے کپڑے
ہوں۔"

اماں وزیراں کے انداز میں اس نے کہا تو وہ خلاف توقع بڑی جلدی مان گیا۔ اسے واش
میں بھیج کر اس نے اس کے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھیلا دیئے اور بلند آواز میں زارون کو اطلاع
کر خود باہر آ گئی۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد زارون باہر نکلا تو وہ چڑ کر رہ گئی۔

زارون نے شرٹ الٹی پہن رکھی تھی اور بالوں سے بھی قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔

"ادھر آؤ تم۔" ثانیہ نے اسے شرٹ کے بازو سے پکڑ کر دوبارہ بیڈروم میں کھینچ لیا۔

"کیا ہے تمہیں؟" اپنا بازو چھڑاتے ہوئے زارون اس کے انداز پر الجھ گیا تھا۔ ثا
اسے بگڑتے دیکھ کر فوراً ہی خود پر قابو پایا اور میٹھے لہجے میں بات کرتے ہوئے اسے بیڈروم میں
آئی۔

"زارون! تم نے شرٹ الٹی پہن لی ہے۔"

"ایسے ہی ٹھیک ہے۔" وہ باہر جانے کو پلٹا تو ثانیہ فوراً اس کے سامنے آ گئی۔

"اچھا بس ایک منٹ رکو۔" اس نے فوراً سے پیشتر اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر شرٹ اتاری
ی کر کے زارون کو پہننے میں مدد دی اور پھر اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے لا بٹھایا۔ تولیہ لے
کے گیلے بالوں کو قدرے خشک کیا اور برش اٹھا کر اس کے بکھرے بال سنوارنے لگی۔ یہ
اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ کر رہی تھی۔ بال بنا کر اس نے پرفیوم
کرنا چاہا تو زارون نے پرفیوم اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"میں خود ہی کروں گا۔" وہ خوشبو کی پھوار میں بھیگنے لگا پھر ایک نظر ثانیہ پر ڈالی۔ شرارت سے
اور پرفیوم کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ثانیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا سو وہ یکلخت ہی دو
پیچھے ہٹ گئی۔

"زارون! نہیں کرو۔" چونکہ حملہ بہت اچانک ہوا تھا اس لیے وہ فوری طور پر خود کو بچا نہ سکی
پہلا اسپرے ہی چہرے پر ہوا تھا۔ آنکھیں بھی محفوظ نہیں رہ سکی تھیں۔ بے تحاشا جلن کا
ہوتے ہی اس نے کئی قدم پیچھے ہٹتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

"زارون پلیز بس کرو۔" وہ چلائی تھی مگر زارون کو شاید یہ عمل زیادہ ہی لطف انگیز لگا تھا۔ سو
لا کر ہنستا چلا جا رہا تھا۔ اس کی اس بے تکی حرکت یا شاید اپنی بے بسی پر ثانیہ کے وجود میں غصہ
گیا تھا۔

"زارون! بند کرو یہ حرکت ورنہ میں......" پیچھے ہٹتے ہوئے وہ اچانک ہی دیوار سے جا لگی تھی
رون مسکراتے ہوئے بڑی مستقل مزاجی سے اس کے وجود کو خوشبو میں بھگوتا جا رہا تھا۔ ثانیہ کو لگا
کی شیشی ختم کر کے ہی دم لے گا مگر بے تحاشا خوشبو نے اس کا دماغ ہی گھما ڈالا تھا۔ مزید
ت کی ہمت نہ رہی تو وہ سب احتیاط پس پشت ڈال کر زارون پر جھپٹی اور اگلے ہی لمحے پرفیوم
کے ہاتھ سے چھین کر اس نے پوری قوت سے دیوار پر کھینچ مارا تھا۔

زارون اپنی جگہ دنگ سا رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ثانیہ کا دل چاہا وہ اس پر بری طرح
پڑے مگر آنکھوں ہوتی جلن نے اسے کچھ زیادہ مہلت نہیں دی تھی۔ بس ایک بھرپور شکایتی نظر
نے زارون پر ڈالی اور دھم سے کرسی پر گر گئی۔ سر جھکا کر اس نے ڈوپٹے کے پلو سے اپنی
میں رگڑیں جہاں سے جلن ہونے کے ساتھ ساتھ پانی بھی بہہ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد اپنے ہونٹوں سے سسکیوں کی آواز سن کر اسے احساس ہوا کہ بہتے پانی میں
وؤں کی آمیزش بھی ہو چکی ہے۔

زارون اپنی جگہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے کی مسکراہٹ اس کے چہرے

سے غائب ہو چکی تھی۔

"ثانیہ تم ...... تم رو کیوں رہی ہو؟" اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اس نے بہت دھیمے
پوچھا اور ثانیہ کو تو خود بھی اپنے آنسوؤں کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ معلوم نہیں آنکھوں م
کی وجہ سے رونا آیا تھا یا غصے اور بے بسی کے احساس کے تحت۔

"ثانیہ ...... ثانیہ ......! مت روؤ ......" زارون بہت آہستگی سے اس کا بازو ہلاتے ہو
رہا تھا۔

ثانیہ نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے سر اٹھا کر ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا۔ وہ
پاس قالین پر بیٹھا ہوا تھا، بہت سہما اور ڈرا ہوا۔

"نہیں روؤ ...... ثانیہ ......!" اس نے جیسے التجا کی تھی۔

"زارون تم جاؤ یہاں سے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ زارون جیسے ناسمجھی
میں اسے دیکھنے لگا۔

"لیکن تم تو رو رہی ہو اور جب تم روتی ہو تو اماں تمہیں چپ کرواتی ہیں۔ میں بھی تمہ
کروا رہا ہوں۔" وہ اپنا ہاتھ اس کے پر رکھ کر تھپکنے لگا۔ اس نے بارہا اماں کو اسے اسی طر
چپ کرواتے دیکھا تھا۔ اس ہمدردی پر ثانیہ بس ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں اب چپ کر گئی ہوں۔"

اس نے زارون کا ہاتھ ہٹایا اور خود اٹھ کر واش روم میں گھس گئی۔ آنکھوں پہ پانی
مارتے ہوئے اس نے دانستہ دیر لگائی تھی اور جب وہ باہر نکلی تو زارون واقعی کمرے میں نہیں



گولڈن فریم کا نہایت نفیس چشمہ اتار کر انہوں نے حسب عادت کھلی فائل پر رکھ
انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں کے پپوٹوں کو دباتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گزشتہ دو
انہیں ٹمپریچر ہو رہا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث وہ ڈاکٹر کے پاس نہ جا سکے تھے۔ حقیقت تو
انہوں نے ادھر ادھر کے مسائل میں خود کو اتنا الجھا رکھا تھا کہ اپنی ذات پر توجہ دینے کی عاد
رہی تھی۔

اسٹڈی روم لاک کر کے وہ نیچے آئے تو لاؤنج میں روشنی دیکھ کر کچن کی طرف جا
بجائے وہیں آ گئے۔

"اچھا کرتی ہو بیٹی! جو زارون میاں میں دلچسپی لینے لگی ہو۔"

ہونہہ ...... مجبوری ہے اماں ......! لاکھوں روپوں کا حق ادا کرنا ہے مجھے۔ بٹھا کر کھلانے کو
کیا اماں مجھے ......" ثانیہ کے لہجے کی کاٹ نے اس کے اٹھتے قدم روک دیئے تھے۔

"تو گویا ابھی تک یہ کیل اس کے دل میں گڑی ہے۔" انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور
نج میں داخل ہو گئے۔

"ابھی تک جاگ رہے ہو سب لوگ۔" انہوں نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی جس
ہاں ساڑھے گیارہ کے ہندسے پر جگمگا رہی تھیں۔

"ہاں میاں! زارون کا سونے کا ارادہ نہیں، اسی لیے ہم بھی بیٹھے ہیں۔" اماں وزیراں نے
ی سے جواب دیا۔ انہوں نے اپنی پشت سنبھالتے ہوئے ثانیہ کو دیکھا وہ کارپٹ پر بیٹھی
کی طرف متوجہ تھی جو اپنے سامنے ڈھیروں بلاکس پھیلائے ان میں پوری طرح گم تھا۔

"اماں! ایک کپ چائے مل جائے گی؟"

"کیوں نہیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔" ہارون کی فرمائش پر وہ اٹھنے کو تھیں کہ ثانیہ نے انہیں
کا۔

"میں بنا لاتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی سو اماں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

"ہارون بیٹا! خیریت تو ہے؟ کچھ سست دکھائی دے رہے ہو؟" اماں وزیراں نے بغور ان کا
لیا۔ قدرے ایزی ہو کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنا دایاں بازو سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ اماں کی
ر انہوں نے بند آنکھوں سمیت مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ درحقیقت وہ سوچ رہے تھے کہ
انیہ سے ضرور ہی بات کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد ثانیہ کی آواز پر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور
ھی سیدھے ہو بیٹھے۔

"اماں! میرے کمرے میں سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سردرد کی گولیاں ہوں گی۔ تھوڑی زحمت
ہا اور ......"

"لو بیٹا زحمت کیسی؟ ابھی لائے دیتی ہوں۔" وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ثانیہ دوبارہ
ن کے پاس بیٹھ گئی۔ زارون نجانے کب سے بلاکس جوڑ رہا تھا لیکن ہر دفعہ ناکام ہو رہا تھا۔ سو
نے جھنجھلا کر سارے بلاکس نیچے پھینک دیئے تھے۔

"نہیں بن رہا۔" وہ روہانسا ہو کر چلایا تھا۔ ہارون اور ثانیہ دونوں ہی اپنی جگہ چونک گئے

ثانیہ نے ایک نظر زارون کو دیکھا اور پھر سارے بلاکس اپنے سامنے رکھ کر انہیں جوڑنے لگی۔

لمحوں میں ہی لمبی سی ٹرین تیار کھڑی تھی۔

''یہ کیا بن گیا؟'' زارون کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

''ٹرین بن گئی۔''

''ٹرین کو کیا کرتے ہیں؟''

''سفر کرتے ہیں ٹرین میں بیٹھ کر۔'' ثانیہ نے مختصراً جواب دیا۔

''سفر کیا ہوتا ہے؟''

''پتا نہیں۔''

اماں وزیراں کے ہاتھ سے گولی لے کر نگلتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر زارون ا
طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''ہم بھی اس میں بیٹھیں گے؟''

''نہیں......''

''کیوں؟'' جواب ندارد تھا۔

''ہم......ہم اس میں بیٹھیں گے۔ ہم کہاں جائیں گے؟''

''پتا نہیں۔''

ہارون نے محسوس کیا کہ ثانیہ کا رویہ کھنچا کھنچا سا تھا اور لہجے میں بیزاری در آئی تھی۔

''ثانیہ! اگر تم ایک بار اطمینان سے اسے بات سمجھا دو گی تو وہ بار بار تمہیں تنگ نہ
گا۔'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ ثانیہ ان کی آواز پر ایک لمحے کے لیے انہیں دیکھا تھا اور پھ
کر سر جھکا لیا تھا۔

ہارون نے خالی کپ تپائی پر رکھا اور پھر قدرے آگے کو جھکتے ہوئے وہ ثانیہ کی طر
طرح متوجہ ہو گئے تھے۔

''دیکھو ثانیہ! تم زارون کو ایک عام فرد کی نگاہ سے مت دیکھا کرو۔ تم اس کی بیوی
سے اس گھر میں آئی ہو لہٰذا اب زارون کی ذمہ داری ہم سب سے زیادہ تم پر عائد ہوتی
یہاں رہنے کا آخری فیصلہ تو بہر حال تمہارا اپنا تھا۔'' ان کی آخری بات پر ثانیہ نے کاٹ
سے انہیں دیکھا تھا۔

''جی ہاں۔ آپ لوگوں نے تو اڑان بھرنے کی اجازت دے دی تھی۔ مجھے، پر کاٹ
اس نے نظریں جھکا کر بڑے اطمینان سے طنز کیا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے اور پھر

ہ کھڑے ہوئے۔

''میں مانتا ہوں تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ بڑا ظلم ہوا ہے تم پر مگر ظالم یا تو میں ہوں یا
احمد۔ زارون تو اس پورے معاملے میں بالکل بے قصور ہے۔ وہ تو تم پر بہت حق رکھتا ہے۔ چلو
ی حیثیت سے نہ سہی انسان ہونے کے ناتے سے تو تم اسے وہ محبت اور چاہت دے سکتی ہو تا
ے کے لیے بہت ضروری ہے۔ ثانیہ! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بے تحاشا توجہ اور بے پایاں محبت
ن کو نارمل کر سکتی ہے۔ تم اسے اپنی محبت دو اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا اس کی
یں اس محبت کا جواب دیتی ہوئی محسوس ہوں گی۔''

''ہارون صاحب! میں اتنا ہی کر رہی ہوں جتنا انسان ہونے کے ناتے کر سکتی ہوں ورنہ
ت تو یہ ہے کہ وہ لاکھوں زہر میں بجھے تیر جو میرے دل میں گڑے ہیں۔ وہ مجھے اس گھر میں اپنی
ت، اپنے مرتبے کا تعین ہی نہیں کرنے دیتے۔ ہارون صاحب! باندی بیوی نہیں بن سکتی اور
زیدی نہیں جا سکتی۔ تو پھر میرا رتبہ اس گھر میں کیا ہے؟
یں ملازموں کی قطار میں کھڑی ہوں تو زارون سے تعلق مجھے ان سب سے ممتاز کر دیتا ہے۔
یوی بن کر زارون کے برابر کھڑی ہوں تو وہ آٹھ لاکھ مجھے اس سطح سے نیچے دھکیل دیتے ہیں۔
یا کروں؟ لونڈی بن کر زارون کے قدموں تلے بچھ جاؤں یا بیوی بن کر اسے محبت کے آنچل
میٹ لوں۔ آخر کس نظر سے دیکھوں میں اسے؟'' ثانیہ لرزتی آواز میں دل کی ساری بھڑاس
ا چلی گئی۔

آنکھیں تھیں کہ برس جانے کو تیار۔ خود کو سمیٹنا مشکل ہو رہا تھا سو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ
ڑی ہوئی تھی۔ ہارون جو دریچے میں کھڑے لان میں بکھری رات کی سیاہی کو کھوج رہے تھے
ٹ کی آواز پر وہ چونک گئے۔ انہوں نے اس کی پوری بات نہایت اطمینان اور توجہ سے سنی تھی۔

''ثانیہ! ابھی بیٹھو کچھ دیر۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ سر میں اٹھتی درد کی لہروں سے
یاز ہو کر اس کی طرف پلٹے تھے۔

''مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔'' اس نے فوراً ان کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ وہ اس کے
ئے رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو گالوں پر پھسلتے چلے گئے تھے۔ اس کے اکھڑ اور خفا خفا سے لہجے پر
بے اختیار ہی ہولے سے مسکرا دیے۔

''بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ بیٹھ کر آرام سے وہ سنو جو میں کہنے جا رہا ہوں۔''

''بچوں جیسی باتیں تو بچپن میں نہیں کی تھیں اب کیا خاک کروں گی۔'' وہ صوفے پر بیٹھ تو گئی

تھی مگر کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ ہارون اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئے۔

وہ کم عمر تھے مگر حالات واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کی نگاہ عمر رسیدہ ہو چکی تھی اور ا
زیادہ کون جان سکتا تھا کہ بچپن میں بڑھاپا اوڑھنے والوں کے وجود میں کتنی حسرتیں پنپتی ہیں
خواہشیں گھر کرتی ہیں۔

وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ثانیہ تک آئے۔ کچھ لمحے زارون کو دیکھتے رہے
آنکھوں میں نیند پوری طرح سما چکی تھی پھر اسے اس کے کمرے تک پہنچا آئے۔ اماں وزیرا
ہی جا چکی تھیں۔ سو وہ بہت اطمینان کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھے اور ساری بات کھول کر
سامنے رکھ دی۔ وہ کبھی بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی کبھی انگلیاں چٹخاتے ہوئے اپنے آ
الجھتی رہی۔

”تم اگر کہتیں تو میں کمال احمد سے ایک ایک پائی وصول کر لیتا مگر مصیبت یہ ہے کہ میں
زبان دے چکا ہوں اور پھر کمال احمد پر ہی کیا موقوف چند اور لوگ بھی ایسے ہیں جنہیں میں
رقم بطور قرض دے رکھی ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ یہ رقم مجھے واپس کرنے کی استطاعت
رکھتے تم اسے میری کمزوری ہی سمجھ سکتی ہو کیونکہ اپنے سامنے کسی بھی پھیلے ہوئے ہاتھ کو خالی
میرے لیے ممکن نہیں وہ بھی اس صورت میں کہ روپے میرے پاس موجود ہوں۔
اور یوں بھی ثانیہ! اگر تم غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں بعض لوگ
وافلاس کے ہاتھوں اس قدر بے بس و مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر میں کسی غربت کے گھر کا
کھٹکھٹاتا تو وہ زارون کی حالت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اپنی بیٹی اس سے بیاہنے پر را
جاتے کیونکہ ان کی بیٹی اچھا کھائے۔ اچھا پہنے اور ایک محفوظ پناہ گاہ میں رہے۔ لہٰذا ایسی
میں کوئی فرد اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی لڑکی کے حصول کے لیے لاکھوں کی رقم ڈبو د
اس گھر میں آئی ہو تو صرف اس کی وجہ سے کہ ہم سے پہلے کاتب تقدیر نے تمہارا اور زارون
لکھ چھوڑا تھا۔ اب بتاؤ بات سمجھ میں آئی جو میں کہہ رہا ہوں۔“ انہوں نے ثانیہ کی کھلی آنکھو
جھانکا تو وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

”آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے ناں؟“ اس کے انداز میں معصومیت تھی۔

”کیا تم سمجھ سکتی ہوں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ انہوں نے جلتی ہوئی آنکھیں بمشکل
کر اس سوال کیا تو وہ مزید الجھ گئی۔

”مگر اتنی بڑی رقم...... بطور قرض اور وہ بھی نا قابل واپسی......!“ اسے کسی طور پر با

ہو رہی تھی۔

”ثانیہ! کیا تم نے اپنے سسرال والوں کو اتنا کنگال سمجھ رکھا ہے۔ خدا کا اتنا فضل ہے ہم پر کہ
ہاتھوں سے لٹانا شروع کریں تو بھی کمی واقع نہ ہو۔“

ان کے قدرے بشاش لہجے پر وہ انہیں بس دیکھتی رہی تھی۔

”اوکے اب تم سو جاؤ۔ کوئی اور بات رہ گئی ہو تو صبح کہہ دینا۔ مجھے یقین ہے کہ میں تمہارے
ان کا جواب دے سکتا ہوں۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اپنے کمرے
آ گئی۔ ہارون کی بات کبھی اسے سچ لگ رہی تھی کبھی جھوٹ۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ ذہن پر سے
ہٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس رات وہ قدرے اطمینان سے سوئی تھی۔



وہ بے حد گہری نیند میں تھی۔ مگر اس کے باوجود کچھ ایسا ہوا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی اور
ال کوشش میں صوفے سے گرتے گرتے بچی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس نے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے کی
ش کی۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی غیر معمولی صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ مدھم لائٹ کی
میں اس نے بغور سوئے ہوئے زارون کی طرف دیکھا اچانک ہی اسے لگا کہ زارون کا جسم
لکے جھٹکے کھا رہا ہے۔ غالباً نیند سے اٹھنے کے باعث اسے لگا کہ وہ ٹھیک سے نہیں دیکھ پا رہی
سو اس نے لپک کر پہلے ٹیوب لائٹ روشن کی تھی اور پھر جوں ہی اس نے پلٹ کر بیڈ کی طرف
ا۔ واضح ہوتے منظر نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں
لق سے بے اختیار چیخ برآمد ہوئی تھی۔

زارون کا سارا جسم زور زور سے جھٹکے کھا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے تحاشا مڑ گئے تھے۔ اس کے
ے غیر معمولی طور پر بھنچ گئے تھے اور آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ حلق سے تکلیف کی شدت سے
ہ غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے نادیدہ زنجیروں میں جکڑ کر مخالف
ت میں کھینچا جا رہا ہو۔ اس کی اس حالت نے ثانیہ کے حواس جیسے بھک سے اڑا دیئے تھے۔ وہ
ہرا کر ایک دم آگے بڑھی پھر فوراً ہی کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ زارون کی خوفناک حد تک بگڑتی
نے اسے بری طرح متوحش کر دیا تھا۔

”کوئی ہے...... اماں......! ہارون......!“ وہ پوری قوت سے چلائی تھی مگر اسے لگا اس کی آواز
سا پائی۔ وہ یونہی چیخ چیخ کر انہیں پکارتی ہوئی باہر نکلی تو تاریک راہداری میں

اسے کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا تھا کہ ہارون کا کمرہ کس طرف ہے۔

"کوئی ہے۔ خدا کے لیے جلد آجاؤ۔ ہارون ......! ہارون......!" اس نے زور
چلاتے ہوئے برابر کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ دروازے کھلنے میں چند لمحے لگے
کہ جیسے ساری توانائیاں اسی کوشش میں خرچ ہوگئیں۔

"زارون کو...... زارون کو پتا نہیں کیا ہوگیا؟" ہارون کے بوکھلائے چہرے پر نظر
اس نے کہا تھا۔ ہارون نے اس کی پوری بات سنے بغیر ہی اسے ایک طرف دھکیلا اور
سے زارون کے کمرے میں گھس گئے۔

زارون کو پڑنے والا دورہ اس قدر شدت اختیار کر گیا تھا کہ تڑپتے تڑپتے اس کا
بستر سے نیچے لٹک گیا تھا۔ ہارون نے فوراً اسے پیشتر اسے سنبھال کر بیڈ پر ڈالا تھا او
پھڑ پھڑاتے جسم کو قابو کرنے لگے تھے۔ کسی جانور کو رسیوں سے جکڑ کر کند چھری سے ذ
جو حالت ہوسکتی تھی۔ ایسی ہی حالت زارون کی تھی اور ثانیہ کے لیے اس حد تک غیر متو
پوری طرح سانس بھی نہیں لے رہی تھی۔

"ثانیہ...... ٹیبلٹس! نکالو۔" ہارون کی آواز پر وہ مزید بوکھلا گئی تھی۔

کون سی ٹیبلٹس، کیسی ٹیبلٹس۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔ تب ہی ہار
بروقت کام کرگئی۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھینچی تھی اور ا
سے ایک شیشی نکال کر اس کے ہاتھوں میں دی تھی۔ اس عالم میں ان کے ہاتھ بھی کپکپار

"ایک گولی پیس کر پانی میں ملا کر لاؤ۔"

وہ شیشی ہاتھ میں دبوچ کر کچن کی طرف بھاگی۔ پہلے راہداری میں کسی چیز سے
کچن کے بند دروازے سے جا ٹکرائی۔ بمشکل ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچن کی لائٹ جلائی۔ گھبراہ
تھا کہ ایک چمچ نکالنے کی کوشش میں پورا کٹلری سیٹ زمین پر آرہا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں
تو وہ پوروں کے بیچ سے نکل کر نجانے کہاں گر گئی۔

اس نے ڈھونڈنے کی کوشش کیے بغیر دوسری گولی نکال کر سلیب پر رکھی اور کچھ سمجھ
بیلن لے کر ہی گولی کو چور چور کر ڈالا۔ اسے کپ میں ڈال کر ایک گھونٹ پانی ملایا اور ا
سے واپس بھاگ گئی۔ اس کے پیچھے ریفریجریٹر کھلا رہ گیا تھا۔ پانی کی بوتل زمین پر اد
اور پورا پانی فرش پر بکھر گیا تھا۔

وہ بیڈ روم میں پہنچی تو اماں وزیراں بوکھلائے سے انداز میں باہر نکل رہی تھیں۔

ان کے ہاتھ سے کپ اور چمچ لے کر دوبارہ اندر چلی گئیں۔ اس نے کھلے دروازے سے بس
اندرونی منظر پر ڈالی اور پھر وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ زارون کے حلق سے
خراشوں کی آواز ابھی بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے
ار کے ساتھ گھسٹتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا

"یا اللہ! رحم کر دے۔ اے پروردگار اپنا کرم کر دے۔" اس کے لبوں سے بے اختیار دعائیں
ہوگئیں۔ نجانے کتنی دیر وہ یونہی گھٹنوں میں سر دیئے چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ پھر اٹھ کر
ے میں آگئی۔ بہت ڈرتے ڈرتے اس نے آگے بڑھ کر جھانکا تھا۔ زارون کی کیفیت پہلے جیسی
ر پر بھی سارے جسم میں کھنچاؤ اور اکڑاؤ سا دیکھنے میں آرہا تھا۔ اماں اس کے سرہانے بیٹھی
پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ ہارون نے پہلے اس کا لباس درست کر کے کمبل اس پر ڈالا
دھیرے دھیرے زارون کے ڈھیلے پڑتے ہاتھ کو سہلانے لگے۔

دورے کے دوران زارون کا نچلا ہونٹ غالباً دانتوں تلے آگیا تھا لہٰذا وہاں کٹ سا لگ کر
بہہ رہا تھا ہارون نے خون صاف کر کے اس پر کوئی دوائی لگائی۔ اس کی نبض چیک کی اور پھر
ے پر آ کے ڈھے سے گئے۔ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے انہیں اپنی حالت قابل رحم سی لگی تھی۔ ایک
ت کی خرابی، اس پر کچی نیند سے اس گھبراہٹ کے عالم میں جاگے تھے کہ کتنی ہی دیر تک کچھ
نہ دیا تھا اس پر زارون کی حالت نے ان کے ہاتھ پاؤں مزید پھلا دیئے تھے۔ چند لمحے بعد
نے سر اٹھا کر زارون کو دیکھا وہ بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ پھر وہ ثانیہ کی طرف متوجہ ہوگئے جو
ن و متفکر چہرہ لیے کرسی پر ٹکی ہوئی تھی۔

"ثانیہ! مجھے زارون کے پاس رکنا پڑے گا۔ تم ساتھ والے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔" ان کی
ن کر اس کی نگاہیں زارون کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

"ہی ول بی آل رائٹ۔ پہلے بھی ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھار۔ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ اماں!
بھی آرام کریں۔ میں ہوں زارون کے پاس۔" انہوں نے بڑے سبھاؤ کے ساتھ ان دونوں کو
اسے اٹھانا چاہا تھا۔

ثانیہ نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا لیکن پھر جھجک کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس افراتفری میں اس کا دوپٹہ
انے کہاں رہ گیا تھا۔ اس نے طائرانہ نظر پورے کمرے میں ڈالی تو دوپٹہ وہیں صوفے پر پڑا نظر
جہاں وہ سو رہی تھی اور جہاں اس وقت ہارون براجمان تھے۔ ہارون نے اس کی نظروں کے

تعاقب میں دیکھا اور پھر دانستہ اٹھ کر بیڈ کے دوسری طرف جا کر ریفریجریٹر سے پانی کی بو
لگے۔ ثانیہ نے اٹھ کر اپنا دوپٹہ کھینچ کر کندھے پر ڈالا اور اماں کے ساتھ ہی کمرے سے ب
اماں وزیراں کو بھی ثانیہ نے اسی کمرے میں بلا لیا تھا۔ بقیہ رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ کبھی
تو عجیب و غریب ڈراؤنے قسم کے خواب آ کر ڈراتے رہے۔ رات کی کسی آخری گھڑی م
تھی لیکن اس کے باوجود جلد ہی آنکھ کھل گئی تھی۔

اماں وزیراں پہلے ہی اٹھ چکی تھیں۔ وہ بیڈ سے اترتے ہی سیدھی زارون کے کمر
بڑھی تھی۔ ہارون اسی کمرے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ دروازے ہی سے زارون کو د
واپس آ گئی۔ اماں حسب معمول کچن میں مصروف ہو گئی تھیں۔

"میں تو رات کو ڈر ہی گئی تھی اماں! زارون کی حالت تو دیکھی نہیں جا رہی تھی۔"
سچویشن کا سوچتے ہی وہ کانپ سی گئی تھی۔

"ہاں، تمہاری موجودگی میں تو شاید پہلا دورہ پڑا ہے اسے۔" اماں نے بسکٹ او
کپ اس کے سامنے رکھا۔

"لیکن ہم نے تو اس بچے کے ایسے ایسے دکھ دیکھے ہیں کہ خدا کسی دشمن کو بھی نہ د
انہوں نے اپنے لیے کپ میں چائے ڈالی اور اس کے سامنے آ بیٹھیں۔

"سات، آٹھ سال تک تو بالکل بھلا چنگا تھا۔ پھر ایک روز بخار نے آ لیا۔ سب
سمجھے کہ معمولی بخار ہے، دو چار نہیں تو چھ آٹھ دنوں بعد اتر جائے گا۔ ڈاکٹر کو دکھایا، دوا
لیکن بخار تو ایسا چمٹا کہ لگا بچے کی جان لے کر ہی چھوڑے گا۔ اسپتال میں داخل کروا دیا گ
کو۔ ڈاکٹر بھی پریشان تھے بغیر کسی بیماری کے اتنا طویل المیعاد بخار نہ دیکھا نہ سنا۔ کوئی چ
بعد بخار میں کمی آنے لگی۔ زارون ہاسپٹل سے گھر آ گیا۔ سب ہی خوش تھے کہ اچانک ر
ہی دورہ پڑ گیا اور اتنی شدت کہ اللہ میری توبہ۔ کچھ لوگ تو سورہ یاسین پڑھنے لگے کہ بس
آخر ہے۔ ایک بار پھر اسپتال لے کر بھاگے۔ وہاں ساری رات وقفے وقفے سے دور
رہے۔ آخری دورہ تو تین چار گھنٹے تک رہا۔

اس کے بعد اس کو کچھ ہوش نہ رہا۔ ایک مہینہ بے ہوشی کے عالم میں گزارا۔ پھر آنکھ
سن سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ حالت ایسی تھی جیسے چند ماہ کا بچہ ہو۔ یہاں ڈاکٹروں نے جان
اس کی زبان نہ ہلی۔ پھر بڑے صاحب زارون کو باہر لے گئے، وہاں کئی مہینے علاج ہوتا
بالکل ٹھیک ہو گیا، لیکن جب دورے پڑتے ہیں تو کئی کئی ماہ تک اسی بچپن کی کیفیت میں

ب تو اسی غم میں قبر میں جا پڑیں، میں تو کہتی تھی سب کالے جادو کا کرشمہ ہے، کئی تعویذ بھی لا
مگر شفا دینا تو رب سوہنے کے ہاتھ میں ہے ناں، نہیں معلوم اس کے کاموں میں کیا مصلحت
بیماری تو چلی گئی یہ دورے پڑنا بند ہو جائیں تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کہتے تھے اس کی
ر دو تو ٹھیک ہو جائے گا۔ بڑی اذیت ہوتی ہے اسے دیکھ کر۔ خدا میرے بچے پر اپنا فضل
اس کی جان کو سکھ دے۔" اماں وزیراں اپنی آنکھیں رگڑنے لگیں۔ ثانیہ کے حلق میں
کا پہلا گھونٹ ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔

"نہیں معلوم اس کے کاموں میں کیا بھید ہیں؟"
اور ہم گناہگار انسان...... ہماری زبانیں کفر تولتے نہیں تھکتیں۔
کوئی واقعہ ہو گیا ہے...... کیوں ہو گیا ہے...... اس کے ہونے میں کیا مصلحت تھی؟ کیا راز
؟ ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔
بغیر سوچے، بغیر سمجھے اور بغیر جانے ہم شکوے شکایات کا دفتر کھول لیتے ہیں۔
گویا خدا کو (نعوذ باللہ) ایک بے انصاف منصف کی طرح اپنے سامنے کٹہرے میں کھڑا کر
یتے ہیں۔
اسے ایک اناڑی کاتب سمجھتے ہیں جس نے ہماری تقدیر کی لوح پر کچھ غلط سلط لکھ ڈالا ہو
باللہ) محض اس لیے کہ وہ نہیں ہوا جو ہم چاہتے ہیں۔
اور کون جانے جو ہم چاہتے ہیں وہ ہمارے حق میں بہتر ہے بھی کہ نہیں۔

ثانیہ غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جسم کے ریشے ریشے میں کوئی انجانا سا
سر اٹھا رہا تھا۔ اس کا دل اپنے کردہ ناکردہ گناہوں پر توبہ استغفار کی تسبیح کرنے لگا تھا۔ وہ
انسان سے خوفزدہ ہوتی رہی تھی آج پہلی مرتبہ خدا کی خدائی سے دل کانپا تھا۔

اماں نے اسے اٹھتے دیکھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تب ہی دینو بابا چلے آئے۔
"ڈاکٹر علی آئے ہیں۔ ان کے لیے چائے بنا دیں۔ اور ثانیہ بی بی کو صاحب بلا رہے ہیں......"
انہوں نے سلام کرتے ہوئے ان دونوں کو پیغام دیا اور اس کے اثبات میں سر ہلاتے ہی
وا پلٹ گئے۔

"جب تک میں چائے بناتی ہوں تم اپنا حلیہ درست کر لو۔ ڈاکٹر علی، ہارون کے دوست ہیں۔
لعہ تمہیں دیکھیں گے۔" اماں وزیراں کے کہنے پر وہ کمرے میں آ گئی۔ اور پھر حلیہ قدرے
ر کر کے اماں کے ساتھ ہی زارون کے بیڈروم میں گئی تھی۔

"بس اب یہ سکون سے سوئے گا۔ اسے ڈسٹرب مت کیجئے گا ایک طویل اور بھرپو
کے لیے بہت ضروری ہے۔" وہ غالباً انجکشن لگا کر ہٹے تھے۔

"ارے واہ اماں! آپ تو ہمیں بس چائے کے کپ پر ہی ٹرخانا چاہتی ہیں جبکہ ہم تو
آس میں بھوکے ہی چلے آئے ہیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے اماں سے کہا جبکہ نظریں ان
میں کھڑی ثانیہ پر جا رکی تھیں۔

"یہ ثانیہ ہے۔" ہارون نے فوراً ہی تعارف کروایا۔

"ماشاء اللہ! زارون تو ہم سے بھی زیادہ خوش قسمت نکلا۔" انہوں نے پلٹ کر ہارو
تو وہ بے ساختہ مسکرا دیئے۔

"علی کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔" ہارون نے ثانیہ سے کہتے ہوئے علی ک
وضاحت کی۔

"ویسے ثانیہ بھابی! اس گھر میں میرا ایک دوست رہتا ہے ہارون گردیزی۔ اس کی کو
ہے آپ کو؟" اپنا سامان باکس میں رکھتے ہوئے علی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تو وہ ح
ہارون کو دیکھنے لگی جو علی کی بات پر زیرلب مسکرا رہے تھے۔

اب وہ بھلا اس بات کا کیا جواب دیتی کہ جس کا پوچھ رہے تھے وہ سامنے ہی تو بیٹھا

"مانا کہ دوست بن کر ہم سے ملنا انہیں گوارا نہیں مگر مریض بن کر ہمارے پاس آ
کوئی قباحت نہیں۔"

"میں آنا چاہ رہا تھا مگر وقت ہی نہیں مل سکا۔"

ہارون نے فوراً وضاحت کی۔

"صاحب! وقت تو ہر انسان کے پاس ایک جیسا ہی ہوتا ہے یعنی چوبیس گھنٹے، اور ا
وقت ملتا نہیں نکالنا پڑتا ہے۔ ہاں یہ اور بات کہ تم نے زندگی کے ہر ضروری اور غیر ضروری
میں اپنی ذات کو سب سے آخر میں رکھ چھوڑا ہے۔ اینڈ دس از ناٹ فیئر ہارون۔ انسانی ز
ازراں نہیں ہوتی شاید تمہیں احساس نہ ہو مگر بہر حال تمہاری ذات بہت سے لوگوں کے
اہم ہے۔" ڈاکٹر علی کی بات پر ثانیہ نے ہارون کو دیکھا۔ ان کی بے ترتیب سانسوں سے اند
جا سکتا تھا کہ ان کی طبیعت کس حد تک خراب ہو چکی ہے۔ اس پر رات بھر جاگنے کی وجہ
کی سرخی بے تحاشا بڑھ گئی تھی۔ وہ ابھی تک رات کے ملگجے سے شلوار سوٹ میں تھے جس
الٹے ہوئے تھے اور گریبان کے چند بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ثانیہ نے کبھی انہیں اس بے ترت

ا دیکھا تھا۔

"چلئے ذرا اپنے بیڈ روم میں۔ لگے ہاتھوں آپ کا چیک اپ بھی ہو جائے۔" ڈاکٹر علی نے
اٹھنے کا اشارا کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"ویسے میرا خیال ہے اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ لیکن لڑکی ثانیہ بھابی جیسی کیوٹ
چاہیے۔" وہ کہتے کہتے باہر نکل گئے تھے۔ ہارون بھی سست قدموں سے ان کے ساتھ ہو لیے
ان کے جانے کے بعد ثانیہ زارون کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

وہی معصومیت تھی، وہی بے خبری مگر شگفتگی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ رات کی بے پناہ اذیت
ار چہرے پر نمایاں تھے۔ سپید رنگت میں زردی غالب آ گئی تھی۔ ثانیہ نے بھیگا تولیہ لے کر
آہستگی سے اس کے چہرے پر پھیرا۔ نچلے ہونٹ پر خون کی پپڑی سی جم گئی تھی اسے بہت نرمی
اف کر کے بعد ان نے دوبارہ مرہم لگا دیا تھا۔ زارون ذرا سا کسمساتے ہوئے کراہا تھا۔ وہ
ل کر اسے دیکھنے لگی۔ مگر وہ دوبارہ بے سدھ ہو چکا تھا۔ ثانیہ غیر ارادی طور پر اسے دیکھے گئی۔

"انسان تین روز بخار میں رہے تو اس کے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور یہ جو اتنے
ے اس کرب میں ہے تو کانچ کے پیکر میں ڈھل گیا ہوگا۔" ایک لمحے کے لیے اس کے دل
وچ ابھری تھی۔ اب پھر بھی سکون سے سو رہا ہے مگر رات کس قدر اذیت اور درد سہا ہے اس نے
جب آنکھ کھولے گا تو پہلے کی طرح ہنستا مسکراتا ہوگا۔ نہ اپنی قسمت کو برا بھلا کہے گا نہ اپنی
ے خدا سے شکوہ کناں ہوگا۔

تو پھر ایسے معصوم اور پیارے انسان سے گریز اور اجتناب کیسے برتا جا سکتا ہے؟ اس سے
ت کیونکر کی جا سکتی ہے؟

اگر میں خفا ہوں، ناراض ہوں تو کس سے اور کیوں؟

خدا نے میری قسمت میں یہ ہی کچھ لکھا ہے تو میں اس فرشتہ صفت انسان سے کس چیز کا بدلہ
رہی ہوں؟

اس نے زارون کا بدن سرد ہوتے محسوس کیا تو اٹھ کر کمبل اسے اوڑھا دیا۔

"مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا زارون گردیزی کہ میں تمہیں اس نفرت میں حصہ دار بناؤں جو اس
رے سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔ تم تو محبت کے قابل ہو۔ صرف محبت کے، ایک خالص، سچی
ھری محبت ہی تمہارا اصل حق ہے کیونکہ تم خود ایسے ہو۔ بے غرض اور پاکیزہ محبت تم پر لٹائی جا سکتی
زارون اور میں ایسا کروں گی۔ کسی صلے کی تمنا کیے بغیر۔"

زارون کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے عہد کیا تھا اور پھر قدرے
اپنے کپکپاتے ہونٹ زارون کی سرد پیشانی پر رکھ دیئے تھے۔



اس دورے کے بعد زارون کئی دن تک مضمحل اور نڈھال سا رہا تھا اس لیے اس کے
نرس کا بندوبست کر دیا گیا تھا' مگر اس کے باوجود زارون کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی
نہ ہوئی تھی۔ ادھر ہارون کے چار روزہ بخار نے اماں وزیراں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

"پہلے دن ہی دوا لے لی ہوتی تو اب تک بھلا چنگا ہو گیا ہوتا۔ اب دیکھو ذرا سا ہو
ہے۔ چار دن سے اپنا کوئی ہوش ہی نہیں۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے یوں بستر پر پڑے دیکھ کر۔ گر
وا کس کو ہے؟" وہ سوپ بناتے ہوئے نم آلود آواز میں بول رہی تھیں۔ جب سے زارون
یہ سب ہوا تھا، بخار خواہ کیسا بھی معمولی کیوں نہ ہو یونہی دہلا کر رکھ دیتا تھا۔ اسی لیے تو جب
منیجر چند ضروری کاغذات پر سائن کروانے گھر آیا تو اماں اس سے بری طرح الجھ گئی تھیں۔
چارہ بے بھاؤ کی سننے پر گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ اور جب یہ اطلاع بذریعہ فون ہارون تک پہنچی
اماں وزیراں پر بگڑنے لگے۔ وہ بھی کان دبائے چپ چاپ سنتی رہیں اور جب ہارون کا سا
نکل گیا تو کمرے سے باہر آتے ہوئے اماں نے نہایت اطمینان سے کہہ ڈالا تھا۔

"ہارون میاں! وہ منیجر دوبارہ یہاں آیا تو میں تب بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کروں
نے جو کرنا ہو کر لینا۔" ان کے اس واضح اعلان کے بعد ہارون نے اور تو کیا کرنا تھا طبیعت
ہوتے ہی آفس کی طرف چل دیئے تاکہ منیجر کے دوبارہ گھر آنے کی نوبت ہی نہ آئے۔



"فار گاڈ سیک زارون! ابھی آپ جائیں یہاں سے۔ میں نے بتایا ناں کہ میں ایک
کام سے جا رہا ہوں۔ آپ کو فی الحال ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

ہارون کی بے حد جھنجلائی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی تو ان کے کمرے کے سامنے
ہوئی ثانیہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

"نہیں بھائیان! میں جاؤں گا آپ کے ساتھ۔"

زارون نے ضدی لہجے میں کہا۔ ثانیہ نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا، ہارون نے
سے کاغذات نکالتے ہوئے قدرے خفگی سے زارون کو دیکھا تھا اور پھر جیسے بمشکل خود پر قا
ہوئے بولے تھے۔

"زارون بیٹا! آپ صبح میرے ساتھ چلنا ہاں۔ آئس کریم بھی کھائیں گے اور شاپنگ بھی
گے۔ ٹھیک ہے نا؟" انہوں نے کاغذات بیڈ پر پھیلا کر یونہی سرسری نگاہوں سے دیکھے اور
فائل میں لگا کر دروازے کی طرف بڑھے مگر زارون نے عقب سے ان کا بازو دبوچ لیا

"میں ابھی جاؤں گا۔"

"شٹ اپ زارون۔" انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

"اب آپ نے مزید تنگ کیا تو میں بہت خفا ہوں گا۔ کہہ دیا ناں کہ آپ کہیں نہیں جا رہے۔"
ڈانٹ پر زارون سہم سا گیا تھا۔ ثانیہ کے سامنے ہارون کی پشت تھی سو وہ زارون کو دیکھ تو نہیں
مگر اسے معلوم تھا اس وقت اس کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔

"آپ آرام سے گھر میں بیٹھیں۔ مووی دیکھیں یا......"

"ہارون صاحب......! آپ......آپ پلیز زارون کو اس طرح مت ڈانٹیے۔" وہ انگلی اٹھا کر
ن کو تنبیہی انداز میں کہہ رہے تھے جب ثانیہ نے انہیں ٹوک دیا۔

"تو اور کس طرح سے ڈانٹوں؟" انہوں نے قدرے ناراض ہوتے ہوئے ثانیہ کو دیکھا جس
چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں تھے۔

"پچھلے بیس منٹ سے مسلسل ضد کر رہا ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ باہر لے کر جاؤں اور فی
ت میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ وہاں آفس میں بیسیوں لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں
کس طرح سے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟" انہوں نے اپنی مجبوری ظاہر کی تھی۔

"اگر آپ ایک بار اطمینان سے اسے بات سمجھا دیں گے تو وہ آپ کو بار بار تنگ نہیں کرے
ثانیہ نے گویا ان ہی کی بات ان کو لوٹائی تھی اور وہ لب بھینچ کر گلاسز کے پیچھے سے بس اسے گھور
رہ گئے تھے۔ تو گویا اب یہ انہیں بتائے گی کہ زارون کو کس طرح ٹریٹ کیا جانا چاہیے۔

"مجھے معلوم ہے میری اس گستاخی پر آپ کو غصہ آئے گا، لیکن اگر آپ زارون کو اس طرح
نٹیں گے تو میں خاموش نہیں رہ سکوں گی۔" انہوں نے ناک پر پھسل آنے والے گلاسز کو شہادت کی
سے ٹھیک کرتے ہوئے بغور اسے دیکھا، جس کے چہرے پر غصے کی ہلکی سی سرخی تھی اور جو
جھکائے بڑے احترام سے ان کی کلاس لے رہی تھی۔

"زارون کا مینٹل لیول کیا ہے اس بارے میں آپ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ وہ اتنی سمجھ
بوجھ نہیں رکھتا کہ آپ کے ماتھے پر پڑی تیوریوں کو دیکھ کر ساری بات سمجھ جائے۔ اس کو تو بہت

سہولت اور آرام سے ایک بات سمجھانی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود آپ اسے ایسے ڈانٹ ر
وہ کوئی بچہ ہو۔ ٹھیک ہے وہ ایک نارمل انسان نہیں مگر اس کی ذات اتنی ہی عزت و احترام کی
ہے جتنی کہ ہم سب کی۔'' کوئی اور وقت ہوتا اور ثانیہ کے بجائے کوئی اور ان کے سامنے کی
شاید اب تک وہ اسے کس کے تھپڑ رسید کر چکے ہوتے۔ مگر اب نجانے کیوں ان کے ہونٹوں
سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی جسے چھپانے کے لیے انہوں نے سر جھکا لیا مگر بدستور مسکراتے رہے

''اور ...... اور یوں بھی اگر ملازمین نے زاردن کے ساتھ آپ کا یہ سلوک دیکھا تو ثا
...... مجھے امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے مگر ......'' اسے غالباً احساس ہوا تھا کہ وہ ضرور
زیادہ بول گئی ہے اس لیے ایک دم ہی خاموش ہوگئی تھی۔

''آؤ زاردن! ہم چلتے ہیں اپنے کمرے میں۔'' وہ زاردن کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلی گئی تو
کے جانے کے بعد وہ کھل کر مسکرا دیئے تھے۔

''ڈیٹیس لائیک آ گڈ گرل۔ یہ ہی تو وہ رویہ ہے جس کی میں تم سے خواہش رکھتا تھا
اسی وقت اپنی چیز کی حفاظت کرتا ہے جب اس کے دل میں اس چیز کی ملکیت کا احساس جا
زاردن کے لیے میرے مقابل آ کھڑی ہوئیں۔ آئم تھینک فل ٹو یو اینڈ تھینک گاڈ۔'' مسکراہ
کے احساس کی صورت ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکلے ا
سے آتی اماں کو روک کر کہنے لگے۔

''ثانیہ اور زاردن سے کہیے وہ تیار ہو جائیں۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم لوگ باہر گھومنے
ہیں۔''



وہ سو کر اٹھی تو آخیر اکتوبر کی سرمئی شام موسم کی تمام تر خوبصورتی کو اپنے اندر سمیٹے ہو
سیاہ بادلوں سے ڈھکا آسمان جیسے برس جانے کو تیار تھا۔ ہوائیں سرشار ہو کر درختوں سے الجھ
رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی سے ایک نظر باہر کے موسم کا جائزہ لیا اور پھر نہانے چلی گئی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال سلجھاتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا دل بننے سنور
تھا۔ موسم کی خوبصورتی کا اثر غالباً دل پر بھی ہوا تھا۔ اس نے نہایت جھجکتے ہوئے ڈیپ ریڈ کلر
اسٹک اٹھا کر ہونٹوں پر لگائی تو وہ اپنے چہرے پر بہت اجنبی سی لگی۔ شادی والے دن کے
غالباً اس نے پہلی مرتبہ میک اپ کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا تھا۔ مگر آئینے میں اپنا آپ اتنا عجیب
اس نے دوبارہ کسی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''اور پھر فائدہ بھی کیا ہے؟ کس کے لیے یہ بننا سنورنا؟ ان سیاہ آنکھوں میں میرے لیے
ابھرے گی نہ حسن کو سمیٹ لینے کی بے پناہ خواہش۔ وہ تو مجھے بھی ان ہی نظروں سے دیکھتا
ہے اماں وزیراں کو، دینو بابا کو یا ہارون کو۔''

وہ گلاس ونڈو سے پرے برستی پھوار کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خود پر ترس آیا
ں میں کوئی بے نام سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی تھیں۔ وہ سست روی سے چلتے ہوئے باہر لان
ئی۔ بارش کے باریک قطرے موتیوں کی صورت اس کے بالوں میں اٹکنے لگے تھے۔

''ثانیہ! ثانیہ!'' زاردن اسے پکارتا ہوا اس تک آیا تو وہ اپنی سوچوں کو انتہائی فضول قرار دیتے
سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ نجانے کب سے لان میں گھوم رہا تھا۔ اسی لیے کافی
بھیگ گیا تھا۔

''ارے ...... یہ کیا؟'' اس کے نزدیک آ کر وہ جس طرح ٹھٹکا تھا اور جس حیرت سے اس کے
ں کی طرف اشارا کیا تھا، ثانیہ بری طرح جھینپ گئی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے ٹالا اور اس کی طرف سے رخ موڑ کر گلاب کا پھول توڑنے لگی۔

''یہ کس لیے توڑ رہی ہو؟'' اس نے ثانیہ کے کندھے پر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے لیے۔'' ثانیہ نے ٹہنی پر سے اضافی پتے اور کانٹے اتارتے ہوئے پھول اس کی
بڑھا دیا۔

''میرے لیے۔'' اس کی آنکھوں سے مسرت آمیز استعجاب چھلکا تھا۔ پھول ہاتھ میں لے کر
پور انداز میں مسکرا دیا تھا۔

''ہوں۔'' ثانیہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پھول سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' ثانیہ کو اس کا انداز عجیب سا لگا تھا۔

''ثانیہ تم ......'' وہ دو قدم آگے بڑھ آیا تھا۔

''تم بہت اچھی ہو۔''

''بہت اچھی ہو۔'' وہ غالباً اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ ثانیہ نے قدرے الجھ کر
تو وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔

''تم سچ مچ بہت اچھی ہو۔'' اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر انگلی کی پوروں سے اس کے ہونٹوں کو
سے چھو کر گویا رنگ کو محسوس کرنا چاہا تھا۔ اس کا انداز بہت معصوم، بہت بے ضرر تھا مگر
میں......

"تم اسے اپنی محبت دو اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا اس کی آنکھیں محبت کا جواب دیتی ہوئی محسوس ہوں گی۔" ہارون کی آواز سماعتوں میں گونجی تھی۔ وہ بس ا اس کی سیاہ آنکھوں میں دیکھ پائی تھی۔ دل ایک بار پوری قوت سے دھڑکا تھا۔ اس کی آ بے تحاشا چمک کے ساتھ موسم کی نمی بھی اتر آئی تھی۔ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے ا زارون کو دیکھا اور پھر پلٹ کر بھاگتی چلی گئی۔ اس کے پیچھے لان میں تنہا کھڑا زارون بھیگتے ہوئے اپنی شفاف آنکھوں سے کبھی ثانیہ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی ہاتھ میں پکڑے گلاب

"تم بہت اچھی ہو ثانیہ۔" گلاس ونڈو میں کھڑی ثانیہ نے اپنی بے ترتیب سانس کرتے ہوئے زارون کو بڑبڑاتے دیکھا تھا اور پھر کھڑکی سے سر ٹکا کر کھل کے مسکرا دی تھی



جس شخص نے صدیوں پیاس کا ذائقہ چکھا ہو، اسے سیراب ہونے کے لیے سمندر ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ قطرے میں ہی قلزم تلاش کرتا ہے۔ ثانیہ بھی زارون کی ذرا ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

زارون اسے اہم جاننے لگا تھا۔ اسے ان لوگوں پر فوقیت دینے لگا تھا جو ہمیشہ ا رہتے آئے تھے۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہتا تھا۔

وہی بے تکی سی باتیں جن کا نہ سر ہوتا تھا نہ پیر، معنی و مطالب سے عاری باتیں۔

مگر ثانیہ کو ان باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

اسے کوفت محسوس ہوتی تھی نہ بیزاری۔

اس روز وہ اسٹڈی روم میں کچھ کتابیں دیکھ کر باہر نکلی تو اماں وزیراں لاؤنج میں اونگھ رہی تھیں۔

"اماں! زارون کدھر ہے؟" اس نے وہیں ریلنگ پر جھکے جھکے پوچھا۔

"معلوم نہیں بیٹی! شاید باہر لان میں ہے۔"

"ذرا دیکھیے تو...... صبح سے صرف دودھ پی رکھا ہے۔ دوپہر کے کھانے میں تو ابھی میرا خیال ہے، میں اس کے لیے فروٹ چاٹ بنا دیتی ہوں۔ آپ پلیز اسے بلا لائیے۔"

"اچھا بیٹی۔" وہ اٹھ کر لان میں آ گئیں۔ وہاں زارون مالی سے کہہ کر رنگ بر گلدستہ بنا رہا تھا۔

"لیکن بیٹا! اس کا کیا کرو گے؟" مالی بابا نے گلدستہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے

"ثانیہ کو دوں گا۔" اس کے فوری جواب پر مالی بابا اور اماں بے اختیار ہنس دیئے تھے۔

"ماشاء اللہ بڑی ہی نیک دل بچی ہے۔ بڑے حوصلے اور صبر والی۔ زارون میاں کا تو بہت رکھتی ہے۔" اماں وزیراں کے دل میں ثانیہ کے لیے محبت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"بس آپا وزیراں! اللہ جس کے دل میں چاہے رحم ڈال دے ورنہ کیا بچی کا دل نہیں چاہتا ہوگا زارون میاں بھلے چنگے ہوتے۔ اس کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے۔ اس کے لیے کما کر لاتے مگر بن ہے بھئی انسانیت کا حق ادا کر دیا ثانیہ بی بی نے ......" مالی بابا کے لہجے میں ثانیہ کے لیے تھی۔ اماں وزیراں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی واپس آ گئی۔

"اماں! ثانیہ کہاں ہے؟" زارون اپنے بیڈروم سے باہر آ رہا تھا۔

"وہ اسٹڈی روم میں ہیں بیٹا۔" اماں نے بتایا تو وہ دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اماں میں آ گئیں اور وہاں ثانیہ کو مصروف دیکھ کر سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

"اے لو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم یہاں ہو گی۔ زارون بے چارہ تمہیں ڈھونڈنے اوپر گیا ۔ جاؤ تم ذرا اس کی بات سن لو۔" انہوں نے چھری اور سیب اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"ثانیہ...... ثانیہ!" وہ سنک میں ہاتھ دھو رہی تھی جب زارون نے اسے زور زور سے آوازیں شروع کر دیں۔

"آ رہی ہوں بھئی۔" وہ فوراً ہی کچن کے دروازے تک آئی۔

"ثانیہ۔" وہ گلدستہ سامنے کرتے ہوئے چہکا تھا۔

"ارے...... یہ کہاں سے لیا؟" وہ مسرت حیرت کے ساتھ آگے بڑھی۔

"یہ میں نے تمہارے لیے......" وہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اترنے کے لیے آگے بڑھا اور پھر یکدم ٹھٹک گیا۔ آنکھیں جھپک جھپک کر ثانیہ کو دیکھا اور پھر پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے کے بعد دوبارہ ل گیا۔

"ثانیہ!" اس کی آواز میں گھبراہٹ سی تھی۔

"کیا بات ہے زارون؟" دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتی ثانیہ چونک گئی۔

اس کی ہوشیار نظروں نے اتنے فاصلے سے بھی زارون کے بے رنگ ہوتے چہرے کو جانچ لیا تھا۔ زارون کی سپاٹ نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جم گئی تھیں اور ان سے جھلکتا ہر تاثر لمحہ بہ لمحہ غائب ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"زارون...... زارون کیا ہو رہا ہے تمہیں؟" وہ اس کی طرف لپکی تھی اس کی آواز پر زارون

لمحہ بھر کے لیے روہانسے انداز میں چلایا تھا۔

"ثانیہ...... ! ثانیہ......!" زارون کے جسم نے ہلکی سی جھرجھری لی تھی۔ ثانیہ بجلی کی
سے درمیانی فاصلہ عبور کرتی سیڑھیوں تک پہنچی تھی مگر پھر بھی اسے دیر ہو چکی تھی۔ زارون نے
زور سے دو چار جھٹکے کھائے تھے اور اگلے ہی لمحے وہ لہراتا ہوا سیڑھیوں پر گرا تھا اور لڑھکتا
زارون کے ساتھ ساتھ ثانیہ کی فلک شگاف چیخوں نے گویا گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔

"زارون...... زارون......" اس نے متوحش ہو کر آخری سیڑھی پر ساکت وصامت
زارون کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"ہائے میں مرگئی......" زارون کے سر سے بھل بھل بہتے سرخ خون کو دیکھ کر اماں
نے اپنا آپ پیٹ لیا تھا۔

"اماں......! یہ کیا ہو گیا......؟ اماں......! کچھ کرو...... کسی کو بلاؤ...... زارون......!"
اس کے سر سے بہتے خون کو اپنے دوپٹے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ پاگلوں
چیخی تھی۔ اس کا رنگ دھلے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ ہونٹ بے رنگ ہو گئے تھے۔ اماں
نے رو پیٹ کر گھر کے ملازمین کو اکٹھا کر لیا تھا۔

"ہارون صاحب کو فون کریں۔ بی بی! ہارون صاحب کو بلائیں۔" نجانے کس ملازم
ہوش کھوتی ثانیہ کو جھنجھوڑا تھا۔ اماں نے فوراً آگے بڑھ کر زارون کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔
چیخوں کا گلا گھونٹتی فون کی طرف لپکی۔

"نمبر...... نمبر بتاؤ۔ ہارون کا نمبر کیا ہے......؟ ریسیور ہاتھ میں لے کر وہ بے دم ہو
گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ دینو بابا نے نجانے کہاں سے ڈھونڈ کر اس کے سامنے ایک کارڈ
اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو رگڑتے ہوئے نمبر پڑھا۔
گھبراہٹ اور اچانک پڑنے والی افتاد نے اس طرح ہراساں کیا ہوا تھا کہ بے جان انگلیاں
پریس کرنے میں بھی ناکام ہو رہی تھیں۔"

"لائیے بی بی! میں ملاتا ہوں۔" کسی ملازم نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
ریسیور اس کے ہاتھ میں دے کر خود دوبارہ زارون کی طرف بھاگی تھی۔ جسے صوفے پر لٹا دیا
بہتے خون نے اس کے چہرے اور شرٹ کو بھی لال کر ڈالا تھا۔

اماں وزیراں اس پر جھکی دوپٹے سے اس کا چہرہ پونچھ رہی تھیں۔ دینو بابا متواتر پانی
منہ پر ڈال رہے تھے مگر اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی تھی۔

"پیچھے ہٹ جائیں۔ پیچھے ہٹ جائیں۔" کسی اجنبی نے اچانک ہی دھاوا بول دیا تھا۔ اماں
ثانیہ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے ملازم کی مدد سے زارون کو اٹھا کر باہر کھڑی گاڑی میں ڈالا۔

"میں ساتھ جا رہا ہوں بی بی! ہارون صاحب کو بتائیے گا ڈاکٹر علی کے ہاسپٹل میں لے جا رہے
"نہایت عجلت میں اطلاع دیتا ہوا یہ اشرف تھا جس نے بروقت اپنی عقل کا استعمال کرتے
ساتھ والے گھر سے مراد صاحب کو بلایا تھا۔

"میں بھی ساتھ جاؤں گی۔" وہ ننگے پاؤں پیچھے بھاگی تھی کہ دینو بابا نے اسے تھام لیا۔

"ثانیہ بیٹی! ہارون میاں کا انتظار کر لیں۔" وہ ان کی بات سنے بغیر باہر لپکی تھی مگر تب تک
فل اسپیڈ سے گیٹ کراس کر چکی تھی۔

"اماں!" اس نے انجانے خدشوں سے نڈھال ہوتے ہوئے اماں کے کندھے پر سر رکھا تو
پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی۔

ہارون گاڑی تیزی سے گھر کی طرف بھگائے جا رہا تھا۔ جب مراد صاحب کی کال اس نے
پر ریسیو کی اور پھر گھر جانے کے بجائے راستے ہی سے اس نے گاڑی کا رخ ڈاکٹر علی کے
کی طرف موڑ دیا تھا۔ ان کے اندرونی اضطراب کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا
جب وہ کئی سگنل توڑ کر ہاسپٹل تک پہنچے تو ایک گاڑی سے ٹکر ہونے کے بعد ان کی گاڑی کی ہیڈ
ٹوٹ چکی تھی۔ اشرف اور مراد صاحب انہیں کوریڈور میں ہی مل گئے تھے۔ ڈاکٹر علی کی بدولت
کارروائی مکمل کر کے زارون کو آئی سی یو میں لے جایا جا چکا تھا۔

بند دروازے کے پیچھے معلوم نہیں کیا ہو رہا تھا۔ وہ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے وہیں بینچ پر ٹک گئے
ان کا دل جیسے ایک جگہ ٹھہر سا گیا تھا۔ ذہن ایک دم خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ ہاسپٹل کا سرد سا
ل ان کے اعصاب کو منجمد کیے دے رہا تھا۔

تقریباً ڈھائی، تین گھنٹے کے جاں لیوا انتظار کے بعد ڈاکٹر علی نے ڈاکٹر بختیار کے آفس میں
رکھا تو ہارون برق رفتاری سے اٹھ کر ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر علی کا چہرہ اترا
تھا اور انہوں نے ہارون کو دیکھتے ہی نظر چرا لی تھی۔

"علی......! زارون......؟" ان کی آنکھوں میں بے شمار سوال ابھرے تھے۔

ہزار ہا اندیشوں میں امید کا ٹمٹماتا ہوا چراغ، ان کی آنکھ میں روشن تھا۔ ڈاکٹر علی خاموشی سے
کے پاس سے گزرے اور پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

"علی! میں تم سے زارون کا پوچھ رہا ہوں۔" انہوں نے تڑپ کر علی کا بازو پکڑ کر اپنی طرف

گھمایا تھا۔ ڈاکٹر علی چند لمحے ان کے چہرے پر امید اور نا امیدی کے یکساں تاثرات کو د
اور پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہم چاہنے کے باوجود اسے نہیں بچا سکے۔" علی نے بہت ہولے سے پھونک ٹمٹماتے چراغ کو بجھایا تھا جس کے بعد اندھیرا یکلخت ہی بڑھ گیا تھا۔

"علی ......!" ہارون کا ہاتھ ان کے پہلو میں گر گیا تھا۔ اور دھڑکنیں یقینی و... درمیان پتھر ہو گئی تھیں۔

"صاحب...... صاحب......! زارون بھائی ہمیں چھوڑ گئے......" اشرف نجا... آیا تھا اور روتے ہوئے ان کے وجود سے لپٹ گیا تھا۔ وہ ایک دم لڑکھڑا کر کرسی پر گر گئے

"حوصلہ میرے یار......!" علی فوراً آگے بڑھ آئے تھے۔

"اللہ کے معاملات میں کون دخل دے سکتا ہے۔"

"جو خدا کو منظور۔" ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں انہیں دلاسا دے رہا تھا۔ انہوں... ہتھوں کو سختی سے دبوچ کر خود پر ضبط کرنا چاہا مگر زارون کا ہنستا کھلکھلاتا۔ روشن چہرہ ان کی سامنے آ کر ٹھہر گیا تھا اور آنسو ایک لکیر کی صورت ان کی بے یقین آنکھوں سے بہتے چلے



ثانیہ کتنی ہی دیر سے آخری سیڑھی پر بیٹھی تھی اور اس کی منتظر نگاہیں کبھی درواز... کبھی فون پر۔ اماں وزیراں جائے نماز سنبھالے بیٹھی تھیں۔ پورے گھر میں عجیب سی ... ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بے چین دل کے ساتھ اٹھ کر کچھ دیر ادھر ادھر چکراتی رہی ... گزرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

اماں نے تسبیح کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو وہ بے... اٹھی۔

"ہارون صاحب کو فون کر دینا چاہیے تھا۔" اماں نے اس کی بات سن کر اثبات میں ... خاموش رہیں اور اسی خاموشی کے دوران دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ دونوں بری طرح چونکی

"ارے...... کیا ہے میرا بچہ؟" اماں وزیراں، ہارون اور ان کے پیچھے ڈاکٹر علی کا... ان کی طرف لپکی تھیں۔ ثانیہ نے خود میں کرسی سے اٹھنے کی ہمت نہ پائی تھی۔ ہارون کا... بے تحاشا سرخ ہوتی آنکھیں۔ لرزتے کانپتے ہونٹ۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے سب کچھ کہ...

"ہائے میں مرگئی۔ میرا بچہ......!" اماں نے گیٹ سے اندر آتی ایمبولینس دیکھ کر...

...رے تھے۔ ثانیہ گم صم سے انداز میں انہیں دیکھتی رہی۔

"ثانیہ! ہم لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔" ان کا بوڑھا دل اس غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

"ہمارا کھلونا ہم سے چھن گیا ثانیہ! ہم خالی ہاتھ رہ گئے۔" اماں نے ثانیہ کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس ...ئوں میں بھری چوڑیوں کو توڑ ڈالا تھا۔ اس کی ہونٹوں سے لپ اسٹک رگڑ ڈالی۔ جب وہ ...ہن کر اس گھر میں آئی تھی تو کوئی رسم نہ ہوئی تھی اور اب سہاگ لٹ گیا تھا تو سب ہی رسمیں ...جا رہی تھیں۔ اس کے اندر باہر ٹھنڈی ٹھار برف گرنے لگی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ اٹھی تھی اور ...ے انداز میں چلتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس جا رکی تھی۔ یہاں سے وہاں تک ہر رنگ کے ...رے پڑے تھے۔

"یہ پھول زارون میرے لیے لایا تھا۔" وہ آہستگی سے بڑبڑائی تھی اور ایک ایک پھول اٹھا کر ایک بکھری ہوئی پتی کو چوم کر اپنے خون آلود آنچل میں رکھتی جا رہی تھی۔

خون بھی اسی کا تھا اور تحفہ بھی۔

وہ ڈگمگاتے قدموں سے چلتی ہوئی باہر لان میں آ گئی جہاں زارون کی میت رکھی جا چکی تھی۔ ...تے دیکھ کر کسی نے چہرے سے سفید چادر ہٹا دی تھی۔

نور کے ہالے میں چاند بے خبر تھا۔

اس نے ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما اور ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔

وہ ازلی معصومیت کے ساتھ ابدی نیند سو رہا تھا۔ ماورائی خوشبو میں لپٹا وجود......

"ان ہونٹوں نے آخری بار مجھے پکارا تھا۔ ان آنکھوں نے آخری بار مجھے دیکھا تھا۔ ان سانسوں آخری تحفہ میرے نام کا تھا۔" وہ اس کے ایک ایک نقش کو دیکھتی رہی۔ پھر آنچل میں سمٹے ...اس پر نچھاور کیے اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

"ثانیہ! تم بہت اچھی ہو۔" اس کے تعاقب میں آتی آواز ہولے ہولے اس کے دروازے پر ...دیتی رہی۔



اور پھر...... نجانے کتنا وقت بیت گیا، زارون کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ غم کا وہ پہاڑ جس ...ابھر کے ان کا خیال تھا کہ بس چند ہی لمحے وہ مزید جی سکیں گے، وقت کے تیشے نے ذرہ ذرہ پہاڑ کو سرکا دیا تھا اور وہ سب ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے تھے، زندگی بتانے کو کہ جو گھاؤ تھے ...اب تا عمر اپنے سینے میں ... رکھنا تھا انہیں ... سے دربدر کرنے کی سکت تھی نہ

خواہش۔ سو رفتہ رفتہ سب کچھ اپنے معمول پر آتا چلا گیا مگر ایک واضح تغیر کے ساتھ۔

ہارون آفس جانے لگے تھے مگر اتنی خاموشی سے کہ ان کی آمد کی خبر ہوتی نہ روانگی
وزیراں کی ہمہ وقت نم رہنے والی آنکھیں خشک ہوگئی تھیں مگر اٹھتے بیٹھتے ایک آہ ان کے لبوں
رہتی تھی۔

ثانیہ جو طویل عرصے تے اپنے کمرے میں بند رہی تھی، اب رات کے کسی پہر عقبی
ٹہلتی نظر آنے لگی تھی۔

اس تمام عرصے میں تائی اماں اسے دوبارہ اپنے ساتھ لے جانے آئی تھیں، مگر اس
کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جس پر تائی اماں کو غصہ آ گیا تھا۔

"اے جس کے نام پر تم یہاں آئی تھیں جب وہی نہ رہا تو تم یہاں کیا کرو گی؟ کس
میں رہو گی اس گھر میں؟"

"اس گھر میں میری حیثیت کے تعین کے لیے زارون کا نام ہی کافی ہے لیکن ا
دیواریں سکڑنے لگیں اور اس گھر کی زمین مجھ پر تنگ پڑ گئی تو میں کسی دارالامان میں پناہ
کسی فٹ پاتھ پر زندگی گزاروں مگر آپ جیسے گھٹیا، کم ظرف اور حریص لوگوں کے درمیان
نہیں آؤں گی۔" اس کے زہر خند لہجے پر انہیں پتنگے لگ گئے تھے۔ لمحے بھر میں انہوں
احسانات کی ایک فہرست گنوا دی تھی۔

"ارے ہاتھ بھر کی تھیں تم جب تمہارا باپ مر گیا اور تمہاری طوائف ماں روتی بلکتی تم
کر اس گھر کی دہلیز پر آئی تھی۔ خود تو مر گئی تمہیں چھوڑ گئی ہمارے ذمے داری پر۔ جن مصیبتوں
میں نے تمہیں پالا، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ اور آج ہم گھٹیا، کم ظرف ہو گئے۔ حریص ہو گئے

"آپ نے مجھے پالا نہیں تھا۔ میں تو اپنے آپ پل گئی تھی۔ زمین پر کیچوے کی طرح
گھسٹ کر۔ کسی بھکاری کی طرح کھاتے ہوؤں سے دو نوالے مانگ کر۔ کسی ملازمہ کی طرح
سب کی اترن پہن کر۔ اپنی خواہشوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا مار کر میں نے اپنے ماں باپ
کا خراج ادا کرنا چاہا مگر میرے قصور پھر بھی معاف نہیں ہوئے۔" وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی
سے دبا ہوا لاوا بہہ نکلا تھا۔

"ہاں اتنا کرم ضرور کیا آپ نے کہ مجھے ایک چھت دے رکھی تھی، لیکن اس ا
بدلے میں کیا کچھ وصول نہیں کیا آپ نے، میری عزت نفس، میری انا، میری خودداری
چھینا آپ نے، بیس سالوں میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جس پر صرف ایک صرف میرا ا

ی ملازمہ تھی اور میں اس گھر کی فرد مگر وہ مجھ سے بہتر زندگی گزارتی تھی۔ اس کے تو کام کے
قرر تھے، اسے ہفتے میں چھٹی بھی ملتی تھی وہ اپنے کام کی اجرت وصول کرتی تھی مگر مجھے کیا ملتا
چوبیس گھنٹے کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی تھی، ان بیس سالوں میں کسی شدید بیماری کے سوا
م کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور اس ساری خدمت کے عوض مجھے کیا ملتا تھا؟ گالیاں
طعنے، اور اب آپ چاہتی ہیں میں دوبارہ اسی جہنم میں چلی جاؤں، ایک بلینک چیک بن کر
بوقت ضرورت آپ اپنی خواہش کے مطابق رقم بھر سکیں۔ نہیں، اب ایسا کچھ نہیں ہوگا جو
ہیں گی۔" اس کی آواز غم و غصے کی شدت سے پھٹ گئی تھی۔ اماں وزیراں نے لپک کر اسے
ں میں سمیٹ لیا۔ کیا کچھ بیتا تھا اس لڑکی پر مگر اس نے کبھی اس بارے میں انہیں ایک لفظ
یا تھا۔

رون جو یہ سب باتیں سن کر گنگ سے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اماں کو اسے کمرے میں لے
اشارا کیا اور خود تائی اماں کو دوبارہ یہاں آنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔

"وہ اس گھر کی عزت ہے اور اس کے بارے میں سوچنا اب ہمارا کام ہے۔"

رون کا استحقاق بھرا لہجہ انہیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا مگر آخر کار انہیں وہاں سے ناکام واپس
تھا۔



آسمان گزشتہ کئی روز سے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا جو نہ برستے تھے اور نہ سورج بادشاہ کو آزاد
تیار ہوتے تھے، موسم کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اماں وزیراں سرد موسم سے گھبرا
نام ہی اپنے کمرے میں گھس گئی تھیں۔ ثانیہ کمرے کی سپاٹ دیواروں کو تکتے تکتے اکتا گئی تو
آئی۔ برآمدے کے سنگی ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک طویل سانس لے کر
لو دیکھا جو اب بھی بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور جس کی بدولت رات کا اندھیرا مزید گہرا ہوتا جا

"میرا وجود ایک بے کنار صحرا میں ڈھل چکا ہے اور میں اپنی ہتھیلیوں پر اپنے ہی وجود کو سجائے
ر کے حوالے کر رہی ہوں۔ اے پروردگار! اور تو کچھ نہیں چاہیے۔ بس چھت بھر آسمان اور
بھر زمین اور تو کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں۔" خنک ہوا اس کے چہرے سے آ کر ٹکرائی تھی۔
سا چونک گئی۔

بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور لان ہلکی پھوار میں بھیگ رہا تھا۔ بارش کے ننھے ننھے قطرے

درختوں کے چوڑے پتوں سے ٹکرا کر خفیف سا شور پیدا کر رہے تھے۔ اس نے ایک نظر بھیگے گیٹ وے پر ڈالی اور پھر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ وے پر آ گئی۔ نم آلود ہوا کی شدت تھی مگر اس کے باوجود بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مٹی کی خوشبو میں رچی بسی پھولوں کی محسوس کرتے ہوئے وہ گیٹ تک آئی تو چوکیدار بھاگ کر وہاں آیا تھا۔ اس کے اشارے کھولتے ہوئے چوکیدار کے چہرے پر حیرت در آئی تھی مگر وہ بولا کچھ نہیں تھا، وہ چپ چاپ سے باہر آ گئی۔ نہ جانے کیوں ذہن و دل اس وقت آزادی کے خواہاں ہو رہے تھے۔ چار اسے کھلنے لگی تھی۔ سو وہ یونہی چپ چاپ اس طویل اور خاموش سڑک پر چلتی رہی۔ سردی کی لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے وہ گھروں کے شفاف دریچوں سے چھنتی روشنی رہی۔ اپنے ہی قدموں کی چاپ اور بارش کی غیر محسوس سی کن من کو سنتے ہوئے وہ چلتی رہی رات نے جیسے پورے ماحول کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ تب ہی سامنے سے ایک گاڑی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی چند سیکنڈ کے لیے اس کے وجود کو روشنی میں نہلا گئی تھی۔ اس نے کنارے پر ہو کر گاڑی کو گزر جانے دیا اور خود آگے ہی آگے بڑھتی رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر غیر حاضر تھی کہ عقب میں گاڑی کے رکنے، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز کو سن ہی نہ پائی اس وقت جب کوئی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا تھا۔

''آپ ......؟'' اس نے گردن موڑ کر برابر چلتے ہارون کو دیکھا تو ٹھٹک گئی۔ الیکٹرک زرد روشنی میں اس نے بغور ان کے بالوں میں اٹکے بارش کے باریک قطروں کو دیکھا تھا۔

''ثانیہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو، اور پھر اس موسم میں؟'' ثانیہ نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ یقیناً کافی دور نکل آئی تھی۔ اس نے کوئی جواب دیئے بغیر موڑ کاٹ لیا تھا۔ چند لمحو دونوں نہر کے پل پر سے گزر رہے تھے، پانی کی سطح سیاہ تھی، مگر لہروں کا ہلکا ہلکا شور پر سکو غیر محسوس سی شکنوں کا جال بچھا رہا تھا۔

''ثانیہ! تم ...... تم ...... زارون سے محبت کرنے لگی تھیں ہے نا؟'' کوٹ کی جیبوں ڈالتے ہوئے ہارون نے ثانیہ کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

''میرا خیال ہے، ہم سب ہی اس سے محبت کرتے تھے۔''

''تمہیں اس کے جانے کا بہت دکھ ہوا نا؟'' انہوں نے اس کی سیدھی اور شفاف نظریں جما دیں۔

''آپ اس چڑیا کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کی آنکھوں کے سامنے اس کا

ی رک کر ان کی آنکھوں میں دیکھا تھا جہاں ہلکی سی دھند کا پہرہ تھا، ہارون ثانیہ پر سے ر سامنے دیکھنے لگے تھے۔

ر دنیا میں نہیں مگر ہمارے دلوں میں ہمیشہ رہے گا۔ تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا اس

گہری سانس خارج کرتے ہوئے انہوں نے قدم بڑھائے تھے۔

ت کبھی بھی میرے سوچوں کی محتاج نہیں رہی ہارون صاحب! اسے جو کرنا ہو، وہ کر اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ ...... میں کیا چاہتی ہوں ......؟''

ی نظریں بے اختیار ہارون کی طرف اٹھ کر جھک گئی تھیں۔ قریب سے کوئی گاڑی گزری ہ کا آخری جملہ اس شور میں دب کر رہ گیا تھا۔ وہ چلتے ہوئے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے تھے۔ یہاں موسم اور ہلکی بارش سے بے نیاز لوگوں کی وجہ سے کافی ہلچل اور رونق سی محسوس ہارون اسے ساتھ لے کر اندر چلے آئے، باہر کی نسبت اندر کا ماحول کافی گرم تھا۔ کھڑکی کے پاس والی میز سنبھال لی۔ کافی کا آرڈر دے کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ پر چہرہ رکھے وہ باہر کے ماحول میں پوری طرح گم تھی اس ماحول سے قطعاً لاپروا اور بے جس میں وہ بیٹھی تھی۔ انہوں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں باہر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ دکانوں کے شوکیسوں اور نیون سائن سے پھوٹتی روشنی کی کرنیں گیلے فٹ پاتھ پر منعکس ہو جہاں ایک بوڑھی فقیر عورت دن بھر کی ریزگاری گن رہی تھی۔

''ثانیہ!'' انہوں نے اچانک ہی کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے دوٹوک انداز میں اسے پکارا تو وہ انہیں دیکھنے لگی۔

''تمہیں یاد ہے، ایک بار تم نے کہا تھا۔'' میں اس گھر میں ہمیشہ کے لیے رہنے کا فیصلہ کر چکی ''وہ اسے یاد دلاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکے تھے، تب ہی ویٹر ان کے سامنے کافی کے رکھنے لگا۔ چند منٹ دانستہ خاموش رہ کر انہوں نے ویٹر کو واپس جانے دیا تھا۔

''تو کیا آپ کو اس فیصلے سے اختلاف ہے؟''

''ہرگز نہیں ...... میں آج بھی تمہاری زبان سے یہ ہی فیصلہ سننا چاہوں گا' ہاں مگر یہ بھی چاہتا ہے کہ اب حوالہ بدل دیا جائے۔'' انہوں نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے ایک نظر اسے [illegible]

''پہلے تم نے یہ بات زارون کے حوالے سے کہی تھی، میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حوالے سے بھی تمہارا فیصلہ ... ہو گا۔'' ثانیہ نے کافی کا مگ میز پر رکھتے ہوئے اپنے بے

جان ہاتھوں کو میز پر ٹکا دیا تھا۔

"تم نے اپنی تائی اماں سے کہا تھا کہ اس گھر میں تمہاری حیثیت کے تعین کے لیے
نام ہی کافی ہے......لیکن غالباً لاشعوری طور پر ہی تم نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا تھا
زمین تم پر تنگ پڑ سکتی ہے۔ میری شدید خواہش ہے ثانیہ! کہ تم میرے نام سے اپنی
حیثیت کا تعین کرو۔"

انہوں نے باہر تیز ہوتی برش سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھور

"میں تمہیں کسی بھی خوف، اندیشے اور خدشے کے بغیر ایک خوبصورت اور روشن
پیش کش کر رہا ہوں ثانیہ اور چاہتا ہوں کہ اب کی بار فیصلہ تم کرو......قسمت کے ہر فیصلے
ہو کر صرف وہ کرو جو تم چاہتی ہو......ثانیہ! کیا تم سن رہی ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟" ا
نہ ہونے پر وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

ثانیہ جواباً کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے یقیناً فیصلے
وقت چاہیے تھا۔ وہ بھی بل دے کر کے اس کے پیچھے چل دیے۔ ریسٹورنٹ سے باہر
سرد ہوا کا جھونکا ثانیہ کے شال اور سوئٹر سے بے نیاز جسم سے ٹکرایا تو وہ بے اختیار جھرجھری
گئی تھی، جسے محسوس کرتے ہوئے ہارون نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے کندھے پر ڈال دیا
احتجاج کے بغیر کوٹ میں سمٹ گئی تھی۔ جیسمین کی دلفریب مہک نے اسے ہولے سے
میں لے لیا تھا۔

گیلے فٹ پاتھ پر زرد روشنیوں میں قدم بڑھاتے ہوئے ثانیہ اچانک رک گئی تھی۔
ہی سوچوں میں گم چند قدم آگے بڑھ گئے اور پھر پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ اس بوڑھی
کے پاس جا بیٹھی تھی، کوٹ کی جیب سے استحقاق بھرے انداز میں والٹ نکال کر کھولتے
نے کتنے ہی سرخ و سبز نوٹ نکال کر اس بوڑھی عورت کے ہات پر رکھ دیے تھے۔

"دعائیں پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتیں، لیکن پھر بھی تم میرے لیے دعا کرنا، ا
نئے راستے پر قدم رکھ رہی ہوں۔" ہارون نے ثانیہ کو کہتے سنا اور پھر فٹ پاتھ پر جم
قدم جماتے ہوئے چلنے لگے۔ ثانیہ بھاگ کر ان کے ساتھ آملی تھی۔ ہارون نے گردن
اپنے چہرے سے بارش کے قطروں کو ہٹاتے ہوئے وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔

"تو گویا فیصلہ ہو چکا ہے۔" اطمینان کی ایک لہر ان کے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔

"میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں ثانیہ! لیکن مجھے یقین ہے، میں جلد

نے لگوں گا۔"

"ہاں......شاید بھی بھی۔" ثانیہ کی آواز وہ بمشکل سن پائے تھے۔

"کیا کہہ رہی ہو؟ میں ٹھیک سے سن نہیں سکا۔"

انہوں نے اس کی طرف قدرے جھک کر پوچھا تھا، مگر وہ کچھ کہنے کے بجائے مسکراتی چلی گئی

بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ سیاہ بدلی کی اوٹ سے چاند نے گھڑی بھر کے لیے ان دونوں کو دیکھا تھا
پھر سے بادل اوڑھ لیا تھا۔ اندھیری رات میں دو سائے چلے جا رہے تھے اور ان کے عقب میں
ی سرگوشیاں اور خوبصورت مسکراہٹ کا لمس فضا کے ماتھے پر ٹھہر سا گیا تھا۔

♦❖♦

ہم جو کہلائے طلوعِ ماہتاب

دروازے پر ہلکا سے کھٹکا ہوا تھا۔ نل کے پاس برتن دھوتی بڑی آپا نے گردن موڑ کر د
درنجف دروازہ کھول کر ادھر ادھر جھانکنے کے بعد دبے پاؤں گھر میں داخل ہوئی تھی۔ شاید دادی
کی ڈانٹ سے بچنے کیلئے اس نے یہ احتیاط کی تھی۔

بڑی آپا سے اس کی نظر ملی تو انہوں نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلا لیا۔ وہ ننگے
باہر سے کھیلتی ہوئی آئی تھی۔ اس لئے پاؤں بے تحاشا گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ بال پونی
کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ مٹے مٹے پھولوں والی گلابی فراک کی حالت بھی بے حد خراب ہ
تھی۔ بڑی آپا نے دھوئے ہوئے برتن ایک طرف کئے' جھاڑو سے برتنوں کا میل کچیل پرے
اور پھر اسے اپنے ساتھ بٹھا کر صابن سے رگڑ رگڑ کر اس کے ہاتھ اور پاؤں دھونے لگیں۔ پھر ا
منہ دھلوا کر تولیہ اس کے ہاتھوں میں دیا اور چپل پہننے کی تاکید کرتے ہوئے اپنے کام میں مص
ہو گئیں۔

اس نے جھک کر دادی کے تخت کے نیچے سے اپنی چپل نکالی اور پاؤں میں اڑستے ہوئے
میں آ گئی' جہاں اماں دودھ کا گلاس بھر کے عظیم کے ہاتھ میں تھما رہی تھیں۔ درنجف کی بھوک ایک
چمک اٹھی تھی۔

''اماں! مجھے بھی......'' اس نے بڑے ندیدے پن سے عظیم کے ہاتھوں میں پکڑے د
کے گلاس کو دیکھا اور پھر پُرامید نظروں سے اماں کو دیکھنے لگی۔

''دودھ ختم ہو گیا ہے۔''

''نہیں اماں! ابھی تو جگ میں بہت سا دودھ پڑا ہے۔'' اس نے ایڑیاں اٹھا کر اماں

میں پکڑے جگ میں جھانکنے کی کوشش کی اور اس کی اس حرکت پر اماں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''یہ تمہارے ابا کیلئے ہے۔''

''اماں! تھوڑا سا۔'' اس نے لجاجت سے کہا اور اماں دانت پیس کر رہ گئیں۔

''مجال ہے جو اس لڑکی کو ذرا صبر آ جائے۔'' اماں عظیم کے ہاتھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے
ائیں تو وہ قدرے سہم کر ماں کے بیزار چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔

''یہ لے پکڑ۔'' اماں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا' جس میں آدھے سے بھی کم دودھ ڈالا
اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ بڑھاتی' عظیم نے اماں کے ہاتھ سے گلاس جھپٹ کر منہ سے لگایا اور غٹا
دودھ چڑھا گیا۔

''اماں!'' درنجف چیخی تھی اور اس سے دو سال بڑا عظیم اس کی جھنجلاہٹ پر کھلکھلا کر ہنس دیا
درنجف کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

''موٹا' گندا۔'' وہ پاؤں پٹخ کر رہ گئی۔

''اے بھائی کو اس طرح نہیں بولتے۔'' اماں نے اسے گھورا۔

''لیکن اماں!'' وہ روہانسی ہو گئی۔ کچھ بولا ہی نہ گیا تو وہیں فرش پہ بیٹھ کر بے آواز رونے لگی۔

''اوہو' درنجف رو رہی ہے' بے چاری ذرا شکل تو دکھاؤ اپنی۔'' عظیم قہقہے لگاتا اس کی پونی کھینچنے
ا۔

''دفع ہو جاؤ تم۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''چچ' بے چاری کو دودھ ہی نہیں ملا' مانو بلی اسی لئے رو رہی ہے نا؟''

عظیم جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا' کچھ تو بھوک کی شدت نے اسے چڑا دیا تھا۔ اس پر
ظیم کی بدتمیزی' اس نے سلگتے ہوئے عظیم کا ہاتھ اپنی پونی پر سے جھٹکا۔ کس قدر برا لگ رہا تھا وہ اس
قت درنجف کو' اس نے منہ بسورتے ہوئے شکایتی نظروں سے اماں کو دیکھا' مگر وہ بے نیازی سے
ولہے میں لکڑیاں سلگا رہی تھیں۔ تب ہی عظیم نے ایک بار پھر اس کی پونی زوردار طریقے سے کھینچی
تو وہ ایک دم چیخ اٹھی۔

''عظیم موٹو' اللہ کرے مر جاؤ تم۔'' فوری طور پر اس کے منہ میں جو بھی آیا وہ کہہ گئی تھی اور
اماں کی بے نیازی یک لخت ہی ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے دہل کر اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا اور وہیں سے
ایک لکڑی اسے کھینچ ماری۔

''اے تیرے منہ میں خاک' کلموہی خدا تجھے غارت کرے۔'' دادی اپنی تخت پہ ہڑبڑا کر اٹھ

بیٹھیں اور اسے کوسنے دینے لگیں۔ دونوں طرف کے تابڑ توڑ حملوں نے اسے اچانک ہی خوفز
تھا۔

''اماں! وہ بھی تو۔'' اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے کچھ کہنا چاہا' مگر اماں کے چہرے
سرخی اور آنکھوں میں لہراتے غصے نے اس کی زبان بند کروادی تھی۔ دوسری طرف دادی کی
ابھی تک جاری تھیں۔

''زبان کٹ جائے اس منحوس کی' ارے میرا اکلوتا پوتا منتوں مرادوں والا' وہ بھی اس
ہے۔ آ میرا چاند میری آنکھوں کی ٹھنڈک' ادھر میرے پاس آ کر بیٹھ' میں کوئی دم درود کرو
خدا تجھے نظر بد سے بچائے۔''

دادی عظیم کو آغوش میں لئے چٹاچٹ اسے پیار کرنے لگی تھیں۔ درنجف باورچی خا
دروازے سے لپٹی سہمی سہمی آنکھوں سے دادی کو دیکھتی رہی۔ جن کے چہرے پہ محبت وشفقت
بیزار رنگ بکھرے ہوئے تھے' صرف اور صرف عظیم کیلئے۔

''اب یہاں کھڑی دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہے' چل دفعان ہو یہاں سے۔''

دادی نے عینک کے موٹے عدسوں کے پیچھے سے اسے گھورا تو وہ سست روی سے چلت
سٹور میں آ گئی۔ یہاں ایک چارپائی پہ بستروں کا انبار لگا ہوا تھا۔ وہ بستروں کے اوپر
اوندھے منہ لیٹ گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں واضح تھیں۔ سامنے د
نظریں گاڑے وہ بے ترتیب اور بے ربط خیالات میں الجھی رہی' پھر رفتہ رفتہ اس کی آنکھ
ہوتی چلی گئیں۔

شام رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگی تھی' جب بڑی آپا اسے ڈھونڈتی ہوئی سٹور م
آئیں۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو بستروں کے ڈھیر سے نیچے لٹک رہے تھے۔ اگر وہ ذرا
حرکت کرتی تو یقیناً نیچے جا گرتی۔ بڑی آپا نے اسے نزدیک جا کر سیدھا کیا۔ اس کی پلکیں
ہولے لرز رہی تھیں۔ گالوں پر آنسوؤں کے مٹے مٹے سے نشان تھے اور گلابی ہونٹ نیم وا
کی بھرپور معصومیت پر ٹوٹ کر پیار آیا تو بے اختیار ہی جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ ذ
کسمسائی تو بڑی آپا نے آوازیں دیتے ہوئے اسے جگا دیا۔

''نجف! کھانا کھا لو بعد میں سو جانا۔''

وہ چند لمحے اپنی خوابیدہ آنکھیں ان کے چہرے پہ جمائے لیٹی رہی' پھر ان کے اصرار پ
سے اٹھ کر انکے ساتھ ہی باہر آ گئی۔ کلی کر کے کچن میں آئی تو سب لوگ چولہے کے گرد نیم دائ

تھے۔ جب تک اماں نے سالن ڈال کر اس کے آگے رکھا۔ مینا آپی اور نینا کھانا کھا کر اٹھ
اس نے روٹی ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنی رکابی سے نظر ہٹا کر برابر بیٹھے عظیم کی طرف دیکھا
رکابی میں بھنا ہوا مسالے دار گوشت دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر
ی رکابی پہ ڈالی' جس میں سرخ سرخ شوربے میں دو چار آلو تیر رہے تھے۔
اماں! مجھے دوسرا سالن دے دو۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے رکابی پرے کھسکا دی۔
دوسرا کون سا؟''
ہی جو عظیم کھا رہا ہے۔'' اس کی نشاندہی پر اماں خوامخواہ ہی چولہے میں لکڑیاں درست
تھیں۔
اماں!'' اس کے دوبارہ پکارنے پر وہ جھنجلا کر اس کی طرف پلٹیں۔
نجف! خاموشی سے کھانا کھا لے۔'' ان کے چہرے پہ وہی تناؤ اور سختی در آئی تھی' جس سے
ے ہی خوف آتا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر پتلے شوربے میں روٹی ڈبونے لگی' نظریں ایک
ارادی طور پر عظیم کی رکابی تک ہو آئی تھیں۔
ب ہی عظیم کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی تو اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا اور پھر
یں میچ کر بڑے بڑے نوالے حلق سے نیچے اتارے اور اٹھ کر باورچی خانے سے باہر

بڑی آپا بستر بچھا کر لیٹ چکی تھیں۔ وہ بھی انکے برابر جا لیٹی تو بڑی آپا اس کے بالوں میں
پھیرنے لگیں۔
''بڑی آپا!'' اس نے کسی گہری سوچ میں گم ہو کر انہیں پکارا تھا۔
''عظیم اچھا بچہ ہے؟''
''ہاں۔''
''اور میں آپا میں گندی بچی ہوں......؟'' اس نے کروٹ بدل کر آپا کو دیکھا۔
''نہیں تم بہت اچھی بچی ہو' لیکن کیوں پوچھ رہی ہو یہ سب......؟'' انہوں نے الجھتے ہوئے
سوچ آنکھوں میں جھانکا۔
''اس لئے آپا! کہ اماں عظیم کو ہر روز دودھ دیتی ہیں مجھے نہیں دیتیں عظیم نے آج گوشت
کھائی اور میں نے آلو سے......۔''
چلا! گوشت تھوڑا تھا نا ابا' عظیم اور دادی کیلئے ہی پکا تھا۔ ہم سب ہی نے آلو اور شوربے

سے ہی روٹی کھائی ہے۔"

"اسی طرح ہمارے لئے دودھ نہیں بچتا۔ بس عظیم اور ابا کیلئے ہوتا ہے۔ آپا! ہم اسی وقت ہی کھا سکتے ہیں جب کوئی چیز بچ جائے۔ لیکن آپا! اگر کوئی چیز نہ بچے تو پھر یعنی"

درنجف! آپا کو سمجھا نہ پا رہی تھی کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہے اور کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ آپا نا سمجھ نہیں تھیں۔ جان گئی تھیں کہ اس کے ساتھ ہونے والی حق تلفی نے آج پہلی بار پر دستک دی ہے۔

محرومی کے اذیت ناک اژدہے نے پہلی بار اس کے دل میں ڈنک اتارا ہے۔ پچھلے بیس سال سے ان کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور وقت بے وقت ان کی ر پھیلاتا رہتا تھا۔

"تو ابھی بہت چھوٹی ہے نجف! بہت معصوم، ایسی باتیں نہ سوچا کر، چل میں تجھے سناتی ہوں۔" انہوں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا اور خود سے کہانی گھڑ کے سنانے لگیں۔

رنگوں، خوشبوؤں، تتلیوں اور پریوں کی کہانی جسے سناتے سناتے بڑی آپا سپنوں کھو گئی تھیں اور جسے سنتے سنتے درنجف نیند کی وادیوں میں کھو گئی تھی۔ جہاں پھلوں کے گوشت کے انبار تھے، دودھ کی نہریں تھیں اور جہاں وہ اکیلی تھی۔ نہ عظیم کی طنزیہ تمسخ تھی نہ دادی کی گالیاں اور کوسنے، بس وہ تنہا تھی اور جی بھر کے ان نعمتوں کے مزے لوٹ



درنجف صحن کی بائیں دیوار کے ساتھ بنی کیاری کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کے ہا سے لتھڑے ہوئے تھے اور وہ کیاری سے مٹی نکال نکال کر اسے دونوں ہاتھوں سے گو تھی۔ اس کے آس پاس کتنی ہی مٹی بکھری ہوئی تھی۔ گدلے پانی سے بھرا ڈبہ بھی نزدیک بڑی آپا نے کچن سے نکلتے ہوئے اس کی خستہ حالت دیکھ کر اسے نہانے کیلئے کہنا چاہا پرسکون اور مطمئن انداز میں کھیل رہی تھی کہ پھر انہوں نے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور تھال لے کر برآمدے میں موڑھے پر بیٹھ کر دال صاف کرنے لگیں۔

وہ بہت محنت اور احتیاط سے مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن بنا رہی تھی۔ ایک بار با لٹ اس کے ہونٹوں سے لپٹ گئی تھی جسے ہٹاتے ہوئے اس نے بے خبری میں اپنے منہ بھی مٹی لگا لی تھی۔ مٹی کا چولہا، ہنڈیا، توا، چھوٹی چھوٹی، ٹیڑھی میڑھی چیزوں کا ایک ڈھیر نے اپنے پاس۔

"اور یہ روٹی ابا کیلئے......" اس نے مٹی کی روٹی بنا کر توے پہ ڈالی تب ہی بیرونی دروازے پر کا ہوا تھا۔ نجف نے گردن گھما کر دیکھا ابا اپنی سائیکل سمیت گھر میں داخل ہو رہے تھے اور وہ نے کس خیال کے تحت بھاگ کر ابا کے پاس آئی تھی اور ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ باپ کو اپنی طرف ہ کرنے کی یہ معصوم سی کوشش بالکل غیر ارادی تھی۔

"اوہ ہٹو پیچھے، ہاتھ دیکھے ہیں تم نے اپنے۔" ابا نے اس کا مٹی سے لتھڑا ہوا ننھا سا ہاتھ سختی ے جھٹک دیا تھا۔

"گھر میں داخل ہوتے ہی منحوس صورتیں سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔"

انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے ایک طرف دھکیلا تو وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ مٹی سے بنے ہوئے ن اس کے گھٹنوں اور ہاتھوں کے زور سے چور چور ہو گئے تھے۔

اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں آنسو بہت جلد چلے آتے تھے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ حن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ چکے تھے۔ گندا سندا عظیم ان کی گود میں چڑھا بیٹھا تھا اور ابا شاپر میں ے سیب نکال کر دیتے ہوئے اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کر رہے تھے۔ درنجف کو اس لمے ابا اور عظیم دونوں ہی بہت برے لگے تھے۔

"ابا نے مجھے پیار نہیں کیا، عظیم کو کیا ہے، مجھے سیب نہیں دیا، عظیم نے پورا شاپر لیا ہے۔ میں ں ابا کو روٹی نہیں دوں گی۔ آج بھوکے رہیں گے وہ۔"

اس نے مٹی کی روٹی کو اپنے ہاتھوں سے مسل دیا۔ ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو پھسل کر اس کے گالوں پر چلے آئے۔ ہونٹ نکال کر بے آواز روتے ہوئے اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرنا چاہے تو مٹی کے کتنے ہی ذرات آنکھوں میں گھس گئے۔

"ہائے۔" وہ ایک دم تڑپی اور پھر زور زور سے رونے لگی۔ کچن کی طرف جاتی بڑی آپا نے اس کے رونے کی آواز سنی تو لپک کر اس کی طرف آ گئیں۔

"کیا ہوا ہے؟ ارے ہاتھ تو ہٹاؤ۔" انہوں نے زبردستی اس کے ہاتھ پیچھے ہٹائے، جن سے وہ اپنی آنکھوں کو مزید مسلتی جا رہی تھی۔

"آنکھوں میں مٹی پڑ گئی ہوگی۔ چلو شاباش میں منہ دھلوا دیتی ہوں۔"

آپا نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا، مگر اس کے رونے میں کمی کے بجائے شدت آ گئی تھی۔ عموماً وہ بہت گھٹ گھٹ کر رویا کرتی تھی۔ آج اس طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے کی وجہ سے آپا گھبرا گئی تھیں۔ اسے گھسیٹ کر نل کی طرف لے جاتے ہوئے انہوں نے کن انکھیوں سے

باپ کی طرف دیکھا تھا جس شخص کو گھر میں بیٹیوں کی ہنسی کی آواز ناگوار گزرتی ہو وہ ان کا رونا
بھلا کیونکر برداشت کرسکتا تھا۔ لیکن درنجف تو شاید لاشعوری طور پر باپ کو اپنی طرف متوجہ کر
رہی تھی۔ دل میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ ابا اسے اپنی گود میں بٹھائیں اور اس کے آنسو پ
ہوئے بڑی محبت سے پوچھیں کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں تھا اس کے برعکس ابا دھاڑے تھے۔

"کیا مصیبت آپڑی ہے اس چھٹنکی پر۔ گھر میں آؤ تو بندہ دو گھڑی۔ کون کو ترس جاتا
وقت کا شور ہر وقت کی ریں ریں میری تو زندگی جہنم بنادی ہے ان بدذاتوں نے۔"

ابا بولنے میں بالکل اپنی ماں پر گئے تھے' ایک بار بولنے پہ آتے تو بولتے چلے جاتے۔ تا
ان کے دل کی بھڑاس نہ نکل جاتی۔

دادی کا کرتا سیتے ہوئے اماں نے ایک بے تاثر سی نگاہ پہلے ابا پر ڈالی اور پھر بڑی آ
طرف متوجہ ہوگئیں۔

"بیٹا! چپ کراؤ اسے۔ کیوں آسمان سر پہ اٹھا رکھا ہے۔"

آپا اتنی دیر میں پانی کے چلو بھر بھر کے اس کی آنکھوں میں ڈالتی رہیں۔ ابا کی بڑبڑاہٹ
بعد اماں کی سرد سی آواز کانوں میں پڑی تو اس کی ہچکیاں خود بخود سسکیوں میں ڈھل گئیں۔

آپا نے اس کا منہ ہاتھ تولیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کیے اور پھر اسے اماں کے پاس
باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ یونہی ٹانگیں جھلاتے ہوئے بھیگی پلکوں کے ساتھ ابا اور عظیم کو
رہی۔ ابا سیب کاٹ کر' چھیل کر عظیم کے ہاتھ میں دیتے جارہے تھے اور وہ مزے سے کھا
تھا۔ پاس بیٹھی دادی بھی موج میں تھیں۔ تب ہی صدف کمرے سے باہر آئی تھی اور چپکے سے
پاس جاکھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحے ندیدے پن سے انہیں دیکھنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ
والی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی اور چھلکے منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ پھر درنجف کی طرف
مسکراتے ہوئے اسے اپنے پاس بلانے لگی' مگر اس نے صدف کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا۔

"آئے ہائے کیا دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو بھائی کے کھانے کو نظر لگاؤ گی کیا؟"
کی کڑک دار آواز پر اس نے دیکھا دادی صدف کو بری طرح جھڑک رہی تھیں۔

"یہ لے پکڑ اپنی ماں کے پاس لے جا۔" ابا نے ایک سیب اس کے ہاتھ میں تھما کر
سے کہا تھا اور صدف خوشی خوشی سیب ہاتھ میں لئے اماں کے پاس بھاگی چلی آئی تھی۔ اماں
کے کئی حصے کیے تھے اور پھر ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا تھا۔

ہمیں نہیں کھانا۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کیوں کیا ہوا؟" اماں نے حیرت سے اس کا بجھا بجھا چہرہ دیکھا۔

پہلے کیوں نہیں دیا ابا نے اور عظیم کو تو اتنے سارے سیب دیئے ہیں۔ میں اتنا سا کیوں

بادہ ٹرٹر نہیں کرتے یہ لے پکڑ کھانا ہے تو کھا نہیں تو جا میری بلا سے جہنم میں۔"

ں نے سیب اس کی گود میں پھینکا اور خود دوبارہ مشین پر جھک گئیں' مشین پہلے سے دوگنی
لے لگی تھی۔ نجف نے سیب کا ٹکڑا اٹھا کر صدف کے ہاتھ میں تھمایا اور خود آپا کے پاس
نے میں آگئی اور پھر اسے قدرے گم صم دیکھ کر آپا نے ادھر ادھر کی باتوں میں الجھا لیا تھا
ذہن غیر ضروری باتوں کے منفی اثرات سے محفوظ رہ سکے۔



ن کا دوسرا پہر چل رہا تھا' جب بڑی آپا کی آنکھ کھلی انہوں نے سر اٹھا کر مندی مندی
ے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر چونک گئیں۔ کمرے کی لائٹ ابھی بھی جل رہی تھی حالانکہ
پہلے انہوں نے نینا کو تاکید کی تھی کہ خیال سے ساری بتیاں بجھا دے' مگر نینا نے حسب
کی بات پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ انہوں نے خود سے لپٹی ہوئی درنجف کو آہستگی سے علیحدہ
رپائی سے نیچے اتر آئیں۔ کمرے کی بتی بجھا کر دروازہ بند کرنے کے بعد انہوں نے پانی
جب دوبارہ بستر پر آئیں تو نیند اس کی آنکھوں سے یکسر غائب ہوچکی تھی۔ چند لمحے
لنے کے بعد وہ یونہی درنجف کی طرف کروٹ بدل کر غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

ل وصورت کے لحاظ سے وہ اتنی پیاری بچی نہیں تھی کہ اسے دیکھتے ہی اس پر ٹوٹ کر پیار
کھلتی ہوئی رنگت تھی جاذب نظر نقوش' بڑی بڑی آنکھیں جو اس کی معصوم چہرے پہ اس لئے
لیکن ان میں ہمہ وقت سوچ کا تاثر موجود رہتا تھا۔ اس کی حد درجہ حساس اور زود رنج
نے اس کے چہرے پہ تفکر کی ہلکی سی پرچھائیں ثبت کردی تھیں۔ وہ بچوں کے درمیان بیٹھتی
سے دیکھ کر انسان ایک لمحے کیلئے چونکتا ضرور تھا۔

بڑی آپا کو لگتا تھا کہ وہ انہی کا پرتو ہے۔ انہی کی طرح سوچتی ہے۔ ان ہی کی طرح محسوس
ہے اور شاید اسی لئے وہ اسے سب بہنوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔

نجف کی پیدائش کے بعد اماں کو اتنا وقت ہی کب ملتا تھا کہ وہ بیٹے کو چھوڑ کر کسی بیٹی پر توجہ
سو اس نے بخوشی اس ننھی گڑیا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ ایک ماں کی طرح

پرورش کر رہی تھیں وہ اس کی اور اب تو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ بڑا
وہ اس کی طرف سے فکرمند بھی رہنے لگی تھیں۔

انہیں معلوم تھا کہ درنجف جو سوچ رہی ہے وہ غلط نہیں' لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ
وہ اسے درست نہیں کر سکے گی۔

لڑکیوں سے نفرت کا جو رویہ برسہا برس سے اس گھر میں پنپ رہا ہے اسے محبت م
اب ناممکنات میں سے ہے۔ وہ اس گھر میں سب سے بڑی تھیں۔

لڑکی کی پیدائش پر اس نے اس گھر کے در و دیوار پر سناٹا اترتے دیکھا تھا۔

ابا کی امید کو ناامیدی کے غیض و غضب میں ڈھلتے دیکھا تھا۔

اور اس پردادی کا واویلا۔

"مجھے تو لگتا ہے پوتے کی حسرت دل میں لئے اس دنیا سے گزر جاؤں گی۔ نسل
بیٹوں سے ہے اور مجھے لگتا ہے یہ کلموہی ہمارے خاندان کا نام مٹا کر ہی چھوڑے گی۔ لڑ
نحوستوں کی۔"

وہ اپنے آپ میں سمٹ جاتیں۔ اماں خود کو قصور وار سمجھتے ہوئے تکیے میں منہ
بیٹیوں کی اوپر تلے کی پیدائش نے انہیں بیٹیوں سے متنفر کر دیا تھا کہ یہ بری صورت بچا
طعنہ بن گئی تھیں۔ ان کی بربادی کا سامان کر رہی تھیں۔

سب سے بڑی خود بینا آپا ہی تھیں۔ ان کے بعد مینا آپی اور اس سے چھوٹی نینا
ابنارمل تھی اور جسے پانچ چھ سال کی عمر میں ابا داتا دربار چھوڑ آئے تھے۔ پھر صدف۔ جو
اس گھر میں مبارک ہی ثابت ہوئے تھے۔

سال بھر کے بعد عظیم پیدا ہوا تھا اور انہوں نے ہر چہرے پر خوشی کا وہ رنگ دیکھا تھا
سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

گھی کے چراغ جلائے گئے تھے۔ محلے بھر میں لڈو بانٹے۔ اماں کی میز پر پھلوں
گیا۔ وہ اترائی اترائی سی کسی راجدھانی کی ملکہ بنی بیٹھی تھیں۔ پانچ بیٹیاں انہیں وہ عزت
دلا سکی تھیں جو ایک بیٹے نے اس دنیا میں قدم رکھتے ہی دلا دیا تھا۔ بڑی آپا اس پیارے
کو دیکھتی رہیں۔ وہ خوش تھیں' مگر انہیں رونا بھی آ رہا تھا وہ اندر ہی اندر گھلتی رہیں۔
درنجف پیدا ہوئی تھی اور اس کا اس دنیا میں آنا ایسا ہی تھا جیسے میٹھے بادام کھاتے ہوئے
میں کڑوا بادام آ جائے اور ساری کڑواہٹ منہ میں گھل جائے۔ وہ سیب سے بڑھ کر

کا شکار ہوئی تھی۔

اس بات کو وہ پوری طرح محسوس بھی کر رہی تھی۔

فصل کے کسی ایک حصے پر ہی برستی رہے تو باقی کی کھیتیاں سوکھ جاتی ہیں۔"

بڑی آپا کو لگ رہا تھا کہ یہ ہری بھری کھیتی بھی قدم بہ قدم خزاں کی طرف بڑھتی جا رہی
نہیں چاہتی تھیں کہ درنجف ہو بہو ان جیسی بن جائے۔

ان جیسے لوگ نینا اور مینا کی طرح خوابوں کے محل تعمیر نہیں کر سکتے' وہ اپنی ذات کے گنبد
جاتے ہیں۔ جہاں نہ روشنی کی کرن آتی ہے نہ اندر کے اندھیروں کو باہر جانے کا راستہ
ہے۔

یہ لوگ صدف کی طرح بے نیاز بھی نہیں ہو سکتے کہ لاپروائی سے بڑی سے بڑی بات
اڑا دیں۔ دوسروں کے گھروں میں جا کر بھاگ بھاگ کر جھاڑو پوچا لگائیں اور بدلے
کھا کھا کر نہال ہو جائیں۔ ان جیسے لوگوں کو تو اندر ہی اندر کڑھنا ہوتا ہے۔ امتیازی رویوں
میں جلنا ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو کھوجنا اور پھر خود کو کہیں نہ پا کر اپنی ہی ذات کے اندر
ہے اور ایسے لوگوں کو دفنانے کیلئے منوں مٹی کی ضرورت تھوڑی ہوتی ہے۔ یہ تو آپوں آپ
تے ہیں۔

حاصل خواہشوں کے ڈھیر میں

نا تعبیر خوابوں تلے
رویوں کی راکھ میں
لیکن میں درنجف کو بینا نہیں بننے دوں گی۔"

انہوں نے طویل سانس لیتے ہوئے سوچا۔

اسے اپنے آپ میں مرنا نہیں' زندہ رہنا ہے' خود کو تلاشنا ہے۔ میں' میں اسے سکول میں داخل
کی کتابوں میں نت نئی باتیں پڑھنے کو ملیں گی تو ادھر ادھر کی پریشان کن سوچوں میں الجھنے
رہے گی۔ میں کل ہی استانی جی کی طرف جاؤں گی۔

انہوں نے دل ہی دل میں تہیہ کرتے ہوئے نجف کی پیشانی پر پیار کیا اور سونے کی کوشش
میں ان کا دایاں بازو ہمیشہ کی طرح درنجف کے غافل وجود کے گرد حائل ہو گیا تھا۔



بڑی آپا نے اماں سے بات کی تو انہوں نے ہاں میں جواب دیا نہ انکار کیا۔ وہ کچھ لمحے

ان کے جواب کی منتظر رہیں اور پھر ان کی طویل خاموشی سے اکتا کر اٹھ گئیں۔ چادر لپیٹی' ا
انگلی تھام کر استانی جی کے گھر چلی گئیں' ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان بڑی آپا نے اپنا
تو انہوں نے سارا کام اپنے ذمے لے لیا۔

''تم بس اسے تیار کر کے بھجوا دینا' باقی سارا کام میں کرلوں گی۔''

بڑی آپا مطمئن ہو کر واپس آ گئیں اور یوں چند دن بعد ہی اس نے سکول جانا شر
اور حسب توقع وہ کافی مصروف رہنے لگی تھی۔ پڑھائی میں غیر معمولی دلچسپی کی بنا پر وہ
اساتذہ کی نظروں میں دل پسند طالبہ کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

ہر سال کلاس میں نمایاں پوزیشن لے کر وہ اگلی کلاس میں ترقی کرتی چلی گئی۔ اس
سے واپس آئی تو بیگ رکھتے ہی اماں کے سر ہو گئی۔

''اماں! صبح فیس لے کر جانی ہے۔ ٹیچر کہہ رہی تھیں اب فیس جمع نہ کروائی تو سکو
نام کٹ جائے گا۔'' وہ کافی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

''اماں! سنتی ہو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' اس نے اماں کو جوں کی توں اپنے کام
دیکھا تو چڑ گئی۔

''کیا مصیبت پڑ گئی تجھے......؟'' اماں پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولیں تو
ہو گئیں۔

''اماں! میرا نام کٹ جائے گا سکول سے۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''پیسے دے دو نا' میں فیس جمع کروا سکوں۔''

''نہیں ہیں میرے پاس پیسے۔'' اماں کا روکھا پھیکا قطعی انداز آنسو ہمیشہ کی طرح
بھاگے چلے آئے تھے۔

''تو کہاں سے آئیں گے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''اپنے باپ سے پوچھ جا کر چند سو روپے لا کر میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ سا
طرح گزرتا ہے' وہ میں ہی جانتی ہوں۔ خود تو عیش میں رہتا ہے اور مصیبتیں ساری
پر۔'' اور اس سے آگے بڑبڑاہٹوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو سلائی مشین کی کھڑکھڑاہٹ
توڑ گیا تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگائے ٹپاٹپ آنسو گراتی رہی۔

تب ہی بیرونی دروازہ کھول کر عظیم چلا آیا' تخت پر سے کپڑے ایک طرف ہٹا

نے روتی ہوئی نجف کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

''اماں! مجھے کچھ روپے چاہئیں۔'' عجیب لٹھ مار سا انداز تھا اس کا' جوں جوں وہ بڑا ہوتا جا رہا
توں توں تحکمانہ جارحیت اس کی شخصیت کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔

''کیا کرنے ہیں......؟'' اماں مشین روک کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''ضرورت ہے۔''

''پھر بھی......'' اماں نے استفسار کرنا چاہا' مگر وہ تیوریاں چڑھا کر درمیان میں ہی ٹوک

''ایک تو تم پولیس والوں کی طرح تفتیش کرنے بیٹھ جاتی ہو' اماں! پیسے دینے ہیں تو دو ورنہ
ابا سے مانگ لوں گا۔''

جواباً اماں نے چپ چاپ مشین اٹھا کر اس کے نیچے سے چند روپے نکال کر اس کی طرف
ا دیئے تھے۔

''اتنے پیسوں سے کام نہیں چلے گا' کم قیمت کا بیٹ بھی خریدنا ہو تو ستر اسی روپے لگ ہی
ے ہیں۔ گیند ساتھ خریدنی ہو تو اس کے پیسے الگ۔'' اس نے روپے مروڑ تروڑ کر واپس ماں کی
ی میں پھینک دیئے تھے۔

''ارے جمیلہ! آخر ایک دفعہ ہی پیسے کیوں نہیں دے دیتیں' اس بے چارے کو بھی اس کے
کی کمائی ہے۔ وہ خرچ نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا۔ آخر میرا بیٹا کماتا کس کیلئے ہے۔''

دادی چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے چلائیں تو اماں نے چپ چاپ دوبارہ مشین اٹھائی اور سرخ نوٹ
کر عظیم کے ہاتھوں میں دے دیئے اور در نجف جسے پورا یقین تھا کہ عظیم کو بھی اسی کی طرح انکار
سامنا کرنا پڑے گا' ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔ آنسوؤں کے اس پار سارا منظر دھندلا سا لگ رہا تھا۔ اس
وراً قمیص کے دامن سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''شاید میں ٹھیک سے دیکھ نہیں پائی۔'' اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دوبارہ دیکھا۔ عظیم کے
ے پہ پھیلی جاندار سی مسکراہٹ اور اس کی بند مٹھی سے جھلکتی کرارے نوٹ کی سرخی اسے سن کر گئی
۔ اس نے بڑی بے یقینی سے اماں کو دیکھا جو بڑے آرام سے ایک بار پھر مشین چلا رہی تھیں۔

''کیا عظیم کا کھیل میری پڑھائی سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔''

سوچ کے ساحل پر کئی لہریں ایک ساتھ سر پٹخنے لگی تھیں۔ اسے دادی پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا
اماں سے بھی زیادہ اماں پر وہ دھپ دھپ کرتی کمرے میں چلی گئی۔ شام تک ناراضی کے اظہار

کے طور پر اس نے یونیفارم نہیں بدلا تھا۔ رات کو بھوک کے باوجود اس نے کھانا نہیں کھایا اور یوں
گئی۔ صبح اٹھی تو اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آج سکول نہیں جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فیس
کروانے پر اسے ہم جماعتوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر الجھے بکھرے بال لئے ادھر سے ادھر گھوم رہی تھی' جب بڑی آپا
اسے کمرے میں بلایا۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور قدرے سرخ بھی۔ انہوں نے ایک
تہہ کر کے شاپر میں ڈالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''خالہ سکینہ کے گھر لے جاؤ۔ ان سے کہنا پیسوں کی اشد ضرورت ہے' ابھی دیں' پھر ا...
سے فیس نکال کر سیدھی استانی جی کو دے آنا اور سنو اماں کو ہرگز مت بتانا کہ پیسے مل گئے تھے سمجھ
نا؟'' آپا پوچھ رہی تھیں اور وہ چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ رات
بار بھی اس کی آنکھ کھلی تھی اس نے آپا کو اس چادر پر جھکے پایا تھا۔

''تو کیا آپا ساری رات جاگ کر کڑھائی کرتی رہیں۔ صرف میرے لئے۔'' اس
احسان مندی کے جذبات سے بھر گیا۔

''اب کھڑی کیا سوچ رہی ہو جاؤ نا۔''

آپا نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ چونک گئی اور پھر سر ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔
ہدایت وہ استانی جی کو فیس دے کر واپس آئی تو سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ ...
جھاڑو لگا رہی تھیں۔ نینا برتن دھو رہی تھی اور ساتھ ساتھ صدف کو بھی کوس رہی تھی جو موقع پا...
گھر سے نکل گئی تھی۔

وہ سیدھی بڑی آپا کے پاس پہنچی تھی جو میلے کپڑے دھونے کیلئے نکال رہی تھیں۔ اس...
پیسے چپکے سے ان کے ہاتھ میں دے دیئے۔

''آپا! تم مجھے بھی کڑھائی کرنا سکھا دو۔''

''کیوں؟'' آپا اس کی غیر متوقع فرمائش پر قدرے حیران ہوتے ہوئے پوچھنے لگی تھیں۔

''مجھے کڑھائی کرنی آ جائے گی تو میں اپنی فیس کے پیسے خود ہی جمع کر لوں گی۔ تمہیں
رات بھر جاگنا نہیں پڑے گا۔'' آپا اس کی سوچ کی رسائی پر متعجب ہو گئی تھیں۔

''نہیں چندا! ابھی تو تمہیں صرف پڑھائی کرنی ہے۔ جب تک تمہاری آپا ہے نا...
تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سمجھیں؟'' انہوں نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھا...
نہال ہوتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔



پھر واقعی جب تک بڑی آپا موجود تھیں' تب تک اسے کبھی فیس کیلئے پریشان نہیں ہونا پڑا
تک کہ وہ پانچویں کلاس میں آ گئی تھی۔ لیکن پھر یہ سہارا بھی عارضی ثابت ہوا تھا اور اس کا
اسے اس وقت ہوا' جب ایک روز سکول سے واپسی پر صدف نے بڑے پرجوش انداز میں
اطلاع دی تھی۔

''بڑی آپا کی شادی ہونے والی ہے۔''

''کیا......؟'' وہ حیرت سے چیخی تھی۔

''کب......؟''

''اگلے جمعے کو۔''

''اتنی جلدی......؟''

''نہیں یقین آتا تو اماں سے پوچھ لو......'' صدف کو اس کی بے اعتباری ایک آنکھ نہیں بھائی
وہ فوراً باہر نکل آئی۔ اس بات کی تصدیق کیلئے' وہ اماں کے پاس آئی تو محلے کی ایک عورت
ان سے باتوں میں مصروف تھی۔

''ارے ایسی سگھڑ' سلیقہ مند ہے اپنی بینا کہ مثال نہیں۔ شکل وصورت کی بھی اچھی خاصی' پھر
بے جوڑ رشتے کا کیا جواز اسے تو کوئی بھی بھلا سا گھرانہ اپنی بہو بنا لیتا۔ میں تو سچ کہتی ہوں
لگ بڑی ہی جلد بازی کر رہے ہیں۔'' وہ عورت تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''ارے ہم کیا جانیں اس کے باپ نے رشتہ طے کر دیا' ہم نے منظور کر لیا۔ اب جو اس کے
ہے۔'' دادی نے بات کو ٹالنا چاہا۔

''ارے بوا! آپ نے مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔ کچھ وقت تو لگتا' مگر ایسا رشتہ ڈھونڈ کر لاتی
''

''دیکھو جی بات صرف اتنی سی ہے کہ ایک بینا ہی تو نہیں پیچھے بھی پوری لائن لگی ہوئی ہے۔
ایک بھگتاؤ' دوسری تیار۔ ایسے ہی شہزادوں' رئیسوں کے انتظار میں رہے تو پانچوں کی پانچوں بیٹھی
رہیں گی ساری عمر اپنے باوا کی دہلیز پر......'' دادی اماں نے اکتائے ہوئے کوفت بھرے انداز میں
کہا جبکہ اماں چپ سادھے بیٹھی تھیں۔

''پھر بھی خالہ! آخر کیا دیکھ لیا' آپ نے الیاس احمد میں' میں نے تو سنا ہے خیر سے پہلے بھی
...بچوں والا ہے۔'' عورت کے متجسسانہ انداز پر دادی نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ہے اس کی بیوی، مگر مفلوج۔ اپنے میکے میں ہی رہتی ہے۔ تین چھوٹے
سنبھالنے والا کوئی نہیں اسی لئے دوسری شادی کر رہا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اپ
پیتے گھرانے سے تعلق ہے اس کا کہ ہماری بینا عیش کرے گی، عیش۔"

"اور وہ بیس، پچیس ہزار روپے کا کیا معاملہ ہے؟"

"ارے معاملہ کیا ہونا ہے بھلا آدمی ہے۔ جانتا ہے بیٹی والوں پر کتنا بوجھ ہوتا ہے
خرچے ورچے کیلئے ہی دے گا۔" دادی کے صاف صاف بتا دینے پر وہ عورت سر جھٹک کر رہ

"اس سے تو اچھا تھا کسی قلی، مزدور سے بیاہ دیتے، بھلے دو وقت کی روٹی مشکل سے ملتی
تو اس کا اپنا ہوتا وہ تین بچوں کا باپ اور خاندانی بیوی کا شوہر۔ کیا دے پائے گا اپنی بینا کو؟
بات کہوں گی۔ کسی کو برا لگتا ہے تو لگے۔ منیر بھائی نے بیٹیوں کو گائے بھینس سمجھ رکھا ہے۔
خواہش کی اسی کے کھونٹے سے باندھ دیا۔ خدا ان بچیوں کے حال پر رحم فرمائے۔"

وہ عورت اپنی بات کہہ کر چپل پہن کر یہ جا وہ جا پیچھے دادی کسمسا کر رہ گئیں۔ درنجف
کی بڑبڑاہٹوں سے تنگ آ کر وہاں سے اٹھ گئی اور آپا کی تلاش میں باورچی خانے میں آ گئی
جھکائے چولہے کی راکھ کرید رہی تھیں۔ نجف ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ آپا معمول
خاموش لگ رہی تھیں، اس نے کئی بار ان سے بات کرنے کی کوشش کی، مگر جواب ہوں
زیادہ نہیں ملا تھا۔ تب پھر وہ بھی چپ کر گئی، مگر وہ انہیں تنہا چھوڑ کر نہیں گئی تھی بلکہ اس د
وہیں بیٹھی رہی تھی جب تک وہ کام سے فارغ نہیں ہو گئی تھیں۔

اور پھر اگلے کئی روز تک اس نے دیکھا کہ آپا گم صم ہو کر رہ گئی تھیں۔ نینا اور مینا ہمیشہ
سر جوڑ کر سٹور روم میں گھسے رہنے کے بجائے آپا کے آس پاس منڈلاتی رہتی تھیں۔ ان د
چہروں پر مستقبل کے اندیشے زردیاں بن کر پھیل رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ جو کچھ
ہے وہ اچھا نہیں ہے اور پھر رات کو سونے سے پہلے وہ دل کی گہرائیوں سے دعا کیا کرتی
کی شادی نہ ہو مگر سب دعائیں قبول ہونے کی نہیں ہوتیں۔



آپا کی شادی کا دن آ پہنچا تھا۔ بارات کے نام پر دس بارہ لوگ گھر کے صحن میں آ بیٹھے
چند ایک محلے دار تھے۔ دولہا سادہ سے شلوار سوٹ میں آیا تھا۔ شکل و صورت خاصی معقول
بالوں میں کہیں کہیں سفیدی بھی جھلک رہی تھی۔ وہ انہیں دور دور سے دیکھ کر آپا والے کمرے
آ گئی، کچھ لڑکیاں آپا کے گرد گھیرا ڈالے اپنی ہی باتوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے

ان اپنی جگہ نکالی اور پھر آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی آپا کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ابھی عام سے گھریلو
ی بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ درنجف نے ان کا
نا چاہا، مگر چادر کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے نہ دیکھ پائی۔ اس نے ان کی گود میں رکھے
ے ہاتھوں کو چھو کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔

آپا!" اس نے سر کو قدرے جھکا کر انہیں سرگوشی میں آواز دی۔ اپنی اس کوشش کے دوران
ے لرزتے کانپتے ہونٹ ہی دیکھ پائی تھی۔ تب ہی ٹپ کی غیر محسوس آواز کے ساتھ اس کے
پشت پر بے رنگ پانی کا ایک قطرہ گرا تھا اور وہ اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔

ی آپا رو رہی تھیں۔

"آہ، بے چاری مجبور و بے بس لڑکی اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔"

ئی سرگوشی اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے آپا کے ہاتھوں پر رکھا ہاتھ واپس کھینچا
ی ہوئی سٹور میں چلی گئی۔ وہاں بستروں پہ گر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی، اتنا کہ شاید
ے لئے بھی نہیں روئی تھی، اس کے ہاتھ کی پشت پر آپا کی آنکھ سے نکلا ہوا آنسو گویا ٹھہر سا
۔ وہ اپنے ہونٹ اسی پہ رکھ کر آنسو بہاتی رہی، یہاں تک کہ آپا رخصت ہو کر اس گھر سے چلی
۔ لیکن وہ رات گئے تک وہاں سے باہر نہ نکلی تھی۔ اسے ابا، اماں اور دادی سے بے حد نفرت
ہو رہی تھی۔

"آپا کبھی نہیں روئی تھیں۔ لیکن ان لوگوں نے انہیں رونے پر مجبور کر دیا۔" اس کے دل میں
بیٹھ گئی تھی اور اگلے کئی روز تک اپنے ہاتھ کی پشت اسے جلتی ہوئی محسوس ہوتی رہی تھی۔



بڑی آپا کی شادی کے بعد تنہائی اور عدم تحفظ کا احساس ایک دم بڑھ گیا تھا۔ پہلے وہ آپا کے
سوتی تھی۔ اب اسے اکیلے سونا پڑتا تھا۔ رات کو کئی کئی بار وہ سہم کر اٹھ جاتی اور پھر رضائی میں
جاتی۔

سکول سے واپس آتی تو بولائی بولائی سی ادھر ادھر پھرتی رہتی۔ سارا گھر خالی اور ویران لگتا۔
بارہا اسے دھوکہ ہوتا کہ بڑی آپا نے اسے پکارا ہے۔ کتنی ہی دفعہ وہ باورچی خانے میں جاتی ہوئی
ر ہوتیں۔ وہ بھاگ کر وہاں جاتی اور پھر مینا آپی کو دیکھ کر افسردگی سے واپس آ جاتی۔ وہ ساری
جو پہلے بڑی آپا سے کہہ دیا کرتی تھی اب دل و دماغ میں اودھم مچاتی رہتیں۔ لیکن نجانے کیسی
کی کہ وہ مینا آپی یا نینا سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ پاتی تھی۔ پڑھائی الگ متاثر ہو رہی تھی۔

سکول میں ہم جماعت لڑکیوں اور ٹیچرز نے بھی محسوس کیا کہ وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئی ہے
کے استفسار پر وہ کچھ بھی بتانے کے بجائے خاموشی سے سر جھکا لیتی۔

بڑی آپا شادی کے بعد ایک دو بار آئیں' مگر بہت تھوڑی دیر کیلئے۔ اسی سادہ سے
لیکن وہ پہلے سے کافی کمزور دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد یہ کچھ دیر کی آمد بھی موقوف ہ

♦❖♦

فلیٹ شوز بوسیدہ ہو کر کچھ اس طرح پھٹے تھے کہ اس کے دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی
لگی تھی اور بائیں پاؤں کا انگوٹھا جوتا پھاڑ کر باہر جھانکنے لگا تھا۔ یونیفارم کی شلوار اس نے
کھینچ کھانچ کر ٹخنوں تک کر لی تھی' مگر قمیص گھٹنوں کے اوپر ہی ٹنگی رہ گئی تھی۔ سفید دوپٹہ بھی
چھوٹا اور اپنے وجود پر ناکافی لگنے لگا تھا۔

یہ وہی یونیفارم تھا جو اس نے چھٹی کلاس میں داخلے کے وقت سلوایا تھا اور اب آ
اسی سے کام چلا رہی تھی۔ کچھ روز پہلے تک وہ مینا آپی سے خوب جھگڑتی رہی تھی کہ وہ
سے اس کے کپڑے نہیں دھوتیں' پھر تنگ آ کر خود ہی دھونے لگی' مگر کئی کئی گھنٹے کی مشقت
بھی ان کی پیلی رنگت غائب نہ ہوئی اور اس پر واضح ہو گیا کہ اب اس کپڑے میں چمک کا
نشان بھی نہیں رہا ہے۔ کپڑے کا سلا ہوا بڑا سا تھیلا جس میں ساری کاپیاں' کتابیں بری
ہوئی تھیں' کندھے پر لٹکاتے ہوئے اس نے ایک نظر خود پر ڈالی تو شرمندگی کے مارے گ
نکالنا دوبھر ہو گیا۔

''ہم لوگ اتنے کم حیثیت تو نہیں' ابا کی تنخواہ' اماں کی سلائی اور مینا آپی کی کڑھائی
ملا کر اتنے تو بن ہی جاتے ہیں کہ میں دو سال میں نیا یونیفارم بنوا سکوں' لڑکیوں سے مانگ
کتابیں حاصل نہ کرنی پڑیں اور نہ ہی مہینہ بھر پہلے فیس کیلئے پریشان ہونا پڑے' مگر اماں
خزانہ صرف عظیم کیلئے ہے' وہ تو ہمیشہ سے اچھا کھاتا آیا ہے۔ لباس آج بھی بہترین پہنتا
کی ہر خواہش اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کی جاتی ہے۔ جیب ہر وقت نوٹوں سے
ہے اور ایک ہم ہیں کہ واحد غربت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہمارے والدین نے
نوازا ہے ہمیں۔''

''ارے کیا کر رہی ہو یہاں؟'' کرخت آواز پر وہ گھبرا کر چونکی۔ عظیم باہر سے آ رہا
دروازے کے پاس کھڑے دیکھ کر خواہ مخواہ ہی رعب جمانے لگا۔
گریبان کے کھلے بٹن بڑھے ہوئے بالوں کی لٹیں' بدرنگ شرٹ عظیم کا حلیہ

کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔
''سنائی نہیں دیا تجھے کیا پوچھ رہا ہوں میں؟'' عظیم نے دوبارہ آنکھیں نکالیں۔
''تجھے کیا تکلیف ہے۔ میں جو مرضی کروں۔'' وہ اس کے تحقیر آمیز لہجے پر چیخ کر بولی۔
''زیادہ بکواس نہ کر' ایک جھانپڑ دوں گا رکھ کے۔'' عظیم کو جواب سننے کی عادت نہیں تھی سو فوراً
ل اٹھا۔ اس کے بگڑتے تیور دیکھ کر وہ جواب دینے کی ہمت تو نہ کر سکی' بس منہ ہی منہ میں
تے ہوئے اس کے پاس سے گزرتی باہر نکل گئی۔

''اماں! سمجھا اس چڑیل کو زیادہ ٹرٹر کی تو کسی دن زبان کاٹ کے رکھ دوں گا۔'' اپنے عقب
ے عظیم کی دھاڑ سنائی دی تو بے بسی اور غم و غصے کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''بس یہ ہی وقعت ہے میری۔ ذلت اور صرف ذلت' گھر میں بھی اور سکول میں بھی۔'' گھر
ول تک کا فاصلہ اس نے یونہی جلتے' کڑھتے طے کیا تھا اور پھر کلاس میں جا کر وہ سب سے
نچ پر بیٹھ گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ وہ سب لوگوں کی نگاہوں سے چھپ گئی
ر یہاں بیٹھ کر وہ دوسری لڑکیوں کے صاف ستھرے' چمکتے دمکتے ملبوسات اور ریڈی میڈ سکول
یکھنے سے بھی بچی رہتی تھی' جو ہمیشہ ہی اسے کمتری کے شدید احساس سے دوچار کر دیتے تھے۔
ساس کے زیر اثر وہ کتنی ہی بار سکول چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لیکن اس کے اندر کوئی تھا جو
اس کی ہمت بندھاتا تھا۔ اسے آگے بڑھنے پر مجبور کرتا تھا۔ سو گھر آ کر وہ پہلے کتنی ہی دیر
لائی سی پھرتی رہتی' کبھی رو دیتی اور پھر زیادہ ہی غصہ آتا تو کتابیں کھول کر سامنے رکھ لیتی اور
ات گئے تک پڑھتی رہتی' بس ایک یہ ہی راستہ سجھائی دیتا تھا اسے۔ جس کے ذریعے وہ باقی سب کو
چھوڑ کر آگے نکل سکتی تھی۔ سو اس نے اس راستے پر چلنے کے بجائے اس پر دوڑنا شروع کر دیا



''اماں! مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔'' اسے امید تو نہیں تھی کہ ضرورت پوری ہوگی' مگر
نجانے کس احساس کے تحت اماں سے کہہ کر بغور ان کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔
''میرے پاس کوئی پیسے نہیں...... جو تھے ان کی صبح دالیں اور چینی منگوا لی تھی۔'' وہی صاف
کھرا سا جواب' وہ گہری سانس لے کر ان کے چہرے سے نظریں ہٹا گئی۔
''تو میں اپنی ضرورت کہاں سے پوری کروں......؟ اگر کہو تو کشکول لے کر باہر گلی میں نکل
جاؤں؟''

ستون سے لپٹی سوکھی زرد بیل پر نظریں جما کر اس نے بہت عجیب سے انداز م
دادی کے بالوں میں تیل ڈالتے ہوئے اماں کا ہاتھ لمحہ بھر کیلئے تھم سا گیا تھا۔ قدرے غ
سے اسے گھورا' جس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''تیری زبان تیرے قابو سے باہر ہوتی جارہی ہے درنجف! چل دفع ہوجا یہاں سے
میرا کلیجہ نہ جلا۔'' اماں نے اسے دھتکارا تھا۔ اس کے خون میں ایک لمحے کیلئے ابال سا آیا تھا
کے باوجود وہ بڑے ضبط سے مسکرائی تھی۔

''کمال ہے مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میری ماں کا کلیجہ بھی ہے۔ خیر اماں! تو فکر نہ کر
رہی ہے تیرا بیٹا آتا ہی ہوگا۔ کلیجے میں خود بخود ٹھنڈ پڑ جائے گی۔'' اس کے دل میں جمع سارا
کی زبان تک آنے لگا تھا۔

''توبہ' توبہ اے جمیلہ! سمجھا اسے کوئی عقل مت دے' بتا اسے یہ گز بھر لمبی زبان اس ک
برداشت نہیں کریں گے' دو دن میں کاٹ کے رکھ دیں گے۔'' دادی نے حسب معمول مو
فائدہ اٹھانا چاہا' مگر وہ اس سے پہلے ہی اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

''کیا ہوا؟'' مینا نے تکیے پر غلاف چڑھاتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ نفی میں سر ہلاتی
پر گر سی گئی۔

''ابا سے کہہ کے دیکھنا۔ شاید ان ہی سے مل جائیں۔'' مینا آپی نے تجویز دی۔

''چھوڑو مینا آپی! اب کیا ابا سے بھی ذلیل کرواؤ گی۔'' اس نے دونوں بازوؤں میں
لیا۔

''لو خوامخواہ تم بات کرکے تو دیکھنا۔'' مینا آپی ان سب بہنوں سے زیادہ خوش گمان وا
تھیں۔ آخری دم تک وہ امید کی جوت بجھنے نہیں دیتی تھیں۔

''مینا! کیوں خوامخواہ اس بے چاری کو جھوٹی آس دلا رہی ہو' مجھے نہیں لگتا کہ ابا کو
احساس ہوگا کہ ان کے گھر میں جیتی جاگتی' سانس لیتی بیٹیاں بھی موجود ہیں۔'' مینا نے تکیہ چار
اچھال دیا' جسے درنجف نے فوراً...... سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

''بالکل میرا تو خیال ہے' ابا ہمیں روحیں سمجھتے ہیں' نہایت فرمانبردار' اطاعت گزار قسم کی
جو نہ سن سکتی ہیں' نہ بول سکتی ہیں اور نہ دیکھ سکتی ہیں۔ بس ضرورت پڑنے پر ان کا ہر حکم بجالا
روحیں ان کو تو صرف ایک نعرہ لگانا پڑتا ہے اور پھر روحوں کا مارچ پاسٹ شروع۔'' صدف کو
پر ہنسی آجاتی تھی' سو وہ اب بھی کھی کھی کرنے لگی تھی۔

نہیں ایسا تو نہیں کہ ہم لوگوں نے چپ رہ رہ کر خود کو انسانوں سے روحوں میں ڈھال لیا
یک ہم کہیں گے نہیں ابا کو کیسے معلوم ہوگا کہ ہمیں بھی کسی چیز کی ضرورت ہے۔'' اس کے ذہن
لمحے کیلئے خیال آیا تھا اور وہ تکیہ پھینک کر اٹھ بیٹھی تھی۔

ٹھیک ہے میں ابا سے بات کروں گی۔'' اس کے فیصلہ کن لہجے پر تینوں بہنوں نے ایک
ے دیکھا تھا۔

شام کو ابا روٹی' پانی کھا کر فارغ ہوئے تو وہ انگلیاں چٹخاتی ان کے عقب میں جا کھڑی
ابا تکیے سے ٹیک لگائے سگریٹ سلگا رہے تھے اس نے آہستگی سے انہیں پکار کر اپنی طرف
یا اور پھر جھجکتے ہوئے کچھ روپوں کا مطالبہ دہرا دیا۔

''کیا کرنے ہیں؟'' ابا نے بہت عام سے انداز میں پوچھا تھا۔ اسے قدرے حوصلہ ہوا۔

''یونیفارم لینا ہے ابا! بیگ اور جوتے بھی۔'' اس نے فوراً کہہ ڈالا۔

''اچھا یعنی پوری تنخواہ لگا دوں تجھ پر' ہے نا......؟'' ابا شاید اس کی بے وقوفانہ سوچ پر ہنسے تھے'
بھی ابا کا موڈ خوشگوار ہے۔

''اگر زیادہ پیسے نہیں ہیں تو صرف یونیفارم لے لوں گی۔ باقی چیزیں رہنے دوں گی۔'' باپ کی
کا خیال کرتے ہوئے اس نے فوراً ہی مطالبے میں کمی کر دی تھی۔

''نہ بھئی' نہ میرے پاس تو ایک بھی پیسہ فالتو نہیں۔'' ابا نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے نفی
ہلا دیا۔ وہ اپنی جگہ ششدر سی رہ گئی تھی' مگر ابا کی بے نیازی اور لاپروائی دیکھنے لائق تھی۔

''اگر ایسے ہی گزارہ کر سکتی ہے تو کر لے' نہیں تو سکول چھوڑ کر آرام سے گھر بیٹھ جا' پڑھ لکھ کر
ن سے تیر مارنے ہیں۔ کرنا تو یہ ہی ہانڈی چولہا ہے نا اور پھر ہم نے کون سا تجھ سے نوکری
ی ہے۔ ایویں خوامخواہ وقت اور پیسہ برباد کرنے کا فائدہ......'' ابا نے بچی کھچی سگریٹ کا ٹکڑا
مسلا تو اسے لگا ابا نے اس کے وجود کو بھی بڑی بے رخی سے مسل ڈالا ہے۔

''ابا! کیا ہماری ضرورتیں صرف اسی صورت پوری ہوسکتی ہیں جب آپ کے پاس فالتو پیسہ ہو
ر آپ کے پاس کبھی فالتو پیسے ہوئے ہی نا تو پھر......؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہوگئی تھی۔
چونک گئے تھے۔ گردن پوری طرح گھما کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''کیا کہا تو نے......؟'' جواباً وہ کچھ نہیں بولی تھی' بس چند لمحے ان کی آنکھوں میں آنکھیں
کھڑی رہی اور پھر نفرت سے منہ پھیر کر وہاں سے چلی گئی۔
ر خیال نظروں سے اس کی پشت کو گھورتے رہے۔ وہ آٹھ بہنوں کے اکلوتے بھائی ساری

عمر ایک جابر حکمران کی طرح ان پر مسلط رہے۔ بہنوں کو سونے کا نوالہ تو نہیں کھلایا' البتہ
سے دیکھا ضرور تھا۔ ان کی آواز سن کر بہنوں کی سانسیں رک جاتی تھیں۔ بیٹیوں کی طرف سے
مکمل لاپرواتھے۔ انہیں کسی گنتی میں رکھا ہی نہیں تھا' مگر بہنوں پر ہمہ وقت ان کی کڑی نگاہ
شاید اسی لئے شادی کے بعد وہ اسی گھر سے گئیں تو اب سالہا سال بعد ماں کی شکل دیکھ
تھیں۔ مگر آج بھی ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بھائی سے آنکھ ملا کر بات کرتیں یا ان کے سامنے
بلند کرتیں۔ یہ ہی وصف بیٹیوں نے بھی پایا تھا۔ مگر آج درنجف کے انداز بلکہ عجیب و غریب
نے انہیں چونکا دیا تھا۔

''کون سی کلاس میں پڑھتی ہے یہ؟'' انہوں نے پلٹ کر اماں سے پوچھا جو سونے کیلئے
بستر سنبھال چکی تھیں۔

''آٹھویں میں ہے......'' انہوں نے سر کے نیچے تکیہ درست کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں آٹھویں کا امتحان دے تو اس کا سکول جانا بند کروا دو لڑکیاں زیادہ پڑھ لکھ جائیں
پہ چڑھنے لگتی ہیں۔'' انہوں نے قدرے ناراضی سے کہا تھا۔

''ہاں ہاں تو اور کیا......؟ اس کی زبان تو ویسے بھی قینچی کی طرح کتر کتر کرتی ہے۔
سے جھگڑا شروع تو کبھی ماں کے سامنے زبان درازی۔''

سوتے میں کروٹ بدلتے ہوئے دادی کے کانوں میں ہلکی سی بھنک پڑی تھی۔
عادل بولنے سے باز نہ آئیں۔ بات میں اپنا حصہ ڈالا اور کروٹ بدل کر خراٹے لینے لگی تھی
کمرے میں لیٹی درنجف کی آنکھوں سے نیند ایک دم غائب ہو چکی تھی۔



رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب مینا آپی کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں پھیلی بلب کی
نے انہیں چونکا دیا تھا۔ انہوں نے گردن موڑ کر مندی مندی آنکھوں سے سامنے دیوار پر ٹنگی
وقت دیکھا تو دو سے کچھ اوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ انہوں نے طویل سانس لیتے ہوئے دائیں طرف
دوڑائی۔ حسب توقع درنجف اپنی نیند اور گہری ہوتی رات سے بے نیاز فریم ہاتھ میں لے
طرح مصروف تھی۔

''نجف! دو بج گئے ہیں' اب بس کرو' باقی صبح کر لینا......'' انہوں نے قدرے
سے اسے ٹوکا' جواباً نجف نے ایک لمحے کیلئے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر ''اچھا'' کہہ کر
مصروف ہوگئی۔

بے وقوف اس طرح آنکھیں خراب ہو جائیں گی تمہاری۔ پہلے کتابوں میں سر دیئے بیٹھی تھی
فریم پکڑ لیا ہے۔'' اسے نیا دھاگا سوئی میں پروتے دیکھ کر وہ خفگی سے کہنے لگیں۔
مینا آپی! بس یہ ایک دو پھول رہ گئے ہیں اب تو قمیص مکمل کر کے ہی سوؤں گی۔'' اس کے
مینا آپی نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی تھی۔ لیکن نجف کی بے آرامی کے خیال نے
ڈھنگ سے سونے نہیں دیا' تب جیسے وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھی تھیں۔
کیا ہے نجف! تم رات کو بھی چین سے سونے نہیں دیتیں۔''
مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ بے آرام ہو رہی ہیں ورنہ میں لائٹ بند کر کے باہر چلی جاتی۔'' وہ
شرمندہ ہو کر بولی۔
ہاں جیسے تب تو میں سو ہی جاتی۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی اٹھ کر اس کی چارپائی پہ آ گئیں
ہیں مسلنے کے بعد فریم اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔
مجھے اگر پتا ہوتا کہ تم یوں آدھی آدھی رات تک خود کو ہلکان کرتی رہو گی تو میں کبھی تمہیں یہ
سکھاتی۔'' انہوں نے سوئی ہاتھ میں لے کر خود کاڑھنا شروع کر دیا تھا۔
ایسے مت کہیں مینا آپی! میں تو آپ کو بہت دعائیں دیتی ہوں۔ یہ ہنر ہاتھوں میں نہ ہوتا تو
پھر سارے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے۔'' اس نے اپنی تھکن زدہ پوروں کو دوسرے
مٹھی میں دبا لیا تھا۔
نویں جماعت میں داخلہ لینا آسان تھوڑی ہے اور پھر اب تو سکول بھی بدل گیا ہے۔ نیا
نئی کتابیں' فیس' پھر سائنس کے مضامین میں تو پریکٹیکل کیلئے کاپیاں بھی الگ سے خریدنی
ہیں اور اگر مجھے ذرہ بھر بھی امید ہو نا مینا آپی کہ اماں' ابا میری ضروریات بخوشی نہ سہی بادل
نخواستہ ہی پوری کر دیں گے تو میں کبھی اتنی جان نہ کھپاؤں۔ لیکن جب سب کچھ بہت صاف اور
واضح دکھائی دے رہا ہے تو پھر کسی خوش گمانی کو دل میں جگہ دینا میرے نزدیک بے وقوفی ہی ہے۔''
''تم اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرنے لگی ہو درنجف۔''
مینا آپی نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا' جس کے چہرے پر سنجیدگی کا عنصر اتنا نمایاں ہو گیا تھا
عام حالات میں شاید کئی برس بعد دکھائی دیتا تھا۔
''ان باتوں کو چھوٹی یا بڑی عمر سے وابستہ نہیں کیا سکتا مینا آپی یہ سوچ تو ان رویوں کی دین
کا سامنا ہم بچپن سے کر رہے ہیں۔ بہت برا لگتا ہے مجھے حد سے زیادہ برا' جب ہمیں
سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے اس گھر میں صرف عظیم رہتا ہے یا

پھر ابا اور دادی اماں بھی ہم ہی میں سے ایک ہیں مگر وہ مصلحت کی چادر اوڑھے دوسری طرف
جا کھڑی ہوئی ہیں انہیں عظیم کی ڈھال مل گئی ہے اور وہ کسی ننھے خوفزدہ بچے کی طرح سب
سے چھپنے کیلئے عظیم کے پیچھے جا کھڑی ہوئی ہیں۔" اس کے وجود میں پنہاں تلخی پہلی بار
آشکار ہوئی تھی۔ وہ گم صم سے انداز میں اسے دیکھے گئیں۔

"باقی رہ گئے ہم تو بینا آپی! ہمیں اپنے لئے کنواں خود ہی کھودنا ہے ورنہ ہو سکتا ہے
پیاسے ہی مر جائیں۔" اس نے بینا آپی کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تو وہ جھرجھری سی
گئیں۔

"ایسی باتیں مت کیا کرو نجف! میرا دل بہت کمزور ہے۔" رات کے منجمد سناٹے میں
کی اندیشوں بھری آواز نے انہیں لمحہ بھر کیلئے سہا دیا تھا۔ نجف ان کی بات سن کر دھیرے
دی تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے نہیں کرتی ایسی باتیں۔" وہ چپ ہو گئی تھی۔

"نجف! تم نے ابا سے پوچھ لیا۔ کہیں داخلہ لینے پر انہیں اعتراض نہ ہو......؟" چند
خاموشی کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"انہیں میری پڑھائی پر اعتراض صرف اس وقت ہوا تھا جب میں نے اپنی ضرورت
کے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا۔ آئندہ ایسا کرنے کی نوبت آئے گی نہ انہیں اعتراض کرنے کا
گا۔" اس کا انداز پر یقین تھا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" انہوں نے دل سے دعا کی تھی۔

"اب تم فوراً سے پیشتر سونے کیلئے لیٹ جاؤ۔ کیونکہ تمہارا کام مکمل ہو چکا ہے۔" انہوں
پھول مکمل کر کے دھاگا توڑا اور قمیص تہہ کر کے الماری میں رکھ دی۔ پھر اس کے جواب کا انتظار
بغیر بتی بجھا دی۔



"اے اے تم کدھر کھسک رہی ہو......؟"

ناشتے کے برتن اکٹھے کرتے ہوئے در نجف نے پلٹ کر دیکھا۔ نینا صدف کو گھور رہی
دیوار پھلانگنے کو تیار کھڑی تھی۔

"کھسکنا کہاں ہے۔ بس یہیں ذرا پڑوس تک جا رہی تھی۔" صدف نے کھسیانی مسکراہٹ کے
ساتھ جواب دیا۔

"خدا کا واسطہ ہے۔ کبھی گھر میں بھی ٹک جایا کرو۔" مینا آپی رگڑ رگڑ کر سرخ اینٹوں والا فرش
ی تھیں۔

"ہاں تو اور کیا؟ اب تو تمہیں گھر سے باہر نہیں گھر کے اندر دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔" نجف
ونے والے برتن نل کے نیچے رکھتے ہوئے کہا تو صدف قدرے چڑ سی گئی۔

"تو یہاں گھر میں بیٹھ کر کیا کروں گی؟ میں جھاڑو پوچا تو لگا چکی ہو تم لوگ اب سارا دن یہاں
بیٹھ کر ایک دوسرے کی سڑی ہوئی شکلیں دیکھنے اور جلی کٹی سننے سے تو بہتر ہے بندہ آس پڑوس
جھانک آئے۔"

"ارے واہ ہم لوگ بھی تو نہیں سارا دن اسی گھر میں رہتے ہیں بلکہ میں تو کئی مہینوں سے گھر
باہر نہیں گئی۔" نینا نے باقاعدہ اسے جتلایا۔

"ہاں بھئی تمہارا ہی حوصلہ ہے میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس چیخ چیخ میں اماں کی گالیاں دادی
کے ابا کی جھڑکیاں اور اب تو اس بانگڑو کے بھی پر نکل آئے ہیں۔ وقت بے وقت آنکھیں
نے لگا ہے۔ پھر اس گھر میں رکھا ہی کیا ہے۔ نہ اچھا کھانے کو نہ اچھا پہننے کو۔ باہر جاتی ہوں تو کم
اچھا کھانے کو تو ملتا ہے۔ آج باجی حمیدہ کے گھر مہمانوں کو آنا ہے۔ ان کے ساتھ تھوڑی بھاگ
راؤں گی۔ کچھ برتن دھلواؤں گی اور پھر پیٹ بھر بھر کے مزے کی چیزیں اڑاؤں گی بریانی
اور قورمہ تو وہ اتنے مزے کا بناتی ہیں کہ بس......" اس نے بڑے زور کا چٹخارا لیا تھا۔ اماں
آج گھر پہ نہیں تھیں اسی لئے وہ کھل کر اتنا بول رہی تھی۔

"اچھا بھئی میں تو چلی......" اس نے دیوار کے ساتھ رکھے سٹول پر قدم جمائے۔

"اور ہاں یہ سٹول یہاں سے ہٹا دینا۔" اس نے انہیں ہدایت کی اور پھر نہایت پھرتی سے
پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئی تھی اور یہاں سے آگے نجانے کتنی دیواریں تھیں جو اس نے
سارے دن میں پھلانگنی تھیں۔

مینا آپی نے تاسف سے نینا کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا کر کمرے کی طرف پلٹ گئی جبکہ
برتنوں کی چکنائی پہ نگاہ جمائے برتن دھونا بھول چکی تھی۔



وہ ابھی ابھی استانی جی کے ساتھ سکول میں اپنی فیس جمع کروا کے آئی تھی اور آتے ہی بڑی
باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

"مینا آپی! خالہ صفیہ کڑھائی کے پیسے دینے نہیں آئیں کیا......؟" جواباً مینا آپی بغیر بولے

پیاز کاٹتی رہی تھیں۔

"استانی جی کہہ رہی تھیں آج شام وہ بازار جائیں گی۔ میں یونیفارم کا کپڑا اور چادر لا
کہہ آئی ہوں۔ کیونکہ میرا خیال تھا خالہ اب تک پیسے دے گئی ہوں گی' ایسا کرتی ہوں خود
معلوم کر لیتی ہوں' پھر وہیں سے استانی کو پکڑاؤں گی۔" وہ اپنی ہی رو میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی

"نجف! خالہ پیسے دے گئی تھیں......" مینا آپی نے کہا تو وہ ٹھٹک گئی۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کہاں رکھے ہیں؟"

"وہ اماں کو دے کر گئی تھیں۔" مینا آپی نے بتایا تو وہ عجلت میں باہر کی طرف لپکی۔

"نجف! تم میری بات تو پوری سن لو......" انہوں نے چڑ کر اسے روکا۔

"وہ پیسے اماں سے عظیم نے لے لئے تھے۔"

"کیا......؟" اسے دھچکا لگا۔ "لیکن کیوں......؟ وہ تو میری اپنی محنت کے تھے۔" وہ دکھ
حیرت سے انہیں دیکھنے لگی اور جب وہ کوئی جواب نہ دے پائیں تب وہ تیر کی طرح ماں کی
بڑھی۔

"اماں! وہ پیسے میرے تھے۔ آپ نے عظیم کو کیوں دیئے......؟"

"اس نے دیکھ لئے تھے۔ اگر نہیں دیتی تو کئی برتن ٹوٹ جاتے' ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔"

"کیوں ہنگامہ کر دیتا وہ اس کے باپ کے پیسے تھے کیا......؟ خود کما کر لایا تھا......؟"
کھانے والے لہجے میں بولی تھی۔

"بس اب ہو جا شروع۔" اماں نے غصے سے اسے دیکھا۔

"تو کیوں نہ ہوں شروع' اماں! وہ میری اپنی محنت کی کمائی تھی۔ رات رات بھر جاگ کر
آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ میری انگلیوں میں چھید ہو گئے اماں اور تم نے کس آسانی سے وہ
اسے سونپ دیئے۔" اسے غصے سے زیادہ رونا آ رہا تھا۔

"اسے ضرورت تھی۔ وہ لے گیا' جب میرے پاس آئیں گے تو......" اماں نے اسے ٹالنا
مگر وہ پھٹ پڑی۔

"نہیں چاہئیں مجھے کسی کے پیسے اور پھر کیا ضرورتیں ہیں آپ کے بیٹے کی......؟ کیا میں
جانتی' سارا سارا دن اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ پان کے کھوکھے پر بیٹھا رہتا ہے کیا ضرور
ہو سکتی ہیں اس کی' کوئی فلم دیکھنی ہوگی' کہیں میچ کھیلنے جانا ہوگا' اپنے ان لالچی اور بدخصلت دو
کو کسی ہوٹل کا اچھا سا کھانا کھلانا ہوگا یا پھر کسی بیٹھک میں بیٹھ کر جوئے کی بازی لگانی ہوگی' اس

اماں! کہ اس کی ضروریات کی تسکین ہم نہیں کر سکتے۔ اگر ابا کی تنخواہ اور تمہاری سلائی اس
پوری نہیں پڑتی تو جا کر کہیں محنت مزدوری کر لے' مٹی گارا ڈھوئے' مگر ہماری محنت پر ہاتھ
نہ کرے۔" وہ روتے روتے بولتی چلی گئی تھی۔

"تو دیکھ لو' بہنیں بھائیوں پر جان دیتی ہیں اور ان سے اپنے اکلوتے بھائی کی چھوٹی
ہی برداشت نہیں ہوتیں۔" دادی اس پہ برس پڑیں۔

"یہ خوشیاں نہیں عیاشیاں ہیں' عیاشیاں' جن کا پیٹ بھرنے لگیں گے تو ایک دن یہ ہم سب کو
یں گی' پچھتائیں گے آپ سب' سر پہ ہاتھ رکھ کر روئیں گے' مگر پھر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کسی
معلوم وہ کس رستے پر جا رہا ہے' دن رات کہاں گزارتا ہے' اتنے ڈھیر سارے روپے کہاں
ہے' یہ عیاشیاں ایک روز بہت بڑی قیامت لائیں گی۔ بہت بڑی......"

دادی نے چپل اٹھا کر اسے کھینچ ماری تھی۔ ان کا خیال تھا وہ بددعائیں دے رہی ہے انہیں اور
چہیتے پوتے کو شام تک وہ یوں ہی کمرے میں پڑی وقفے وقفے سے روتی رہی اور دادی کی
سنتی رہی۔ پھر دروازہ کھلا اور استانی جی کی چھوٹی بیٹی آ گئی۔

"اماں نے یہ کپڑا اور چادر بھیجی ہے کہہ رہی تھیں پیسے بعد میں لے لیں گے۔" وہ کپڑے اس
رکھ گئی تھی۔ در نجف کتنی ہی دیر تک بے یقینی سی حالت میں پڑی رہی۔

"واہ میرے مولا کتنا کارساز ہے تو۔ میں جس مقام پر بھی تھک کر گرنے لگتی ہوں تو وہیں
طنابیں میرے ہاتھ میں دے کر ایک بار پھر کھڑا کر دیتا ہے۔" اس کی پلکیں احساس تشکر
گئی تھیں۔



ل کے میٹرک کے پیپر ہو رہے تھے۔ کیمسٹری کا پیپر دے کر وہ سینٹر سے باہر نکلی تو بھوک سے
ہو رہا تھا۔ ایک تو بے تحاشا گرمی چمکتی دھوپ' اس پر ہوا بھی بند تھی۔ بڑی سے چادر میں خود کو
ل گھر تک آتے ہوئے وہ بے حال ہو گئی تھی' دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوتے ہی چادر
لانے تقریباً پہنچی تھی اور ابھی سانس بھی نہ بحال کر پائی تھی جب باہر سے عظیم دندناتا ہوا اس

کون تھا وہ لڑکا......؟" انتہائی بگڑے بگڑے تیور اور گھٹیا لہجہ۔

کون سا لڑکا......؟" باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رکی تھی اور حد درجہ
اسے دیکھنے لگی تھی۔

"وہی تیرا کچھ لگتا جو روز گلی کے موڑ پہ کھڑا ہوتا ہے تجھے سلام پیش کرنے کو۔" وہ پھاڑ کر
والے لہجے میں بولا تھا اور درنجف کی رنگت ایک پل میں اڑ گئی تھی۔ یہ کوئی نئی کہانی بننے جا رہی
جس کا اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔

"پہلے تو صرف سنا تھا آج آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" اس کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔

"یہ بکواس نہیں حقیقت ہے' پوچھ اماں اس سے کیوں کھڑا رہتا ہے وہ صبح و شام گلی کے
کیوں دانت نکالتا رہتا ہے؟" اس نے باورچی خانے میں دم بخود سی کھڑی اماں کو بھی
گھسیٹ لیا۔ وہ پوری طرح دوستوں کے بہکاوے پہ آ چکا تھا۔

"یہ اس کے دماغ کا فتور ہے اماں! اور اگر کوئی آوارہ کتا گلی کے موڑ پہ کھڑا بھی ہوتا
مجھے اس کی کوئی خبر نہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"ہاں بہت معصوم ہے نا تو ایک تجھے ہی خبر نہیں باقی تو پورے محلے کو معلوم ہے سیدھی
کہہ کہ بے غیرت ہوگئی ہے تو' حیا مرگئی ہے تیری' نجانے کتنے عاشق ہوں گے جو ہر روز راہ
ہوں۔"

"میرے سامنے زیادہ چیخنے کی ضرورت نہیں' ورنہ منہ توڑ کے رکھ دوں گا میں۔" وہ پہلے
زیادہ زوردار آواز میں دھاڑا تھا۔

"اپنی حد میں رہ کر بات کرو عظیم! اور کسی غلط فہمی میں مت رہنا میں وہ زبان کاٹ
دوں گی جو مجھ پر اس قدر رکیک الزام لگائے گی۔" درنجف کا عظیم کی آنکھوں میں آنکھیں
کہنا ہی قیامت ہوگیا تھا۔ وہ تو یوں بھڑکا تھا جیسے کسی نے بارود کے ڈھیر کو آگ دکھا دی ہو۔

"ارے تجھے تو میں چولہے میں جھونک دوں گا' بے غیرت تیری اتنی جرأت......" وہ کم
انسان کی طرح بھاگ کر چولہے سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا لایا تھا۔ مینا آپی چیخ مار کر اس
لپکیں۔

"وہ عظیم! عظیم رک جا......" اماں بھاگ کر اس کے سامنے آ گئیں۔

"تو نے سر پہ چڑھا رکھا ہے اسے' پر میں برداشت نہیں کروں گا۔" وہ غصے میں عقل
بھلا بیٹھا تھا' انہیں ایک طرف دھکا دیتے ہوئے وہ دیوانگی کے عالم میں آگے بڑھا تھا۔ مگر ا
پہلے کہ وہ اس پہ وار کرتا' صدف نے ششدر کھڑی نجف کو بروقت بازو سے پکڑ کر کمرے
تھا اور سرعت سے دروازہ بند کرکے کنڈی چڑھا دی تھی اور اگر وہ ایسا نہ کر لیتی تو سلگتی ہوا

پر لگنے کے بجائے سیدھی اسی کے جا لگتی۔ اس دفاعی ردعمل نے اسے مزید مشتعل کر دیا تھا
تھا کہ وہ دروازہ توڑ کر ہی دم لیتا' مگر اماں اور مینا آپی اسے کھینچ کھانچ کر پرے لے گئی
اندر کمرے میں اس پکڑ دھکڑ کی آوازیں سن کر وہ صدف کے کندھے سے لگی تھر تھر کانپتی رہی اور
بکتا جھکتا گھر سے باہر نکل گیا تب نینا نے بھاگ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کہیں چوٹ ووٹ تو نہیں آئی......؟" دروازہ کھلتے ہی وہ سیدھی اس کی طرف لپکی تھی۔ وہ
انداز میں دیکھے گئی۔ تب ہی باہر ابا کی آواز آئی اور اس کے جیسے مردہ تن میں جان پڑ

میں ابا کو بتاؤں گی' ایک باپ اپنی بیٹی پر لگا الزام کبھی برداشت نہیں کرسکتا خواہ لگانے والا
بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔" وہ تیر کی طرح باہر کو لپکی تھی۔

ٹے گھڑے کے ٹھیکرے' یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا پانی' دادی کی بڑبڑاہٹ اور اڑے
چہرے ابا کو گھر میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ مگر اس
کہ کوئی کچھ کہتا دادی نے من و عن ساری صورتحال انہیں بتا دی۔

"ابا! یہ سب جھوٹ ہے بکواس' میں کسی کو نہیں جانتی......" اس نے فوراً صفائی پیش کی تو دادی
بولیں۔

"ارے عظیم نے خود دیکھا ہے اسے تیرے ساتھ ہنستے بولتے۔" رائی کا پہاڑ بن رہا تھا۔

"دیکھا تھا تو بے غیرت بن کر یہاں کیوں چلا آیا؟ وہیں اس کے دانت توڑ کر مجھے گھسیٹتا ہوا
کیوں نہ لے آیا......؟" اس کے اندر جوار بھاٹا پھوٹ رہا تھا۔

"ارے تو تو نجانے کس کس کے ساتھ آنکھ مٹکا کرتی پھرتی ہے' وہ بے چارہ خوامخواہ کیوں
مول لے۔"

"خدا کا واسطہ ہے دادی! اپنے بڑھاپے کا ہی کچھ خیال کرلو۔ مت اتنا ظلم کماؤ۔" وہ بے
کی ان کے سامنے ہاتھ جوڑ بیٹھی۔

"نجف......" ابا نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔ یہ گستاخی انہیں ہرگز پسند نہ آئی تھی۔

"اگر عظیم کو تمہارا باہر نکلنا پسند نہیں تو دفع کرو پڑھائی کو۔"

"عظیم کو تو میرا سانس لینا' ہنسنا بولنا بھی نہیں پسند تو کیا گلا بھی گھونٹ لوں۔" آواز اس کے
گھٹ کر رہ گئی۔

"وہ بھائی ہے تیرا' غیرت والا ہے جوان خون ہے' کہیں کچھ کر کرا نہ بیٹھے اور ویسے بھی یہاں

پہلے کون سی ڈگریاں......" وہ نجانے کیا کہہ رہی تھیں' درنجف روتی ہوئی کمرے میں بھاگ آئی
"کس نے کہا کہ وہ بھائی ہے میرا' بھائی ایسے ہوتے ہیں' بہنوں پر الزام لگانے والے
دکھ دے کر خوش ہونے والے' وہ تو بہنوں کا آسرا ہوتے ہیں' مان ہوتے ہیں۔ چھپایا ہوئے
ان کی عزت کے رکھوالے' لڑکی کے کردار میں برائی ہو تو غیر اس کی تشہیر کرتے ہیں' باہر سے
آتی ہے اور مجھ پر الزام لگایا ہے تو گھر والوں اور وہ بھی اس نے جسے ابا میرا بھائی کہہ رہے ہیں
وہ رات اس نے جاگ کر روتے ہوئے گزاری تھی۔ صبح تک وہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ا
گھر سے قدم باہر نہیں نکالے گی۔ اگلے پیپر میں تین چھٹیاں تھیں۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی کس
طرف نہیں دیکھا۔ پہلا دن بیتا' پھر دوسرا' تیسرے روز وہ بری طرح بے چین ہو گئی تھی۔ م
پیپر رہ گئے ہیں' اگر دے لیتی تو میٹرک ہو جاتا' وہ بے قراری ادھر سے ادھر پھرتی رہی۔ کئی بار
چھپ کر روئی۔ گھر کے ایک ایک فرد کے سامنے گڑگڑائی کہ کسی طرح ابا سے اجازت دلوا
جب کسی نے مان کر نہ دیا تو وہ ڈھیٹ بنی ابا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
"ابا! صرف دو پیپر رہ گئے ہیں' خدا کی قسم وہ سب جھوٹ ہے۔ میں کسی کو نہیں جانتی!
اگر مجھ پہ بے اعتباری ہے تو کسی کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ دادی کو' اماں کو' بھلے عظیم مجھے سکول
چھوڑ آئے۔ صرف دو دنوں کی بات ہے۔ دو سال کی محنت برباد ہو جائے گی۔"
ابا کٹھور سے بنے سگریٹ کے کش لیتے رہے اور وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کے سامنے
کرتی رہی اور پھر نجانے کیسے ابا نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اظہار تشکر کے طور
کے پاؤں چھو کر اٹھی اور پھر ساری رات پیپر کی تیاری میں گزار دی۔



شام کا وقت تھا۔ دھوپ تقریباً رخصت ہو چکی تھی اور گھر کی دیواریں ڈوبتے سورج کی
شعاعوں کی زد میں دھیرے دھیرے سلگ رہی تھیں۔ آنگن میں غیر معمولی خاموشی کا راج تھا
کمرے کی کھڑکی سے صحن میں پھیلتی' بڑھتی شام کو دیکھتے ہوئے بے وجہ سی سوچوں میں الجھی ہو
اور سماعتیں غیر ارادی طور پر دور مساجد سے آتی اذان کی آوازوں پر مرکوز تھیں۔ مینا آپی اس
وقت باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ اماں برآمدے کے فرش پر کپڑا بچھائے مشین کے
صاف کر رہی تھیں۔ صدف حسب معمول گھر سے غائب تھی۔ دادی کی بڑبڑاہٹیں وقفے وقفے
ابھر کر اس پرسکون ماحول میں شگاف ڈالتیں اور پھر معدوم ہو جاتیں۔ وہ کوئی تیسری مرتبہ
میلی چادر دھونے کا کہہ چکی تھیں' مگر وہ سنی ان سنی کر کے اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔ تب جیسے نینا

خانے سے نکلی تھی۔ ایک خفا خفا سی نگاہ اس پر ڈال کر اس نے دادی کی چادر اٹھائی اور نل کے
بیٹھی۔
"دادی کے پاس اس خدمت گزاری یا فرمانبرداری کا کوئی کھاتہ نہیں ہے نہ ہی اس اطاعت
پر تمغے پہنائے جائیں گے' پھر خود کو ہلکان کرنے سے فائدہ......" اس نے جھاگ اڑاتی نینا
ہوئے چہرے پہ نگاہ ڈال کر سوچا تھا' تب ہی بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا تھا' اس نے
زاویہ بدل کر دیکھا۔ ابا اپنی سائیکل سمیت گھر میں داخل ہو رہے تھے۔
"ارے کہاں چلے گئے سب کے سب۔ کسی کو اتنا ہوش نہیں کہ وہ جو دن بھر مشقت کرنے کے
آیا ہے تو اس سے دو گھونٹ پانی کا ہی پوچھ لیں۔"
ابھی چارپائی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ دادی دہائی دینے لگی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ اماں
آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا' جس پر نینا فوراً سے پیشتر ہاتھ دھو کر باورچی خانے
بڑھی تھی' عین اسی وقت مینا آپی پانی کا جگ ہاتھ میں لئے کچن سے باہر آ گئی تھیں۔
"یہ شخص ہمارے لئے محبت و شفقت کی نہیں' خوف کی علامت ہے۔ یہ گھر میں داخل ہو جائے
سوچ کر بولنا پڑتا ہے۔ سہم کے قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ سانس کی آواز تک دھیمی کرنی پڑتی ہے۔
کے سامنے آتے ہیں تو اپنے ہی وجود میں چھپنے لگتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ اور یہ ہی تو ذمہ
اس دنیا میں' اس گھر میں ہماری آمد کا' پھر یہ ذمہ داری قبول کیوں نہیں کرتا' پہلو کیوں بچاتا
رہے بے ضرر وجود اس کیلئے آزار ہیں' مگر کیوں......؟"
"تو کیا کر رہی ہے ادھر۔ چل ادھر جا کے کام کر......" انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں ابا نے نینا کو
جو دھلی ہوئی چادر تار پہ پھیلا رہی تھی۔ اس نے دیکھا نینا کا چہرہ ایک لمحے کیلئے پھیکا پڑا تھا'
بے چاپ باورچی خانے میں چلی گئی تھی' تب ابا نے اپنے اطراف میں دیکھا تھا اور پھر دادی
ہوتے ہوئے ان کے کان پر جھک گئے تھے۔ اس نے دیکھا جوں جوں ابا بات کہتے جا
دادی کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھرتی جا رہی تھی۔ ان کا انداز نجف کو قدرے مشکوک سا لگا

"لیکن کس کیلئے......؟" دادی نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا تھا۔
"اس نے تو کسی کا نام نہیں لیا۔ پر مینا بڑی ہے تو ظاہر ہے......" ابا کی بات اس کی سمجھ میں
رہی تھی۔ لیکن اس کی چھٹی حس نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے کمرے کے دروازے تک
لئے دیکھا' ابا اپنی بات میں پوری طرح مگن تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی کچن میں آ گئی'

ابا اور دادی کی چارپائی باورچی خانے کی کھڑکی کے نزدیک تھی اور یہاں باتوں کی آواز بخوبی دے رہی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا مینا آپی کھڑکی کی جالی سے لگی کھڑی تھیں ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے سوالیہ انداز میں ان سے کچھ پوچھنا چاہا' مگر انہوں بغیر کچھ کہے بے جان سے انداز میں کھڑکی سے سر ٹکا دیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کھڑکی تک آ

''بیٹوں کی شادیاں کر چکا ہے۔ دونوں الگ گھروں میں رہتے ہیں۔ ایک بیٹی تھی' پچھلے اسے بھی بیاہ دیا۔ بیوی کئی سال پہلے فوت ہو چکی ہے کہتا تھا گھر میں کوئی دو وقت کی روٹی پکا نہیں' لڑکی کا ہاتھ' ہاتھ میں دے دو گے تو زندگی سہل ہو جائے گی۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔'' ابا نجانے کس کی خوبیاں گنوا رہے تھے۔

''وہ تو ٹھیک ہے' لیکن امیر دین اور مینا کی عمروں میں تو......'' اماں نے کچھ کہنا چاہا دادی نے تیز لہجے میں انہیں ٹوک دیا تھا۔

''آئے ہائے کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا' عمروں کے فرق سے اور کوئی ایک دو تو ہیں کہ بیٹھے ڈاکٹروں' وکیلوں کا انتظار کرتے رہیں۔ خیر سے پوری لائن لگی ہوئی ہے لڑکیوں کی کو کھڑی کرو تو دوسری پیچھے سے سر نکالنے لگتی ہے' ارے میرا بچہ تو انہیں بیاہتے بیاہتے ہی ہو جائے گا اور اوپر سے ان کے کرتوت اللہ توبہ۔ وہ صدف ہے تو اسے میں نے کبھی گھر بیٹھ نہیں دیکھا۔ چھوٹی کی زبان تو فراٹے بھرتی ہے' دس جماعتیں پاس کر کے سمجھتی ہے دنیا جہان خرید لی ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔''

دادی کو سب سے زیادہ قلق اس کے میٹرک پاس کرنے کا تھا' سو موقع ملتے ہی اپنا دکھ لگی تھیں۔

''اچھا تو اماں پھر ہاں کہہ دوں اسے......'' ابا نے اکتائے ہوئے انداز میں ان کی توجہ بات کی طرف دلائی۔

''ہاں' ہاں تو اور کیا گھر میں آئے رشتے کو ٹھکرانا کوئی عقلمندی تو نہیں' پھر امیر دین میں کیا ہے......؟''

دادی نے ابا کے فیصلے پر بڑی سہولت سے مہر ثبت کر دی تھی' نجف نے کھڑکی کی جالی اپنے ہاتھ گاڑتے ہوئے بڑی امید سے اماں کی طرف دیکھا تھا' مگر انہوں نے بھی چپ چاپ فیصلے کی حمایت میں سر جھکا دیا تھا۔

''نجف......! نجف......! یہ مینا آپی کو دیکھو کیا ہو رہا ہے......'' نینا کی متوحش آواز

مینا آپی نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے' آنکھیں میچے دیوار کے ساتھ گھسٹتی ہوئی زمین پر بیٹھ رہی تھیں۔

''مینا آپی!'' اس نے بھاگ کر انہیں تھام لینا چاہا۔

''مینا آپی! کیا ہو رہا ہے آپ کو......؟'' نینا کو پانی لاتے دیکھ کر وہ فوراً ہی ان کے ہاتھ تھامنے لگی تھی۔ مینا آپی کے بے حد سرد اور بے جان ہوتے ہاتھوں نے اسے سہما دیا تھا۔

''نینا! نینا! ابا سے کہو ایسا مت کریں' نینا میں مر جاؤں گی۔'' ان کا پورا وجود جیسے درد بن کر کراہا

''خدا کا واسطہ ہے خود کو سنبھالو۔ اس طرح مت کرو ورنہ......'' نینا نے ایک گھبرائی ہوئی نگاہ باہر بیٹھے افراد پر ڈالی تھی۔

''نینا! میں سہہ نہیں پاؤں گی۔'' دل میں اترتے درد کی شدت سے نڈھال ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا سر اس کے کندھے پر گرا دیا تھا۔ ان کے جسم پر بری طرح لرزہ طاری تھا اور آنکھوں سے آنسو گالوں پر گرتے ہوئے بے تحاشا بوجھ سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں ان کے سرد ہاتھوں کی گرفت نجف کے بازو پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

''کسی کو بلاؤ' پکارو' کوئی ہے جو مجھے بچا لے۔ کوئی ہے۔'' ان کی آواز لمحہ بہ لمحہ ڈوب رہی تھی۔ نینا ان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے سسکیاں بھرنے لگی تھی۔

''خدارا انہیں روک لو' مجھے بچا لو میں...... میرے خواب' میرے خواب۔''

ششدر سی بیٹھی نجف نے دیکھا مینا آپی کی گرفت سے اس کا ہاتھ چھوٹ رہا تھا' مگر وہ کسی ڈوبتے بچے کی مانند سہارا تلاش کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے دائیں گوشے سے پانی کا قطرہ گرا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے ہاتھ پر پڑتا اس نے سرعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس کی پشت پر ایک انگارہ سا سلگا تھا اور آن کی آن میں اس کے وجود کو بھڑکتے ہوئے الاؤ میں بدل گیا تھا اور اس نے جس سختی سے اپنے کندھے سے لگی' مینا آپی کو نینا کی طرف دھکیلا تھا خود نینا بھی گرتے گرتے بچی تھی۔ وہ اپنی بے ترتیب سانسوں کے ساتھ چند لمحے اس روتی دھوتی مخلوق کو دیکھتی رہی تھی۔ جو اپنی کمزوری اور بے بسی کی انتہائی پست حدوں کو چھو رہی تھی۔

''کوئی دوسرا بچانے کیلئے نہیں آئے گا۔ ہمیں خود ہی لڑنا ہوگا روؤ مت' خدا کا واسطہ ہے روؤ مت۔ میں ہوں نا میں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تم سن رہی ہو مینا! میں ایسا نہیں ہونے دوں گی' آنسو پونچھ لو۔ میں تم لوگوں کو بچا لوں گی۔''

اس نے ہوش وحواس کھوتی مینا آپی کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ وہ خود کو آسمان کی مانند بلند اور
محسوس کر رہی تھی۔ اس لاچار مخلوق کو اپنے سینے میں چھپا لینا اسے بہت آسان دکھائی دے
کوئی منہ زور طوفان تھا اس کے وجود میں جو بھر گیا تھا۔ اس کی بلند ہوئی آواز میں ایک
ایسی مردانگی تھی کہ باہر چارپائی پہ بیٹھے تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ چونک گئے تھے۔

وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ نینا اسے روکنے کی
کرتی وہ دندناتی ہوئی ابا کے سر پہ جا پہنچی تھی۔ اسے لگا وہ بہت بہادر ہے، بہت طاقتور۔ وہ
دنیا کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اسے نینا اور مینا آپی چڑیا کے ان بے پر بچوں کی طرح لگ رہی
پہلی بارش میں ہی زمین پر آ گرتے ہیں اور بارش کے نوکیلے قطروں کو اپنے وجود پر سہنے کیلئے
ہوجاتے ہیں اور انہیں بچانے کیلئے وہ ایک دم چڑیا بن گئی تھی۔ ایسی چڑیا جو اپنے بچوں کو ہر
اور طوفان سے محفوظ رکھنے کیلئے انہیں اپنے پروں تلے چھپا لیتی ہے۔

"ابا! یہ نہیں ہوگا۔ مینا آپی کی شادی ایک بوڑھے شخص سے ہرگز نہیں ہوگی۔" ابا
بولے انتہائی کڑی نگاہوں سے سرتاپا اسے دیکھا تھا۔

"نجف! چل اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ۔" اماں نے مختصر الفاظ میں انتہائی سخت
تھی۔

"نہیں اماں! تم اپنی بیٹیوں کو مرتے ہوئے دیکھ سکتی ہو۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"ارے کیوں بھیجتی ہے اسے، آج اس کے باپ کو بھی اس کے کرتوت دیکھنے دے۔"
نے جلتی پر تیل چھڑکا تھا۔

"ہاں دیکھ لو میرے کرتوت۔ میں اپنی ماں کی طرح بے حس نہیں ہوں، باپ کی طرح
ہوں، تم سب لوگ ہمیں مار دینا چاہتے ہو، مگر میں ایسا کچھ بھی نہیں ہونے دوں گی، جو تم لو
سوچ رکھا ہے۔ بڑی آپا کی طرح مینا آپی سے بھی ناانصافی نہیں ہونے دوں گی۔" اس کی
شدت غضب سے بھینچ گئی تھیں اور گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔

"اچھا کیا کرلے گی تو......؟" ابا کی آنکھیں آگ برسانے لگی تھیں۔

"کچھ بھی کچھ بھی کرلوں گی، مینا آپی کو زہر دے دوں گی، اس پہ تیل چھڑک کر آگ لگا
یا اس کے دل میں چھرا گھونپ دوں گی، مگر یہ سب...... یہ سب نہیں ہونے دوں گی۔"

اس کی آنکھوں میں جنون سا اتر آیا تھا اور ابا جی جلتی ہوئی سگریٹ فرش پر پھینک کر
سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے لب بھینچے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

پھر اس کی آنکھوں میں اٹھتی بغاوت اور نفرت تک رسائی ہوتے ہی ان کا ہاتھ گھوما تھا اور
دار تھپڑ نے اسے کئی فٹ دور گرا دیا تھا۔

"تیری اتنی ہمت، اتنی جرأت......" ابا نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا تھا اور اس پہ تھپڑوں کی
دی تھی۔

"ہاں ہے مجھ میں اتنی جرأت، اتنی ہمت ہے کہ میں تم سب سے لڑ سکوں۔" وہ ہذیانی انداز
ی تھی۔

"تو لڑے گی اپنے باپ سے، ارے پہلے تجھے ہی زہر نہ دے دیں، تجھے ہی آگ نہ لگا دیں بد
بخت......" دادی الگ گلے پیٹنے لگی تھیں۔

گھر میں جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔

نجف کی چیخ وپکار ابا کی گالیاں، کوسنے اس پہ دادی کی مزید شہہ......

نینا بے ہوش ہوتی مینا کو چھوڑ کر باہر کی طرف لپکی تھی۔ وہ تو پہلے ہی جھٹکے سے سنبھل نہ پائی تھی،
مینا کی غیر ہوتی حالت کی پریشانی اس پر یہ شور شرابا، اس نے پوری قوت سے چیخ کر ابا کو باز
کی کوشش کی تھی، مگر آواز اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ پورے بدن پر اسی طرح
طاری ہوا تھا کہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ کر نجف کو بچانے کی کوشش نہ کرسکی تھی۔ الٹا اس
خوفزدہ ہوئی کہ گرتی پڑتی کمرے میں جا گھسی اور اپنے عقب میں دروازہ دھاڑ سے بند کر کے
کنڈی بھی چڑھا دی۔ صحن سے آوازیں ابھی بھی آ رہی تھیں۔

نجف کی کمزور آواز دبتی جا رہی تھی اور اب کی دھاڑ پورے ماحول پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔

منہ پہ رکھے سسکیاں روکنے کی کوشش کرتی ہوئی زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"اے پاک رب! اے سوہنی ذات والے! تھوڑی نظر کرم ہم پہ بھی تھوڑی رحمت۔ تھوڑی
ہم گنہگاروں پر بھی ہم آزمائے جانے کے قابل نہیں بخش دے ہمارے گناہوں کو یہ سزا ہے تو
معاف کردے۔ اسے پروردگار معاف کردے......" وہ سجدے میں گر کر گڑگڑاتی چلی گئی تھی۔



رات کافی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ مینا آپی جیسے تیسے خود کو سنبھالے ایک بار پھر بند دروازے
سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں، جس کے دوسری طرف پھیلی غیر معمولی خاموشی انہیں ہولائے دے
تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک دروازے کو ہولے ہولے تھپتھپاتے ہوئے نجف کو پکارتی رہیں اور پھر
ہار کر وہیں دروازے کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئیں اور بے بسی سے ان افراد کو دیکھنے لگیں جو سرتا

یا چادریں اوڑھے صحن میں چارپائیوں پر غافل پڑے تھے۔ نینا ان کے ساتھ بہت دیر تک
تھی، لیکن وہ بہت خوفزدہ تھی اور اس نے کچھ کھانے پینے یا کسی سے بات کرنے کی کوشش
تھی۔

صدف نے ہمسایوں کے گھر نجف کی چیخ و پکار سنی تھی اور وہیں پر دبک گئی تھی اور پھر
گھر میں داخل ہوئی تھی، جب رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ دادی کو تو آج
کی نیند آئی تھی۔ ابا کچھ دیر بعد ہی گھر میں آئے تھے اور ایک بار پھر بکنے جھکنے کے بعد
لیٹے تو جلد ہی خراٹے لینے لگے تھے۔

عظیم کا تو اس معاملے سے جیسے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ شام کو اسی افراتفری میں کھانا
سے تیار نہیں ہوسکا، جس پر دو چار گلاس اور کپ توڑنے کے بعد باہر نکل گیا تھا۔ تب اماں
ڈالے اس کے پیچھے لپکی تھیں اور بلا کر نان کباب منگوا کر اسے کھلا کر ہی دم لیا تھا اور اسی ماں
سے جنم لینے والی بیٹی کمرے میں بھوکی پیاسی پڑی تھی، جسے ایک بار بھی ہمدردی سے نہیں پکارا
جب مینا آپی نے دبے دبے لفظوں میں شکوہ کیا تھا تب وہ زہر خند لہجے میں بولی تھیں۔

"اپنا کیا خود ہی بھگتے گی نا، کس نے کہا تھا اس سے کہ باپ کے سر پہ چڑھ دوڑے۔"

بس گم صم سی ان کا چہرہ تکتی رہ گئی تھیں۔

"نجف باہر نہیں آئی ابھی تک۔" مینا آپی کے کندھے پر اچانک ہی کسی نے ہاتھ
بری طرح کانپ گئیں۔ سر اٹھا کر انہوں نے متفکر سی نینا کو دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر
ہلا دیا۔

"نجف! نجف دروازہ کھولو نجف! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، تم ٹھیک تو ہونا؟"

نینا دروازے سے سر ٹکائے لگاتار اسے آوازیں دینے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف
ہلکے سے کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی اور ان دونوں کی منتظر نگاہیں بند دروازے پر جم کر رہ گئی تھیں
اور جوں ہی روازے کے پٹ ذرا سے وا ہوئے تھے نینا دروازہ دھکیل کر کمرے میں
ہوگئی تھی۔ نجف کنڈی کھول کر چارپائی پہ جا بیٹھی تھی۔ مینا آپی نے اپنے عقب میں دروازہ بند
ہوئے دیکھا، شام کی مار پیٹ کے نتیجے میں نجف کے ماتھے پر گہری چوٹ آئی تھی، جس میں سے
نکلنے کے بعد وہیں جم گیا تھا۔ اس کے دوپٹے پر بھی کہیں کہیں خون کے دھبے لگے ہوئے تھے
اینٹوں والے فرش پر گرنے کی وجہ سے اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اوپر والی سائیڈ سے بری
چھلی ہوئی تھیں۔ نینا کی تو گویا جان میں جان آئی تھی، اسے زندہ سلامت دیکھ کر، لیکن مینا آپی

ں نے کانٹوں پہ رکھ دیا تھا۔ انہوں نے تڑپ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور اس کی پیشانی
ہونٹ رکھ دیئے تھے۔

"کیوں کیا تم نے یہ سب؟ میرے لئے، صرف میرے لئے نا۔" احساس جرم اور احساس
ایک ساتھ ان پہ وارد ہوا تھا۔

"خوامخواہ اتنی تکلیف اٹھائی تم نے، اتنا درد سہا۔ ارے میں بھگتا لیتی اپنی قسمت کو، جیسے تیسے
رہ کرلیتی اس وقت چوٹ نئی نئی تھی نا۔ سہہ نہیں پائی تم دونوں کو بھی پریشان کردیا۔ پر تو نے
زخم کھائے گڑیا! میں ٹھیک ہوجاتی نباہ کرلیتی اپنے مقدر سے۔ ابا کے حکم پر آرام سے سر جھکا
"

"تو اب جھکا لینا سر، بھگتا لینا اپنی قسمت کو اور نباہ لینا اپنے مقدر کو میں نے کون سے میدان فتح
لئے ہیں۔" نجف نے تلخی سے کہا اور اکتاہٹ آمیز بددلی کے ساتھ مینا آپی سے الگ ہوگئی۔

"گزارہ تو کرنا ہی ہوگا جیسے تیسے منی! سانس لیتے مٹی کے مادھو جو ٹھہرے، جدھر کوئی اشارہ
ے گا ادھر کا رخ کرلیں گے۔" پہلے بڑی آپا اپنے شوہر کی معذور بیوی اور اس کے بچوں کی آیا
ی کررہی ہیں۔ اب تم بھی اس خرانٹ بوڑھے کے ناز نخرے اٹھا لینا۔ نینا کیلئے کوئی شرابی جواری
جائے گا۔ صدف کو کسی راہ چلتے سے بیاہ دیں گے اور مجھے تو شاید زمین میں زندہ ہی گاڑ دیا
ے۔ سلطنت کے حکمران کے سامنے سر اٹھانے کی گنہگار جو ٹھہری۔"

"آہستہ، آہستہ بولو نجف۔" نینا نے اس کی بلند ہوتی آواز سے گھبرا کر اس کے ہونٹوں پہ
رکھ دیا تھا۔

"بے فکر رہو اب نہیں بولوں گی، ایک مرتبہ بول کر انجام دیکھ لیا ہے اور مجھے یقین ہے انجام ہر
یہی ہوگا......" وہ بہت اکھڑے لہجے میں بات کررہی تھی۔ نینا اور مینا آپی آنکھوں میں کئی خدشات
ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

"رات آنکھوں میں کاٹ لینے سے کچھ نہیں ہوگا! بہنو اسی لئے بہتر ہوگا کہ اب تم بھی نیند
لوٹو۔" وہ اچانک ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"رکو نجف! میں تمہارا زخم......"

"چھوڑیں مینا آپی! اس زخم کی پروا کسے ہے، جسم پہ لگا ہے رفتہ رفتہ بھر ہی جائے گا، ہاں جو گھاؤ
کا ناسور بنتے جارہے ہیں ان کا کوئی علاج تمہارے پاس ہو تو بتاؤ؟"

وہ بہت عجیب انداز میں کہتی اور انہیں دیکھتی ہوئی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی تھی اور چادر جھٹک

کرسر تک اوڑھ لی تھی۔



کائنات کی آتی جاتی گھڑیوں میں بعض گھڑیاں بہت فیصلہ کن ہوتی ہیں اور ا
درنجف پر بھی آئی تھی۔ فیصلہ بہت بڑا تھا' مگر اچانک ہو گیا تھا۔ عین اسی وقت جب اس نے
مینا آپی کو خضاب لگے بالوں والے عمر رسیدہ امیر دین کے پہلو میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس روز
ابا سے بڑھ کر خوش نہیں تھا اور درنجف کو لگ رہا تھا کہ ابا کے حلق سے نکلنے والے قہقہے اور ا
کے چہرے پہ پھیلی جان دار مسکراہٹ ان کا مضحکہ اڑا رہی ہے' ان کی تذلیل کر رہی ہے او
ہے۔

"کیا لینے آئی تھیں تم اس دنیا میں' کیوں اپنے اَن چاہے وجود کے ساتھ ہم پر
تھیں۔ لو اگر اس دنیا میں آئی تھیں تو اب بھگتو' تم سی ارزاں ذات کے ساتھ بھلا اس سے بہ
اور کیا کریں......؟"

یہ ہی وہ وقت تھا' جب ایک فیصلہ کن ساعت اس کے دل پہ آ کر ٹھہر سی گئی تھی۔
استانی کو اپنے شوق کا اپنے جنون کا احوال سنایا تھا۔ استانی اس کی لگن سے واقف تھیں
ذہانت کی معترف تھیں۔ انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر وہ اس گھر میں رہی تو اس کا انجام دوسر
سے مختلف نہیں ہوگا' بلکہ ان سے بھی بدتر ہوگا' کیونکہ وہ احتجاج کرنے کی صلاحیت رکھتی تھ
حق کیلئے زبان کھول سکتی تھی۔ انہوں نے اسے ایک ایڈریس دیا تھا جو ان کی رشتے کی بہن
بیوہ تھیں اور کسی گھر میں ملازم تھیں۔ اس گھر میں انہیں سرونٹ کوارٹر بھی ملا ہوا تھا۔ ا
آنکھوں سے شکریہ ادا کر کے وہ ایڈریس لے لیا تھا اور اس شام جب بڑی آپا صرف دو دن
کے بعد واپس اپنے سسرال جا رہی تھیں تو وہ اس طرح سے ان سے گلے ملی تھی گویا انہیں ا
جذب کر لینا چاہتی ہو۔ اس کے اس والہانہ انداز پر بڑی آپا کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور ا
جب سب لوگ خواب وخرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے وہ جاگ رہی تھی' اس کی کھلی نیند
آنکھیں آسمان پر ٹکی ہوئی تھیں' بدن پر اوڑھی چادر کے نیچے اس کا ہاتھ کپڑے کے سلے ہو
پر تھا' جس میں وہ اپنا ضروری سامان اور کچھ روپے رکھ چکی تھی۔ تیاری مکمل تھی' مگر دل تھا
کے کانٹے پر پڑا تھا۔ کبھی ایک طرف جھک جاتا تو کبھی دوسری طرف۔ دماغ فیصلے پر عمل کر
کرنے کے درمیان ساکت تھا۔

"یہ اچھی بات نہیں' اگر کچھ بھی ویسا نہ ہوا جیسا تم نے سوچ رکھا ہے تو......؟" کوئی ا

لزور کر رہا تھا۔

"رسک لینا ہوگا' اگر یہاں رہی تو میرے ساتھ بھی یہ ہی کچھ ہوگا"، مستقبل کے اندیشے اور
ات اسے فرار پر مجبور کر رہے تھے۔

"پیچھے رہ جانے والوں کی کوئی پروا نہیں......؟" احساس جرم کچوکے لگا رہا تھا۔

"ان کیلئے کچھ نہیں کر سکتی۔ اپنے لئے کوشش تو کر دیکھوں۔" وہ تھوڑی خود غرض ہوئی۔

"تمہاری اس حرکت سے پیچھے رہ جانے والوں کی زندگی مزید بدتر ہو جائے گی۔" وہ انجام
بے خبر نہیں تھی۔

"بہتر تو اب بھی نہیں۔" اسے ادراک تھا۔

"لوگ بیٹیوں کے مر جانے کی دعا کیا کریں گے۔" دنیا کا خوف حاوی ہوا۔

"ایسی زندگی دینے سے تو بہتر ہوگا۔" اپنی ذات کی پامالی اسے منظور نہ تھی۔

"ماں باپ کیلئے طعنہ بن جاؤ گی۔"

"فخر کا تمغہ بھی میں ہی پہناؤں گی۔" اسے یقین تھا۔

"اللہ اکبر۔" قریبی مسجد سے آواز ابھری تھی۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ بس اسی وقت کا انتظار
اس نے نڈھال ہوتے دل کو حوصلے کی طنابیں تھمائیں اور چادر ہٹا کر چارپائی سے نیچے اتر
۔ چند لمحوں کیلئے سب کے غافل ہونے کا یقین کرتے ہوئے اس نے اپنے سامان کے تھیلے کو
لی سے دبوچا اور اپنی اتھل پتھل سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی
ا دروازے کی طرف آ گئی۔

"اگر کوئی اٹھ گیا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا......؟" اندھیرے میں سینکڑوں نگاہیں اسے گھورتی ہوئی
ا ہو رہی تھیں۔ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا اور زبان سوکھ کر
ے جا لگی تھی۔ اس نے تاریکی میں دروازے کی بند کنڈی کو ٹٹول کر کھولنا چاہا تھا' مگر عین اسی
اس کے عقب میں چارپائی ہولے سے چرچرائی تھی اور کنڈی اس کی پسینے میں بھیگی کپکپاتی
ا سے چھوٹ گئی تھی۔ رات کے سناٹے میں چھناکے کی ہلکی سی آواز ابھری تھی اور اسے سن کر گئی
۔ اپنا بھیانک انجام سوچنے میں اسے ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔ وہ ساکت و جامد اپنی جگہ کھڑی
مگر اس کی پشت پر ایک بار پھر ویسی ہی خاموشی چھا گئی تھی۔

اس نے گویا سانس روک کر گردن موڑی۔ ہر وجود بے حس و حرکت تھا۔ دادی کے لمبے لمبے
دلی اور اما کے خراٹوں کی آواز بہ خوبی سنائی دے رہی تھی۔ عظیم کی چارپائی چھت پر تھی۔ اماں

نے حسب عادت سوتے میں اپنا چہرہ دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ صدف کی نیند تو ہمیشہ
گہری ہوتی تھی اور اس کے ساتھ خود اس کی اپنی چارپائی خالی تھی۔

"اور جب صبح کو یہ چارپائی یونہی خالی پڑی ہوگی تو کون سی قیامت ہوگی جو اس گھر
آئے گی۔" اس نے جھرجھری لیتے ہوئے نگاہیں ہٹا لیں۔ اس کی چارپائی کے عین برابر
چارپائی تھی' جو صبح سے گم صم تھی اور جس کی آنکھوں میں حد درجہ وحشت اور ویرانی بھر گئی تھی۔

"خدا حافظ۔" اس کے لبوں نے بآواز جنبش کی تھی اور آنکھوں میں دھند سی اترنے لگی
اس دھند کے پار نہ جانے کیوں اسے لگا تھا کہ نینا کی آنکھیں کھلی ہیں اور اسے دیکھ رہی
دہشت اور دکھ کا ایسا عجیب لمحہ تھا کہ اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رو دینے کو چاہا۔ خود پہ قابو
مشکل تھا۔ بے تحاشا سراسیمگی کے عالم میں اس نے دروازے کے پٹ وا کئے اور باہر
آخری لمحہ تک اسے یہ ہی محسوس ہوا تھا کہ نینا جاگ رہی ہے اور اسے دیکھ رہی ہے۔ درواز
سامنے بنی دو چار بوسیدہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ سختی سے ہونٹوں پر جما
اپنی بے قابو سسکیوں کو دبانا چاہا تھا۔ گلی میں آ کر اس نے اپنے لڑکھڑاتے قدموں میں تیز
سسکیاں ہچکیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ وہ قدم بہ قدم گھر سے دور ہوتی جا رہی تھی اور نینا کی
نے ابھی تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ گلی بالکل سنسان تھی' پہلا موڑ مڑتے ہی اس نے
طور پر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

وہ رو رہی تھی اور بھاگتی جا رہی تھی' صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی' جب ہی بس سٹا
تھا۔ اس کی ہچکیاں دم توڑ گئی تھیں' اپنا آنسوؤں میں بھیگا چہرہ اس نے چادر میں چھپایا تھا او
سٹارٹ ہوتی بس پہ سوار ہو گئی تھی۔



تین' چار گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد بس بالآخر رک گئی تھی۔ لیکن اس
ہوئے پیروں میں تھرتھراہٹ ابھی بھی موجود تھی۔ سیاہ چادر سے منہ لپیٹے وہ بہت گم صم سی بیٹھ
کسی گہری سوچ میں تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھی خاتون نے اسے ہلکا سا ٹہوکا دیا۔

"اترنا نہیں ہے کیا......؟"

اس نے ہلکا چونک کر اس عورت کی طرف دیکھا' جو اسے گہری نگاہوں سے جانچ رہی
کی آنکھوں میں در نجف کیلئے شک ہی شک تھا۔

"اکیلی ہو؟ تمہارے ساتھ کوئی نہیں......؟"

عورت کا لہجہ تجسس لئے ہوئے تھا۔ وہ جواباً چپ چاپ بیٹھی رہ گئی تھی۔ گھر سے تو بہت کچھ
لے کر نکلی تھی' وہ مگر اب سب کچھ ادل بدل ہو گیا تھا۔ بلند حوصلگی' کم ہمتی میں بدل گئی تھی۔
ارادے بھربھری ریت کی طرح ڈھے گئے تھے۔ اپنے پندار' اپنی ذات' اپنے تشخص کو بچانے کی
ں اب شدت سے کسی پناہ کی چاہ میں بدل گئی تھی۔

"واہ نجف بی بی! چار گھنٹے کی مسافرت میں ہی سب کچھ کھو دیا۔ ابھی تو آغاز سفر ہے' ابھی
سوا نیزے پر نہیں پہنچا اور ابھی تو رات کی تاریکی بہت دور ہے۔ پھر ابھی سے کچھ سجھائی کیوں
دے رہا۔" اسے ان ہتھیاروں کے کھو جانے کا افسوس ہوا' جن کے آسرے پر وہ گھر سے نکلی

"اے لڑکی! گونگی بہری تو نہیں ہو تم......؟ دیکھ بھی سکتی ہو کہ نہیں......؟ بس ساری کی ساری
ہو گئی اور تم ہو کہ میرا راستہ روکے بیٹھی ہو۔" وہ عورت اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر قدرے
ا سے چلائی تھی۔

نجف نے ہلکی سی جھرجھری لے کر اپنی زائل ہوتی قوتوں کو سمیٹا اور منجمد وجود کو بہ وقت حرکت
ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بس سے نیچے اتری تو چلتے پھرتے انسانوں کا ایک اژدھام گویا اس کو
لینے کیلئے تیار کھڑا تھا۔

ٹریفک شور' ہنگامہ' ہارن کی آوازیں' لوگوں کی چیخ و پکار' پریشان حال گری کی شدت سے
ئے ہوئے مسافر' سیٹیاں بجاتے ہوئے منچلے کنڈیکٹر' چائے' شربت بنانے والے نان کبابوں
آوازیں لگانے والے زمین پہ پہلا قدم رکھتے ہی اسے یوں لگا تھا جیسے پوری کائنات لمحہ بھر کیلئے
ے گھومی ہو اور پھر ایک نقطے پر آ کر رکی ہو' اس نے جسم کے ایک ایک مسام سے پھوٹتے پسینے کو
ف کرتے ہوئے قدم آگے بڑھائے اور رش سے قدرے باہر آ گئی' تب ہی ایک ٹیکسی والا اس
طرف بھاگا بھاگا آیا تھا۔

"آؤ' آؤ بی بی جلدی کرو۔" اس نے نجف کے بازو کو چھوتے ہوئے کہا تو وہ جیسے کرنٹ کھا
کر پیچھے ہٹ گئی۔

"نن' نہیں مجھے کہیں نہیں جانا۔" ٹیکسی والا اس کے جواب سے بدمزہ ہو کر کسی اور کی طرف
اور ابھی وہ دو قدم بھی چل نہیں پائی تھی' جب ایک رکشہ اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلنا ہے جناب! کرائے کی بات نہیں بنی تو ہمارے ساتھ آ جائیے' بالکل مناسب

کرایہ ہوگا۔"

اس نے اپنے پان سے رنگے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے نہایت گھٹیا انداز میں
نجف کو اور کچھ نہیں سوجھا تو پاس سے گزرتی ایک عورت کے ساتھ چل پڑی۔ رکشہ ڈرائیور
سے ماچس کی تیلی نکال کر دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بہت دور تک نظروں ہی نظروں
سہمی چڑیا کا تعاقب کیا تھا۔

درنجف کچھ دیر تک اس عورت کے شانہ بشانہ چلتی رہی' لیکن جب ایک دو بار اس عو
نہایت عجیب نظروں سے گھورا تو اس کے قدموں کی رفتار خود بخود ست پڑ گئی اور کچھ دیر بع
عورت سے علیحدہ ہو کر فٹ پاتھ پہ چلنے لگی تھی۔ چہرے سے پھسل جانے والی چادر کو در
ہوئے اس نے اپنا پسینہ خشک کیا اور اطراف میں دیکھنے لگی۔ بھاگتی دوڑتی ٹریفک کا بے
اس کے دل و دماغ میں ہیجان برپا کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہر چیز' ہر انسان اس کا
اپنے اپنے مقام پر موجود ہے' مگر صرف ایک وہ ہے جو اپنے مقام سے ہٹ گئی ہے۔ جو ہ
معلق ہے۔

جس کے قدموں تلے بچھی زمین نے بے رخی سے اپنا دامن سمیٹ لیا ہے اور جس
آسمان بھی اسے پناہ دینے کے بجائے اپنی ازلی بے نیازی کے ساتھ اسے نظر انداز کر رہا
اب احساس ہو رہا تھا کہ ایک چار دیواری اور ایک چھت کے نیچے بیٹھ کر منصوبہ بنانا کس ق
ہے اور کھلے آسمان کے نیچے بے یار و مددگار کھڑے ہو کر کسی کو مدد کیلئے پکارنا کس قدر دشوار
نے تو سوچا تھا کہ بس سے اترے گی سواری پکڑے گی اور وہ اسے مطلوبہ ایڈریس پر پہنچا د
اب ایک خوف تھا جو پوری طرح اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ اب اسے ہر رکشہ ڈرائیور ایک
تھا۔ ہر ٹیکسی ڈرائیور کی نگاہیں ہوس ناک لگ رہی تھیں' ہر باریش آدمی سوانگ رچائے لگ
ہر راستہ گویا کھائی طرف جاتا محسوس ہو رہا تھا اور ہر قدم گویا دلدل میں دھنستا ہوا محسوس ہو

"کیا کروں......؟" اپنے سامنے سے گزرتے لاتعداد انسانوں میں سے کسی ایک
کیلئے نہ پکار سکی تھی۔ بے جان ہوتی ٹانگوں نے بھی جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تو
سی ہوتی ہوئی' مرے مرے قدم اٹھاتی فٹ پاتھ کے دوسری جانب لگے شہتوت کے درخت
ڈھے گئی تھی۔ ارد گرد کوئی بھی موجود نہیں تھا' اس نے چہرے سے چادر ہٹا دی تھی اور لمبے
لے کر جیسے رکتی ہوئی سانسوں کو بحال کرنے لگی۔ گھڑی بھر کیلئے وہ کچھ پرسکون ہوئی تو
بخود اسی گھر کی طرف چلا گیا جہاں اس وقت یقیناً ایک کہرام مچا ہوا تھا۔

اور ہنا' صدف کیا سوچ رہی ہوں گی میرے بارے میں۔ مینا آپی کو بھی خبر ہو گئی ہو گی اور
ے جیسے کا عذاب بھی ان پر نازل ہوگا۔" اس کے آنسو جلتے بلتے دل پہ گرنے لگے تھے۔
معلوم نہیں اماں کو دکھ ہوگا یا وہ غصے میں آ کر دادی کے ساتھ مل کر میرے مرجانے کی دعا کر
ں گی......؟" اس نے ان ہی پسینے سے تر بتر ہتھیلیوں کو چادر سے رگڑا۔ تب ہی اس کے
کا سا کھٹکا ہوا تھا' اس نے بری طرح گھبرا کر سر اٹھایا۔

ٹھنڈا پانی۔" ایک نوعمر لڑکا ہاتھ میں کولر اور گلاس لئے کھڑا تھا۔

ں نے اپنے خشک پپڑی زدہ ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلانا چاہا' مگر
ے کئے گئے وعدے یاد آ گئے تھے۔

سفر میں کسی سے کچھ لے کر نہیں کھانا' کچھ پینا نہیں۔ اونگ کبھی نہیں آنی چاہئے۔ کیا خبر
ت لگائے بیٹھا ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی کہ کوئی مجھ پر قابو پا سکے۔" وہ کم عمر تھی' مگر
ا کہ کس چیز کے چھن جانے کا خطرہ ہے اور یہ کہ اس کے پاس سب سے قیمتی چیز کیا ہے۔

نہیں' نہیں چاہئے۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا' مگر پیاسی آنکھوں نے بہت دور تک اس
ے جاتے قدموں تک پیچھا کیا تھا۔ وہ چلا گیا تھا لیکن اسے احساس دلایا گیا تھا کہ وہ کئی پہر
ی ہے۔ آج صبح سے نہیں پرسوں رات سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ایک رات وہ احتجاجاً
ی تھی اور دوسری رات اس لئے بھوکی رہی تھی کہ وہ مینا آپی کی قبر پہ چڑھائے گئے گوشت اور
سے اپنے شکم کو پر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ں نے شہتوت کے تنے سے ٹیک لگا کر خالی نظریں خاکستری زمین پہ گاڑی دی تھیں۔ تب
ی ہوا چلی تھی اور ٹپ ٹپ کی آواز کے ساتھ سیاہی مائل سبز شہتوت اس کی گود میں آ گرے
ں نے ایک بے تاب سی خواہش کے ساتھ یہ میوہ اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے سر اوپر اٹھایا۔
نیاں اس کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیل گئی۔ اسے
ہ ایک ایسے مست الست بھکاری کی مانند لگا تھا۔ جو بے سروسامانی کے عالم میں کسی درخت
ے بیٹھا ہوا اور قدرت اس کیلئے کھانے کا بندوبست کر رہی ہو اور اسی لمحے اسے خیال آیا تھا
تاک دینے کیلئے گھر سے نہیں نکلی تھی۔

"کب تک بیٹھی رہوں گی یہاں......؟" آسمان کے عین وسط میں انگارہ بنے سورج پر زوال
الی گھڑیاں اترتے دیکھ کر اس نے فکرمندی سے سوچا۔

"شام اور پھر سیاہ' تاریک رات۔" آنے والی گھڑیاں یکلخت ہی پھنکار اٹھیں۔

"مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ کسی سے مدد کوئی ہمدرد۔" سخت گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ
تھیلے سمیت اٹھی اور سڑک کی طرف آ گئی۔

"کیا کروں......؟ رکشہ لے لوں......؟ یا ٹیکسی......؟ راستوں کا علم نہیں، اگر کسی اور جا
لے گیا تو؟"

نہایت تکلیف دہ سوچ دل میں ابھری تھی اور ابھی وہ کوئی فیصلہ بھی نہ کر پائی تھی جب اچا
ہی شور مچاتا رکشہ اس کے نزدیک آ کر رک گیا تھا اور ڈرائیور کو دیکھتے ہی اس کی روح تک فنا
تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس سے اڈے پر بس سے اترتے ہی اس کا ٹاکرا ہوا تھا۔

"ابھی تک ادھر ہی گھوم رہے ہو جناب! ہمیں خدمت کا موقع کیوں نہیں دیتے۔" وہ نہ
عیاری و مکاری سے مسکراتے ہوئے سرتاپا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

درنجف نے بے تحاشا دھڑکتے ہوئے دل پہ قابو پا کر کڑی نگاہوں سے اسے گھورا تھا
اس کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف چلنے لگی۔ اسی وقت اس نے رکشہ سٹارٹ ہونے کی
سنی۔

"میں نے کہا بادشاہو! ہم سے کوئی خفگی ہے کیا......؟" اسے اپنے برابر رکشہ چلاتے د
اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ فوری طور پر اسے اور کچھ نہیں سوجھا تو وہ سڑک کراس کر کے ایک
سڑک کی طرف مڑ گئی اور ابھی وہ سکون کا سانس بھی نہیں لے پائی تھی، جب اس نے اپنے عقب
ایک بار پھر رکشہ رکنے کی آواز سنی تو وہ گھبرا کر پلٹی۔ وہ رکشہ اسی سڑک کے عین سامنے روک کر خو
اتر رہا تھا۔

"یہ میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟" اسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے
تیز تیز قدم اٹھاتی کوئی راہ فرار ڈھونڈنے لگی تھی۔ یہ سڑک غالباً اس کالونی کی مین روڈ تھی
یہاں دائیں بائیں کتنی ہی چھوٹی چھوٹی سڑکیں نکل رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بغیر
سمجھے پہلا موڑ مڑ گئی تھی۔

یہاں غالباً رہائشی کوٹھیاں تھیں اور اس چھوٹی سی سنسان سڑک پر اپنی ہی سانسو
سرسراہٹ اور اپنے ہی پیروں کی چاپ سنتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بہت بڑی غلطی
ہے۔ سڑک پر تو لاتعداد افراد موجود تھے۔ وہاں یہ شخص اس سے بدتمیزی نہیں کر سکتا تھا، لیکن ا
وہ کوئی گڑبڑ کر دیتا تو وہ اس کا کیا بگاڑ لیتی۔

"نہیں اگر اس نے کوئی بدتمیزی کی تو میں چیخنے چلانے لگوں گی۔ اس کا چہرہ لہولہان کر دو

ی نہیں ہونے دوں گی۔"

جسم کو سرد اور کمزور محسوس کرتے ہوئے اس نے خود کو حوصلہ دیا تھا اور قدموں کی رفتار
بھی تیز کر دی تھی۔ مگر عقب میں نزدیک ہوتی قدموں کی چاپ سن کر اس کی رہی سہی قوتیں
ہوتی جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں وہ شخص واقعی اس سے کوئی بدتمیزی کرنا چاہ رہا تھا یا خوامخواہ
اساں کر کے حظ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر یہ لمحات نجف کیلئے قیامت کی گھڑیوں سے کم
ے اور اس کے درمیان ختم ہوتے فاصلے کو بڑھانے کیلئے وہ تقریباً بھاگنے لگی تھی۔

"ارے رکو سنو تو سہی......" وہ عقب سے پکار رہا تھا اور درنجف کو اس کی آواز ایک ایک ایسے
مشابہ لگی تھی، جو چڑیا کے بال و پر سے بے نیاز بچے کو اپنے ظالم اور بے رحم پنجوں میں
اڑ جانا چاہتا ہو۔ درنجف نے ٹوٹتی سانسوں اور سفید پڑتے چہرے کے ساتھ دیکھا وہ لمبے
بھرتا اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"نہیں یا اللہ......" خوف و دہشت سے بے حال ہوتے ہوئے اس نے پوری قوت سے
روع کر دیا تھا اور بھاگتے ہوئے وہ اپنے اور اس شخص کے درمیانی فاصلے کے تعین کیلئے بار بار
دیکھ رہی تھی، اسی عالم میں دوڑتے ہوئے نجانے کیا چیز سامنے آئی تھی کہ وہ زوردار ٹھوکر کھا کر
ح گھٹنوں کے بل زمین پہ جا گری تھی۔ غیر ارادی طور پر ہی ایک طویل چیخ اس کے حلق سے
ی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی وہ منحوس شخص اپنے مکروہ چہرے پہ غلیظ مسکراہٹ سجائے
ر پہ آ کھڑا ہوا تھا۔

"ارے کیوں گھبرا رہی ہو خوامخواہ، ہم تمہیں کوئی نقصان تھوڑی پہنچائیں گے۔" وہ اس کی
قدرے جھک کر مسکرایا۔

"دیکھو تم خبردار جو......" اس نے لاکھ بہادر بننے کی کوشش کی تھی، مگر اس کی حلق میں پھنسی
ڈرا سہا انداز اس کے سب راز فاش کر گیا تھا اور اس ہوس پرست انسان کو مزید شہ دے گیا

"دیکھ ہی تو رہا ہوں چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔" وہ نجانے کیا بکواس کر رہا تھا، نجف
طا ہوتے اوسان سمیت سن نہ پائی تھی۔ اسے تو بس اس بھیڑیے کی آنکھوں کی بڑھتی ہوئی
ڈرا رہی تھی۔

"اگر، اگر تم نے مجھ سے بدتمیزی کی، تو...... میں شور مچا دوں گی۔" وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح
ں پھیلائے...... اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اس کی دھمکی نے سامنے والے پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ بلکہ

وہ نہایت ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

''ارے شور مچاؤ گی تو مجھ جیسے دو چار اور نکل آئیں گے یہاں' مفت کا مال بھلا کے بُرا ہے۔ اب زیادہ نخرے مت دکھاؤ اور چلو میرے ساتھ۔'' اس کا لہجہ اور تاثرات ایک دم ہی بدل تھے۔

''نہیں چلو گی تو ابھی میں سب لوگوں کو اکٹھا کر کے تمہارا پول کھول دوں گا۔ گھر سے ہوئی لڑکی کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ سب میری بات کا اعتبار کریں گے' صرف میری بات کا۔ میرے ساتھ۔''

اسے نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر وہ جارحانہ تیوروں سے اس کی طرف بڑھا تھا' مگر اس سے کہ وہ اسے کلائی یا ہاتھ سے پکڑ کر قابو میں کرتا اس نے کسی ان دیکھی قوت کے زیر اثر اسے زو دھکا دیا تھا اور اپنی گرتی ہوئی چادر کو بھول کر سرپٹ وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ عالم وحشت میں دھند بھاگتے ہوئے اسے اپنے پیچھے بھاگتے قدموں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ وجہ تھی کہ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ سامنے سے آتی گاڑی کو بھی نہ دیکھ پائی تھی اور اپنی ہی دھ بھاگتی ہوئی زور دار طریقے سے اس گاڑی سے جا ٹکرائی تھی۔ گاڑی کے بریک پوری قوت چرچرائے تھے اور در نجف کا پیچھا کرتے ہوئے شخص نے اسے گاڑی سے ٹکرا کر...... گرتے د وہیں سے ایک بغلی گلی میں داخل ہو کر بھاگ نکلا تھا۔

جبکہ ایک نوجوان سرعت سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا' ساتھ ہی پچھلے درواز اس کا ڈرائیور بھی نکل آیا۔ وہ بھاگتا ہوا نجف کی طرف آیا جو تپتی ہوئی سڑک پر بے حس پڑی تھی۔ سیاہ گاگلز ہاتھ میں لے کر وہ فوراً پنجوں کے بل بیٹھ کر اس پر جھکا تھا۔

''اوہ گاڈ'' نجف کے ماتھے سے بہتا خون دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے نے فوراً سے پیشتر کلائی تھام کر اس کی نبض کا معائنہ کیا اور پھر ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے سر جھٹکتے اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پہ وقت دیکھا اور پھ ہاتھ مار کر رہ گیا۔

''کیا کیا جائے......؟'' اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

''صاحب آپ کو دیر ہو رہی ہے۔''

''ہاں' لیکن......'' وہ سوچتے ہوئے۔ پھر واپس پلٹ کر دوبارہ نجف کی طرف جھکا۔ ہوش میں آنے کے کوئی آثار نہ دیکھ کر اس نے جیسے کوئی آخری فیصلہ کیا۔ اسے اٹھا کر گاڑی

ڈالا' پھر دروازہ بند کرتے ہوئے یونہی سرسری سی نظر اس جگہ دوڑائی جہاں وہ گاڑی سے تھی' کچھ فاصلے پر اسے ایک چادر اور بیگ نما کوئی چیز دکھائی دی تو ڈرائیور کو انہیں اٹھا لانے کا پھر وہ چادر نجف کے بے ہوش وجود پہ ڈال دی اور ابھی اس نے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھنے کا کیا تھا' جب خیال آیا کہ نجف کو اٹھاتے ہوئے وہ اپنے گلاسز وہیں سڑک پر رکھ آیا تھا۔

''میری فلائٹ اسی چکر میں گول ہو کر ہی رہے گی۔'' وہ سخت جھنجھلا کر بھاگا تھا اور گلاسز اپر چڑھا کر ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرنے سے پہلے اس نے پلٹ کر پچھلی طرف دیکھا اور اس بے سدھ وجود کو جوں کا توں پڑے دیکھ کر اس نے تاسف سے سر جھٹکا موڑ کر فل سپیڈ پہ چھوڑ دی تھی۔



دانیال حسن گم صم سے انداز میں کھڑکی سے باہر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ جب دھاڑ کی آواز کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا۔ انہوں نے بری طرح چونک کر دیکھا تو چند لمحے کیلئے انہیں اپنی پر یقین نہیں آیا۔

''رضا! تم' تمہیں تو اس وقت ایئر پورٹ پہ ہونا چاہئے تھا......؟''

''ضرور ہونا چاہئے تھا ایئر پورٹ پر' اگر راستہ میں ایک نئی مصیبت نازل نہ ہو گئی ہوتی۔ وہ تو بروقت بریک لگ گئے ورنہ اس وقت وہ خود کو عالم بالا اور مجھے سلاخوں کے پیچھے بھجوا چکی نجانے کہاں سے بھاگتی آئی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی میری گاڑی سے آ لگی۔ کسی اور ہاسپتال لے جاتا تو وہاں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ بہر حال آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ اسے دیکھ لیجئے۔'' رضا بولنے پر آتا تھا تو کسی کی نہیں سنتا تھا اور اس وقت تو یوں بھی بہت ہوا لگ رہا تھا۔

''آپ جلدی کریں نا دیکھ لیں اسے لڑکی ہے' زخمی حالت میں ڈرائنگ روم میں ہے' میری میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔'' اس نے بے حد فکر مندی سے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور ان ل چیئر دھکیلنے لگا۔

''ارے تو تم جاؤ نا میں دیکھ لوں گا۔'' انہوں نے اصرار کیا۔

''نہیں اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو؟ اور میں وہاں جا کر بھی پریشان ہی رہوں گا۔'' ڈرائنگ روم کر رضا نے ان کی چیئر صوفے کے بالکل قریب کر دی تھی۔ ان کی ڈاکٹری نظر پہلی بار میں ہی ئی تھی کہ معاملہ سیریس نہیں ہے' پھر بھی رضا کی تسلی کیلئے انہوں نے اس کے ماتھے کے زخم کو

سرسری سے انداز میں دیکھا' نبض کا معائنہ کیا۔ رضا بے چینی سے صوفے کی بیک پہ جھکا
بھری نظروں سے اس کے ماتھے پہ جمے خون کو دیکھ رہا تھا۔

''نہیں بھئی کوئی گڑبڑ نہیں معمولی زخم ہے غالباً خوف کی وجہ سے بے ہوش ہے' اس ل
فوراً سے پیشتر نکل جاؤ۔'' انہوں نے رضا کی طرف رخ موڑتے ہوئے کہا۔ جانتے تھے ک
میں اس کا فائنل سمسٹر شروع ہونے والا ہے۔ اگر یہ فلائٹ مس ہوگئی تو اس کا بہت حرج ہوگا۔

''آر یو شیور......؟'' وہ سیدھا ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''اوہ یس ہنڈرڈ پرسینٹ۔'' انہوں نے پراعتماد طریقے سے اسے یقین دہانی کرائی۔

''او کے پھر میں تو چلا۔'' وہ بہت افراتفری میں دروازے کی طرف لپکا اور پھر وہیں
کر ان تک آ گیا۔

''مجھے لگتا ہے یہ ایکسیڈنٹ ہوا ہی اس لئے کہ میں آپ کو دوبارہ دیکھ سکوں۔'' اس نے
بازوؤں میں انہیں بھینچا' ہاتھ پکڑ کر لبوں سے لگایا اور ان کی پیار بھری نظروں کے سامنے
دروازے سے نکل گیا۔

''وہاں پہنچ کر مجھے اطلاع ضرور کرنا۔'' انہوں نے حسب عادت عقب سے آواز لگائی
لڑکی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے انہوں نے گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز بہت
سے سنی تھی اور پھر احمد کو آواز دے کر میڈیکل باکس لانے کو کہا تھا' احمد کے آنے تک وہ
پڑی لڑکی کا جائزہ غیر ارادی طور پر لے چکے تھے۔

''زرد' پژمردہ' بے رونق چہرہ' لاغر وجود اور معمولی کپڑے۔''

انہوں نے میڈیکل باکس کھول کر چند ضروری چیزیں باہر نکالیں اور اس کا زخم صاف
لگے' تب ہی لڑکی کے لبوں سے ہلکی سی کراہ برآمد ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے' اس ک
ہولے ہولے لرز رہی تھیں اور چہرے پہ تکلیف کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

''ہیلو آنکھیں کھولو بھئی میری آواز سن رہی ہو نا۔'' اسے پوری طرح ہوش میں لانے ک
اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے پکار رہے تھے۔ چند لمحے بعد لڑکی نے کرب آمیز کراہ کے ساتھ آ
کھول دی تھیں' اس کے ساتھ ہی اس نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف بڑھ
مگر دانیال حسن نے فوری طور پر اس کا ہاتھ تھام کر ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔

وہ لڑکی ایک آدھ سیکنڈ کیلئے غائب دماغی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ پھر جونہی اس کے لا
تعلق شعور سے جڑا تھا اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کیلئے حیرت اور پھر شدید قسم کا خوف ابھ

پہلے کہ وہ کچھ کہتے وہ برق رفتاری سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور صوفے سے نیچے اتر آئی

ارے' ارے۔'' ایک لمحے کیلئے اسے بری طرح چکراتے دیکھ کر وہ بوکھلا گئے تھے۔ مگر لڑکی
ردہ ہرنی کی طرح اپنی سیاہ چادر کو سینے سے لگائے ان سے دور ہٹتی چلی گئی تھی۔

ارے کیا ہوا ہے تمہیں۔'' اس اچانک اور شدید ردعمل نے انہیں بے حد حیران کر دیا تھا۔
انہیں کسی بھی قسم کے سوال' جواب کا موقع دیئے بغیر اپنی جگہ سے سرکی تھی اور پھر بھاگ کر
ے کے کھلے دروازے میں جا گھسی تھی۔

اوہ گاڈ......'' وہ حیران پریشان وہیل چیئر دھکیلتے اس کے پیچھے لپکے تھے' لیکن جب تک وہ
ے کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

کمال ہے کہیں یہ لڑکی پاگل تو نہیں۔'' متواتر دروازہ بجاتے ہوئے انہوں نے نہایت
سے سوچا۔

خبردار دروازہ مت کھولنا' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔

بے وقوف لڑکی دروازہ کھولو' تمہارا سر زخمی ہوا اور تمہیں اس وقت مرہم پٹی کی ضرورت
نہوں نے قدرے خفگی سے کہا۔

مجھے کمزور مت سمجھنا میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ میں' میں۔'' اس کی بلند آواز یکلخت ہی ڈوب
۔ دانیال حسن نے گھبرا کر کی ہول سے اندر جھانکا' پھر چند لمحے دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود
واز نہ سنی تو وہ احمد کو پکارنے لگے' اس کمرے کی دوسری چابی منگوا کر وہ عجلت میں اندر داخل
ہ سامنے ہی فرش پر ڈھیر نظر آئی۔ وہ سخت جھنجھلا کر احمد کی طرف پلٹے۔

ڈاکٹر عالیہ کے کلینک فون کر کے کسی نرس کو بلواؤ۔'' اسے ہدایت دینے کے بعد وہ اس کے
آ گئے۔ قدرے جھک کر اسے سیدھا کرنے کے بعد وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئے
تھے کے زخم سے دوبارہ خون جاری ہو گیا تھا۔ ہونٹ بے ہوشی کے عالم میں بھی ہولے
رز رہے تھے۔ اس کی بے تحاشا زرد ہوتی رنگت نے انہیں مزید پریشان کر دیا تھا' جس الگ
راہا تھا۔

اکٹر عالیہ ایک زمانے میں ان کی کولیگ ہوا کرتی تھی۔ اس کا کلینک نزدیک ہی تھا' لہٰذا نرس
ے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ تاہم اس کے آنے تک وہ بہتے ہوئے خون کو روکنے میں
ب ہو چکے تھے۔ نرس نے آتے ہی سب سے پہلے اسے بیڈ پہ شفٹ کیا تھا۔ پھر بڑی مہارت

سے ماتھے پر پٹی کی تھی۔ چھلی ہوئی کہنی پر مرہم لگایا تھا اور سکون کا انجکشن دے کر چلی گئی تھی
جسم پر کوئی اور زخم نہیں تھا اور اندرونی طور پر کسی چوٹ کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہ
تھا۔

اگلی صبح تک اس کے اٹھنے کا کوئی امکان نہیں تھا' اس لئے دانیال حسن دروازہ لاک کر
کمرے میں آ گئے تھے۔ کھانا کھانے تک وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ وہ کون
سے آئی ہے' اس کے ماں' باپ کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ پھر اس کے عجیب و غر
عمل نے انہیں مزید الجھا دیا تھا۔ عام طور پر ہوش میں آنے کے بعد کوئی بھی مریض خواہ وہ
کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کرتے' جس طرح کہ اس لڑکی نے کیا تھا۔
''یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ مردوں سے کچھ زیادہ ہی خائف ہو اور ہوش میں آتے ہی مجھ
کچھ غلط سمجھ بیٹھی تھی۔'' ان کے ذہن میں سونے سے قبل آخری سوچ یہ ہی ابھری تھی۔

رات کے کسی پہر رضا کا فون آیا تھا اور وہ چھوٹتے ہی اس لڑکی کے بارے میں پوچھنے
انہوں نے جیسے تیسے اسے مطمئن کر کے ریسیور رکھ دیا تھا' وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ خوامخواہ کی
ساتھ لئے پھرتا رہے۔

اگلی صبح بیدار ہوتے ہی انہیں سب سے پہلا خیال اس لڑکی کا آیا تھا۔ سو احمد کو ناشتہ
کہہ کر وہ خود اس کے کمرے تک آ گئے تھے' اب وہ فوراً اس لڑکی کا اتا پتا معلوم کرنا چاہ رہے
انہیں معلوم تھا ایک رات گھر سے باہر رہنے کے بعد اس کے والدین پر کیا گزر رہی ہوگی۔ در
پر دستک دینے کے بعد انہوں نے کی ہول سے جھانکا وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے بیڈ
اتر رہی تھی۔ ایک لمحے کیلئے وہ بری طرح چکرائی تھی اور پھر سنبھل کر کھڑی ہوئی تھی۔ انہو
دوبارہ دستک دی' مگر جواباً کوئی رسپانس نہیں ابھرا تھا۔ تنگ آ کر انہوں نے دوبارہ چابی
دروازہ کھولا تھا۔

''اندر مت آنا' اندر مت آنا ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گی۔'' نحیف آواز میں دی گ
دانیال حسن پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ دروازہ پوری طرح کھول کر ٹہل چ
ہوئے اندر داخل ہو گئے تھے۔

''خبردار وہیں رک جاؤ' آگے مت بڑھنا۔'' وہ دیوار سے لگ کر خود کو سنبھالتے ہوئے
اٹھائے کھڑی تھی۔

''دیکھو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم آرام سے بیٹھ کر میر

ں نے بہت اپنائیت سے کہا تھا۔ لڑکی کا سرخ ہوتا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت بخار میں

؟''

ہیں تم فوراً اس کمرے سے چلے جاؤ۔'' وہ ہسٹریائی کیفیت کا شکار نظر آ رہی تھی۔
ہارا نام کیا ہے؟'' انہوں نے اس کی ہدایت کو پوری طرح نظر انداز کر دیا تھا۔
یں کچھ نہیں بتاؤں گی' بس تم جاؤ یہاں سے۔'' روہانسے انداز میں چلاتے ہوئے وہ انہیں
ے زیادہ خوفزدہ لگی تھی۔ نقاہت کے سبب وہ زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ پا رہی تھی اور غالباً
ں کا سامنا وہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔
ڑکی! تم بزدل ہی نہیں' بے وقوف بھی ہو' تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ کل رات
گھر میں ہو اور بالکل محفوظ ہو' تمہیں کسی نے چھوا تک نہیں' پھر تم کس چیز سے اتنا خوفزدہ ہو
انہوں نے قدرے چڑ کر کہا۔ جواباً وہ لڑکی کچھ نہ کہہ پائی تھی' بس تھکن سے نڈھال ہوتے
ان اس نے ہاتھ سے گرا دیا تھا اور خود دیوار کے ساتھ گھسٹتی ہوئی زمین پہ بیٹھ کر پھوٹ
رو دی تھی۔
یال حسن ایک طویل سانس لے کر رہ گئے تھے۔ تب ہی احمد ناشتے کی ٹرے لئے کمرے
یا' کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے حیرت بھری نظر سے پہلے روتی ہوئی لڑکی کو دیکھا
یال حسن کو' جو اچھے خاصے جھنجھلائے ہوئے لگ رہے تھے۔ ان ہی کے اشارے پر وہ ٹرے
کر خود پلٹ گیا تھا۔
اب پلیز رونا بند کرو۔ کل تم میرے چھوٹے بھائی کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھیں' اس لئے وہ
ہاں لے آیا تھا۔ تم خوامخواہ اور ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہی ہو' رونے دھونے سے
لہٰذا تم مجھے ٹھیک طرح سے اپنے بارے میں بتاؤ......''
میں کچھ نہیں بتاؤں گی' آپ خدا کیلئے یہاں سے چلے جائیں۔'' اس نے بری طرح روتے
اٹھایا تھا۔
مگر کیوں......؟''
مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے' ہر انسان سے خوف آ رہا ہے۔ آپ سے بھی' آپ بس جائیں
ے۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھامے کہہ رہی تھی۔
واٹ۔'' اس کی آخری بات پر وہ بھڑک اٹھے تھے۔
تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھ سے' ایک معذور شخص سے۔'' معلوم نہیں انہیں اس کی حد

سے بڑھی ہوئی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا یا اس کے یہ جملے انہیں اپنے بے ضرر وجود پر تازیانہ
ہوئے تھے۔

"کہیں تم پاگل تو نہیں ہو؟ کیا سمجھتی ہو تم کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرسکتا ہوں؟ ہاں تم
ایسے شخص سے خوفزدہ ہو رہی ہو جو خود اپنے اوپر بوجھ ہے، جسے چند قدم آگے بڑھنے کیلئے ان
جان پہیوں کا سہارا لینے کی ضرورت پڑتی ہے اور کیا تم خود کو اتنی کمزور سمجھتی ہو کہ تم ایک اپاہج
کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتیں......؟" وہ غصے میں آئے تو بولتے چلے گئے۔

جبکہ وہ جواباً کچھ نہیں بولی تھی، بس ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز کمرے کی خاموشی میں بلند ہو
رہی تھی۔ تب انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔

"ہوسکتا ہے اس لڑکی کے ساتھ ایسا ہوا ہو کہ وہ......" وہ چند لمحے اپنے پیشانی کو مسلتے
خود کو نارمل کرتے رہے اور جب وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوئے تو آواز بہت دھیمی اور لہجہ نرم
ہوئے تھا۔

"پلیز اب رونا بند کرو، ورنہ تمہاری طبیعت مزید خراب ہوجائے گی۔ تم اطمینان سے ناشتہ
یہاں تم بالکل محفوظ ہو، کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔" وہ کہہ کر کمرے سے باہر آ گئے تھے، تب ہی احمد
رنگ کا سلا ہوا تھیلا لے کر ان کے پاس چلا آیا تھا۔

"یہ ڈرائنگ روم میں صوفے کے قریب رکھا تھا، غالباً اسی لڑکی کا ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے میں دیکھ لیتا ہوں، تم ایسا کرو کچھ دیر کیلئے گھر جا کر صغریٰ کو لے آؤ۔" انہوں
نے احمد کی بیوی کا نام لیا اور خود تھیلے میں موجود چیزوں کا جائزہ لینے لگے تھے۔

"ایک عدد سوٹ، چند سو روپے، میٹرک کا رزلٹ کارڈ اور کارڈ سے منسلک ایک ایڈریس
ایڈریس دیکھ کر وہ حیران رہ گئے، کیونکہ وہ ان ہی کے گھر کا ایڈریس تھا۔ وہ اس لڑکی سے اس
کی بابت جاننا چاہتے تھے، مگر اس کی حالت کے پیش نظر فی الحال ارادہ ملتوی کر دیا۔ تب ہی
صغریٰ کے ساتھ واپس آ گیا تھا، جو پہلے بھی گھر کی صفائی ستھرائی کیلئے آ جایا کرتی تھی۔

"یہ گولیاں لے جا کر اس لڑکی کو کھلا دو اور کپڑے بھی بدلوا دو۔" چائے کا سپ لیتے ہوئے
انہوں نے میز پہ پڑی گولیوں کی طرف اشارہ کیا، صغریٰ گولیاں اٹھا کر چلی گئی، مگر جلد ہی واپس
آ گئی۔

"وہ تو ناشتہ کرنے پہ بھی آمادہ نہیں، گولیاں الگ اٹھا کر ایک طرف پھینک دیں۔ کہتی
کچھ کھاؤں گی، نہ پیوں گی۔"

کیا مرنے کا ارادہ ہے اس کا۔" انہوں نے خفگی سے کہا تو وہ اپنی جگہ سٹپٹا کر رہ گئی۔
یں کیا جانوں بھیا؟" اس نے فوراً کندھے اچکائے۔ دانیال حسن کے کڑے تیوروں سے
اس کی جان جاتی تھی۔
چھا تم چلو میں دیکھتا ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھے۔
مرے میں داخل ہوئے تو صغریٰ اس کے پاس بیٹھی اس کی منت سماجت میں مصروف تھی۔
یں نے کہا نا میں کچھ نہیں کھاؤں گی، تم جاؤ یہاں سے۔" وہ ایک دم چیخی تھی۔ صغریٰ گھبرا کر
ہوئی تھی۔ دانیال حسن کو ایک دم غصہ آ گیا، اگر معذوری حائل نہ ہوتی تو وہ اسی وقت اٹھ کر
لڑکی کے لگاتے اور اس کے ہوش وحواس درست کر دیتے، تاہم انہوں نے خود پر جبر کرتے
عام سے انداز میں پوچھا۔
اشتہ کیوں نہیں کر رہی ہو تم......؟ جواباً خاموشی چھائی رہی تھی۔
یکھو میں اس سے زیادہ تمہارے نخرے برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر تم ہم پہ بھروسا نہیں
ابھی اور اسی وقت اپنا پتا بتاؤ تاکہ ہم تمہیں وہاں پہنچا آئیں۔"
یں۔" اس نے تڑپ کر التجائیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔
ہیں، تو پھر ہم سے کوآپریٹ کرو، کچھ کھا پی کر ٹیبلٹس لے لو، تاکہ تمہاری طبیعت سنبھل
پھر بتاؤ ہمیں اپنے بارے میں کیونکہ میں نہیں جانتا تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟
وارث اگر تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ گئے تو مجھ پر سیدھا سیدھا حبس بے جا کا
یں گے اور میں خوامخواہ کی مصیبت مول لینا نہیں چاہ رہا۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا
پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔
اور اگر تم ایسا نہیں کرو گی تو مجبوراً مجھے پولیس سے رابطہ کرنا پڑے گا، پھر وہ تم سے جو بھی
یں گے۔ اچھا یا برا میں ذمہ دار ہرگز نہیں ہوں گا۔" انہوں نے جان بوجھ کر سخت رویہ
تھیلے میں موجود سامان دیکھ کر کچھ نہ کچھ تسلی تو انہیں ہو ہی چکی تھی اور اس کا انہوں نے
رہ اٹھایا تھا۔
ڑی دیر بعد صغریٰ نے آکر بتایا تھا کہ وہ ناشتے کے ساتھ گولیاں بھی کھا چکی ہے۔ انہوں
اطمینان کا سانس لیتے ہوئے صغریٰ کو شام کے وقت آنے کی تاکید کی اور پھر اپنے
لے آ گئے۔ انہیں معلوم تھا اب وہ دو تین گھنٹے دوا کے زیر اثر سوتی رہے گی، اس لئے وہ
اس عرصے میں اپنے چند اہم کام نمٹا لینا چاہتے تھے۔



اس کی آنکھ کھلی تو نیم تاریک کمرے میں اے سی کی سرسراتی ٹھنڈک کے سوا اور کچھ نہیں
پھر بھی اسے محسوس ہوا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا ہو۔ اس نے
سانس لے کر اپنی خالی اور ویران نگاہیں چھت پہ جما دی تھیں۔ تب ہی ہلکی سی کلک کے ساتھ
کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر دیکھنا چاہا' مگر اس سے پہلے ہی کسی نے
آن کردی تھی۔ کمرہ سفید دودھیا روشنی سے بھر گیا تو اس کی آنکھیں ایک دم خیرہ سی ہو گئی۔ اس
فوراً روشنی سے بچنے کیلئے بازو اٹھا کر آنکھوں پہ رکھنا چاہا' مگر پیشانی سے اٹھتی ٹیسوں نے اس
کرنے سے روک دیا تھا۔

دانیال حسن نے اس کے قریب آتے ہوئے دیکھا اس کی زرد رنگت روشنی میں مزید
ہو گئی تھی اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے غالباً تکلیف برداشت کرنے کی کوشش میں تھی۔
نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنی طرف گھما کر پیشانی کا جائزہ لیا۔ آنکھوں پر قدرے سوجن سی
ہو رہی تھی' پھر بھی انہیں امید تھی کہ چند روز تک زخم بھر جائے گا۔ بخار چیک کرنے کیلئے تھرما
کے منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے نہایت پیشہ ورانہ انداز میں اس کی نبض دیکھنے کیلئے کلائی
اس نے ہلکی سی جھرجھری لے کر آنکھیں پوری کی پوری کھول دی تھیں۔ غیر ارادی طور پر ہی اس
اپنا بازو کھینچنا چاہا تھا' مگر دانیال حسن کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ اس درجہ بے اعتباری پر کئی
ایک ساتھ ان کے ماتھے پہ ابھری تھیں۔

''واضح رہے کہ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔'' ان کا لہجہ خود بخود بے لحاظ ہو گیا تھا۔

''تمہارا بخار بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے۔'' ذرا دیر بعد تھرمامیٹر نکالتے ہوئے انہوں نے
''تمہیں اندرونی طور پر تو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی......؟''

''سارا وجود ہی درد میں ڈھل گیا ہے۔''

''کیا تم دوبارہ سونا چاہ رہی ہو......؟'' اسے آنکھیں میچے دیکھ کر انہوں نے پوچھا اور پھر
مایوس ہو کر اس کی طرف سے پلٹے۔

''میرے پاس رہنے کیلئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے' میرا کوئی گھر اگر تھا بھی تو اب نہیں ہے۔''
اس کی آواز نیم جان سی بے بسی کا ادراک ہوا تھا' انہیں...... بے اختیار پلٹ کر دیکھا' اس
انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''میری ماں اور میرے باپ نے ہم بہنوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ انہوں نے

[شا]دی ایک ایسے شخص سے کردی جسے بیوی سے زیادہ ایک ملازمہ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے
ایک ایسے بوڑھے سے بیاہ دیا جو اس کے باپ کی عمر سے بھی بڑا تھا۔ وہ نینا کے ساتھ بھی یہ
صدف کے ساتھ بھی یہ ہی ہونا تھا' جیتے جی موت سے بدتر زندگی کا ذائقہ مجھے بھی چکھنا پڑتا'
میں اپنی استانی سے ان کی باجی کا پتہ لے کر گھر سے نکل آئی' مگر......'' اس نے دونوں ہاتھ
لئے تھے اور آنکھیں بند تھیں' اس کے باوجود دانیال حسن اس کی آنکھوں کے گوشوں میں
آنسوؤں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

بہت اچھا ہو گا' اس لڑکی کیلئے جو اگر یہ کھل کر رو دے......'' انہوں نے لمحے بھر کیلئے سوچا۔
وہ سب سہ لینا آسان تھا۔ یہ دربدری' یہ پامالی' یہ سب سہنا بہت مشکل ہے۔ بہت مشکل۔''
ں انگارہ آنکھیں کھول کر چھت کو تکنے لگی تھی۔
یہ سب معلوم تھا' پھر بھی تم اپنے اجلے پر لئے سیدھی سورج کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔''
ن کو اس تمام عرصے میں پہلی مرتبہ اس پہ ترس آیا تھا۔
کوئی دوست رشتے دار احباب نہیں تھے' جن کے پاس تم......؟''
کوئی نہیں تھا' کوئی بھی نہیں اور اگر ہوتے بھی تو وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے دوبارہ اسی جہنم میں
تے۔'' آنسو ایک لکیر کی صورت اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔
وہ تمہارے اپنے تھے تمہیں جنم دینے والے تم ان سے اپنے لئے لڑ سکتی تھیں' اپنی بات منوا
''

نہیں اپنوں سے لڑنا آسان نہیں' جنم دینے والوں کے ساتھ لڑا نہیں جا سکتا' سر جھک جاتا
ساتھ نہیں دیتی' میں آپ سے لڑ سکتی ہوں' ساری دنیا سے لڑ سکتی ہوں' مگر اپنوں سے نہیں لڑ
کہ چوٹ دینا' ان سے چوٹ کھانا' دونوں بہت اذیت ناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے' اپنے
ہیں۔ اپنوں کے دیئے ہوئے دکھ مار دیتے ہیں۔ ان کے زہریلے رویے روح کا ناسور بن
ں۔ ان کا ناروا سلوک دلوں کو کاٹ دیتا ہے' آپ کو نہیں معلوم یہ سب' مگر میں جانتی ہوں
انا پڑتا ہے یا انہیں چھوڑنا پڑتا ہے اور ان دو راستوں کے بیچ کوئی تیسرا راستہ نہیں نکلتا'
راستہ نہیں نکلتا۔'' ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو دی تھی۔
دانیال حسن چپ چاپ بیٹھے رہ گئے تھے۔ ان کے دل میں ہمدردی کے سوا کوئی اور جذبہ نہیں
کے ہر رویے کی سمجھ انہیں اب آئی تھی۔ وہ کم عمر تھی' کم سن تھی' جذبات کی رو میں بہہ کر
قدم اٹھا چکی تھی' مگر اب تک بے یقینی کے عالم میں تھی۔

"مجھے استانی والا پتہ نہیں مل رہا تھا۔ آپ مجھے وہاں پہنچا دیں' مگر میرا سامان...... اس کا
پتا تھا۔" وہ مزید متوحش ہوگئی۔

"کیا نام تھا تمہاری استانی کی بہن کا۔" وہ پتہ چونکہ ان ہی کے گھر کا تھا' اس لئے انہوں نے
پوچھا۔

"آپا نصیباں۔"

"نصیباں!" انہوں نے دہرایا' مگر نصیباں تو ایک ماہ ہوا نوکری چھوڑ کر کسی دوسرے شہر
گئی ہے۔ شاید' صغریٰ!" انہوں نے صغریٰ کو پکارا۔ ادھر وہ حیران پریشان کی شکل دیکھ رہی تھی کہ
آپا نصیباں کو کیسے جانتے ہیں۔

"جی بھیا!" صغریٰ دوڑی آئی۔

"نصیباں کہاں گئی ہے کچھ پتا ہے؟"

"جی بھیا!" صغریٰ حیران تھی کہ صاحب کو اس وقت نصیباں کیسے یاد آ گئی۔ "بھیا! اس کے
(دیور) کا بیٹا کراچی میں رہتا ہے۔ وہ اس کے پاس چلی گئی ہے۔"

"اچھا تم جاؤ۔" انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تم جو پتہ ڈھونڈ رہی تھیں وہ میرے گھر کا ہے' مگر اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ نصیباں یہاں
نہیں ہے اب آئندہ کیلئے تمہیں کچھ تو سوچنا پڑے گا نا۔"

وہ یونہی چند لمحے بے تاثر انداز میں انہیں دیکھتی رہی اور پھر اٹھ بیٹھی' اپنے اوپر بڑا کمبل ہٹا
وہ دھیرے سے بیڈ سے نیچے اتری تھی اور ان کے قدموں کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ دانیال
حسن الجھے الجھے سے اسے دیکھتے رہے۔ تب جیسے وہ سرگوشی کے عالم میں گویا ہوئی تھی۔

"آپ' آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیں۔"

"میں......؟" میں تمہیں یہاں کیسے رکھ سکتا ہوں؟" ایک لمحے کی حیرت پہ قابو پانے کے بعد
وہ بہت عام سے لہجے میں بولے تھے۔

"اس گھر میں کوئی عورت نہیں رہتی۔ اسی صورت میں تمہیں یہاں رکھنا میرے لئے ممکن
نہیں۔" انہوں نے واضح اور دوٹوک انداز میں کہا تو وہ التجا پہ اتر آئی۔

"کوئی تو ہوگا اس دنیا میں آپ کا' ماں بہن بیوی' کسی کو بھی یہاں بلا لیں نہیں تو میں اکیلی
رہ لوں گی' ملازمہ بن کر صفائی ستھرائی برتن' کپڑے میں ہر کام کرلیا کروں گی' مجھے بس رہنے کو ٹھکانہ
دے دیں۔" وہ فقیر بنی بیٹھی تھی۔

بیوقوف ہو تم اس گھر میں سارے مرد ملازم ہیں اور میں اپنے سوا کسی کی گارنٹی نہیں دے
اس خوامخواہ کے مطالبے پر چڑ گئے تھے۔

اور آپ کے بیوی بچے......؟"

میں نے شادی نہیں کی۔" ان کے سپاٹ لہجے پر اس نے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا
جھکا لیا۔ دانیال حسن چند لمحے اس کے اٹھنے کے منتظر رہے' مگر جب کتنی ہی دیر تک اس کے
ت میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو انہیں مجبوراً ٹوکنا پڑا۔

برا خیال ہے اب تم کچھ دیر آرام کرو' پھر کچھ سوچتے ہیں۔"

کا سر جوں کا توں جھکا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مراقبے میں بیٹھی ہو۔

تم سن رہی ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں......؟" انہوں نے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھا'
یکلخت ہی بے تحاشا لرزش اتر آئی تھی' تب اس نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں

آپ' آپ مجھ سے شادی کرلیں۔" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ وہ بمشکل سن پائے تھے۔

اٹ......" وہ اپنی جگہ سے یوں اچھلے تھے گویا سانپ نے ڈس لیا تھا۔

کیا کہہ رہی ہو تم......؟ تم ہوش میں تو ہو......؟" حیرت کا پہاڑ ان پر ٹوٹا تھا۔

ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ مجھ سے شادی کرلیں۔ خدا کیلئے انکار مت کیجئے گا' میں آپ
خدمت کروں گی۔ آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ آپ......"

ٹ اپ' جسٹ شٹ اپ......" وہ بری طرح دھاڑے۔ غصے اور جلال کی تیز لہر اٹھی تھی
ود میں۔

تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں ابھی اور اسی وقت تمہیں اس
نکال باہر کروں۔" ان کی سرد غراہٹ نے مقابل کے جسم میں سنسناہٹیں دوڑا دی تھیں۔

پیچھے ہٹو تم......" انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنی چیئر کے بازو سے ہٹائے تھے
کے عالم میں دروازے کی طرف پلٹے۔ لیکن ان سے پہلے ہی وہ برق رفتاری سے اٹھی۔
دروازہ بند کیا اور اس سے پشت ٹکا کر کھڑی ہوئی' اس کا پورا وجود ہچکیوں سے لرز رہا تھا اور
سے بھیگا چہرہ اس وقت دانیال حسن کو زہر لگ رہا تھا۔

ہٹ جاؤ سامنے سے۔" انہوں نے بری طرح ڈانٹا تھا' مگر وہ وہیں اپنی جگہ زمین پہ بیٹھتی

"میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گی۔ پلیز آپ میری بات مان لیں۔ آپ کو کسی
تو شادی کرنی ہوگی نا تو پھر میں......" اس نے اپنا چکراتا ہوا سر تھاما۔

"اگر تم میرے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتیں تو ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ" انہوں نے
غصے سے لال انگارہ ہوتی آنکھوں سے اسے گھورا۔

"میں جانتی ہوں آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ میرا اعتبار کریں
میں کسی آشنا کی محبت میں گرفتار ہو کر گھر سے نہیں بھاگی' میں نے فلموں' ڈراموں میں ہیروئن بننے
کیلئے گھر نہیں چھوڑا' میں کچھ بننا چاہتی تھی' ایک ایسے مقام پر پہنچنا چاہتی تھی جہاں میں اپنے
اپنے مظلوم بہنوں کیلئے کچھ کر سکتی۔ لیکن سب کچھ غلط ہو گیا۔ الٹ پلٹ ہو گیا۔ لیکن میں آج بھی
پاکیزہ ہوں' مجھے رہنے کیلئے صرف ایک چھت چاہئے۔ ایک آسرا چاہئے' باہر کی دنیا بہت ظالم ہے
اگر آپ نے مجھے سہارا نہیں دیا تو میں ان ہی گلیوں میں رل جاؤں گی۔ دھول بن جاؤں گی۔
کیلئے مجھے اپنا لیں خدا کیلئے۔" وہ ان کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے روتی چلی گئی تھی۔

اور دانیال حسن بت بنے اسے دیکھتے رہ گئے۔



رات ساری آنکھوں میں کٹی تھی۔ ان کا دماغ پکے ہوئے پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔
ناشتہ لے کر ان کے کمرے میں آیا تو بے اختیار ان کی طبیعت کے متعلق پوچھنے لگا۔ چہرے پر
بیزار کن کیفیت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ احمد کو ٹال کر انہوں نے برائے نام ناشتہ کیا۔ گزشتہ
سا نادان لڑکی کی کہی گئی باتیں پوری رات سماعتوں میں گونجتی رہی تھیں اور اس وقت انہیں اس لڑکی
سے زیادہ خود پہ غصہ آ رہا تھا کہ کل جو بات انہیں ناممکنات میں سے لگ رہی تھی آج ممکن ہوتی
دکھائی دی تھی۔

"کیوں کر لوں میں اس لڑکی سے شادی' جس کے نام تک سے میں ناواقف ہوں۔" وہ
کیفیت پر چڑ گئے تھے۔

یہ حقیقت تھی کہ رات کو خالی کمرے میں انہیں اپنی زندگی کی ویرانی اور تنہائی کچھ زیادہ
محسوس ہو رہی تھی' کتنی لڑکیاں تھیں جو وجیہہ و جمیل دانیال حسن پر جان چھڑکتی تھیں' لیکن پھر ایک حادثہ
ہوا اور ان کے کمرے کے گلدانوں میں رکھے پھول خشک ہو کر بکھر گئے۔ موسم بدلتے رہے' مگر ان
کے نام تازہ مہکتے پھولوں کا گلدستہ کبھی نہ آیا۔

"اور میں بھی ایک بہت خوشحال زندگی گزار رہا ہوتا' جو اگر یہ حادثہ نہ ہوتا۔" محرومی کا احساس

اختیار کر گیا تھا۔ لیکن اب دن کے اجالے میں وہ سب ایک بار پھر ناممکن لگنے لگا تھا۔

"دوست احباب کیا سوچیں گے؟ میں ایک لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ساری عمر کیلئے
بوجھ بن گیا۔" انہوں نے سوچا تھا کہ وہ ابھی اور اسی وقت اس لڑکی کو یہاں سے چلتا کریں

"احمد! اس لڑکی کو بلا کر لاؤ یہاں......" انہوں نے احمد کو ہدایت کی اور کچھ ہی دیر بعد وہ ان
نے آ کھڑی ہوئی تھی' کسی مجرم کی طرح سر جھکائے۔

"دماغ درست ہوا یا چوٹ کا اثر ابھی بھی باقی ہے۔" اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں
کہا۔

"کل میں نے جو کچھ بھی کہا تھا' پورے ہوش و حواس میں کہا تھا۔" وہ دونوں ہاتھوں کی
ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھی تھی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک جذباتی لڑکی ہو' ایک غلط فیصلہ پہلے کر چکی ہو اور دوسرا اب
جا رہی ہو۔"

اس نے سر اٹھا کر غالباً ان کی بات سے اختلاف کرنا چاہا تھا' مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے
یا تھا۔

"تم نے میری اور اپنی عمروں کے درمیان فرق کو دیکھا ہے۔ اگلے سال میں پورے چالیس
ہو جاؤں گا اور تم کتنی عمر کی ہو گی' تمہاری زیادہ سے زیادہ سترہ سال' اٹھارہ سال یا انیس سال'
ہوگی' پوری زندگی ایک اپاہج اور معذور انسان کے ساتھ' یہ وہیل چیئر یہ محرومی کیا سمجھتی ہو' تم
کوئی ڈرامہ' کوئی کھیل یا مذاق؟ یہ ایک حقیقت ہے' ایک اٹل حقیقت' آج جذباتیت میں تم
کو گلے سے لگانے کیلئے تیار ہو' لیکن چند سال بعد جب آنکھوں سے اس بوجھ کو آج
سہارا چاہئے' میرا آسرا درکار ہے' لیکن کل یہ ادھورا وجود تمہارے لئے قابل نفرت بن
پھر تم کیا کرو گی ہاں......" وہ بے حد تلخ ہو گئے تھے۔

"تم ابھی معصوم ہو' کم عمر ہو' لیکن میں جانتا ہوں کہ آئندہ کیا ہوگا لوگ ہنسا کریں گے مجھ پہ
کھایا کریں گے تم پہ زندگی میں زہر بھر جائے گا' کچھ اور تلخ کچھ اور کڑوی ہو جائے گی یہ
تم نے بہت غلط سوچا ہے میرے لئے۔" وہ جیسے تھک کر خاموش ہو گئے تھے۔ تب اس نے
سر اٹھایا تھا۔

"میں نے آپ کیلئے نہیں اپنے لئے سوچا ہے اور میں اس وقت اس سے بہتر اور کچھ نہیں سوچ

سکتی۔'' اس نے رکتے، جھجکتے ہوئے کہہ ڈالا تھا۔

''مذاق سمجھ رکھا ہے عمر بھر کا معاملہ ہے یہ۔'' وہ اس کی ڈھٹائی پر چڑ گئے تھے۔ درحقیق
کمزوری پر' آخر میں اس لڑکی سے سیدھے سبھاؤ یہ کیوں نہیں کہہ رہا کہ جاؤ یہاں سے اور اپ
کرو' انہوں نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

''میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' انہوں نے اسے کہتے سنا اور سن کر خاموش ہو بیٹھے تھے۔

''مان لو دانیال حسن! کہ تمہاریں اس تاحیات محرومی کے بعد کوئی لڑکی بھی تمہارے قر
پھٹکے گی تو پھر تم اپنا یہ واحد اور آخری سہارا کھونے پر بھی کیوں تیار ہو......؟ اسے ایک
ضرورت ہے اور تمہیں ایک گھر کی اور گھر کبھی عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کرا۔'' کوئی ا
سے آمادہ کر رہا تھا' انہوں نے قدرے الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ جیسے دم سادھے فیصلے کی منتظر تھی

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات ماننے کیلئے تیار ہوں' مگر تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ ا
ہمارے چند ایک دوستوں کے سوا کسی کو علم نہیں ہوگا' کسی کو بھی نہیں اور جن کے علم میں یہ با
گی وہ بھی صرف وہ لوگ ہوں گے جو ہمارے نکاح میں شریک ہوں گے رائٹ۔ میں تمہار
واپسی کا ہر راستہ کھلا رکھنا چاہتا ہوں۔''

ان کی بات کے جواب میں اس نے ایک بے یقین سی نظر ان پہ ڈالی تھی اور پھر طو
لے کر سر جھکا دیا تھا۔



میں نے کہیں پڑھا تھا۔
محبت ایک دریا ہے۔
جو بے آب و گیاہ اجسام کو سیراب کرتا ہے۔
سدا معمور رہتا ہے۔

لیکن نجانے وہ دریا کیسا تھا کہ جس کے کنارے اپنی عمر کے سترہ سال گزارنے کے
میری تشنہ لبی جوں کی توں برقرار ہے۔ میں نے جب جب بھی اس دریا سے اپنی پیاس کو ز
یہ لق و دق صحرا میں بدل گیا' جہاں حد نظر ریت ہی ریت تھی۔ نفرت آمیز زہریلے رویوں ک
جسے پھانک پھانک کر میرے حلق تک ریت ہی ریت بھر گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا الزا
دوں......؟

اپنی کم نصیبی کو یا بدقسمتی کو کہ اس دریا کا ایک قطرہ بھی ایسا نہیں تھا جس پر میرا نام لکھا ہو

ی کھوج' میری جستجو' میری تمنا نے محبت کے اس دریا کو کھنگال ڈالا' تب کہیں جا کر معلوم ہوا
ے کا پورا دریا کسی اور کیلئے تھا۔ حقدار ہوتے ہوئے بھی مجھے محروم رکھا گیا تھا' معلوم نہیں
ضی کی تختی نکال کر سامنے رکھوں تو ہر سطر میں بیسیوں کا سوالیہ نشان میری آنکھوں کے
لوم جاتے ہیں' جو ابتدائی سطروں میں بہت ننھے منے ہیں' مگر رفتہ رفتہ ان کے حجم میں اضافہ
چلا جا رہا ہے اور میں شدت سے اس دن کی منتظر ہوں جب......''

روازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی اور وہ ڈائری لکھتے ہوئے بری طرح چونک گئی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی۔'' دانیال حسن اندر داخل ہوئے تو اس نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔

''کچھ نہیں بس ڈائری لکھ رہی تھی۔''

ہمیں بھی تو معلوم ہو کیا لکھا جا رہا ہے۔'' انہوں نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا اور
نے یونہی کھلی ڈائری ان کی طرف بڑھا دی تھی۔ اس درجہ اعتماد اور مان نے ان کے چہرے
ٹ پھیلا دی تھی۔ ڈائری اس کے ہاتھ سے لے کر بند کر کے میز پہ رکھتے ہوئے وہ اس کی
لے تھے۔

میرے پاس تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔''

ہ بڑی بڑی آنکھوں میں سوال لئے انہیں دیکھنے لگی۔

تمہارا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔''

چ......؟'' اس کے چہرے پہ امڈ آنے والے بے ساختہ خوشی کے تاثرات کو انہوں نے بڑی
ے دیکھا تھا۔

ہاں' بالکل سچ میں نے ٹائمنگ وغیرہ سب معلوم کروالی ہے۔ کلاسز کچھ دن بعد شروع ہوں
بہتر ہوگا تم ابھی سے پڑھائی شروع کر دو اور کیا خیال ہے اسی خوشی میں ہم باہر کھانا کھانے
؟''

ہ جو بہت دھیان سے ان کی باتیں سننے لگی تھی' آخری بات سن کر ایک دم چونک گئی تھی۔

جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے حسب عادت اور حسب توقع جواب دیا تھا۔

میں تمہاری مرضی پوچھ رہا ہوں۔'' انہیں ان تین الفاظ سے سخت چڑ تھی۔

میرا خیال ہے گھر میں ہی ٹھیک رہے گا۔ آپ جو کھانا چاہ رہے ہیں بتا دیں میں بنا لوں

چائنیز بنا لوں گی......؟'' ان کے سنجیدگی سے کہنے پر وہ سر جھکا کر ہتھیلیاں مسلنے لگی تھی' تب

وہ شگفتہ انداز میں مسکرا دیئے تھے۔
"اوکے بھئی گھر میں ہی ٹھیک ہے۔ جو تم چاہو بنا لو۔"
"اگر آپ کا دل چاہ رہا ہے تو......؟"
"نہیں پھر کبھی چلیں گے، جب تمہارا موڈ ہوگا......" وہ اس کا ارادہ بھانپ گئے تھے،
مزید اصرار کئے بغیر اس کے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ وہ یونہی کرتے تھے، ہمیشہ اس کی پر
کا علم ہو جاتا تو پھر ہر عمل اس کے مطابق ڈھال دیتے اور پھر حیران ہونے لگتے۔

کتنا چاہنے لگے تھے وہ اسے ان دو سالوں میں وہ جو ایک عام سی لڑکی تھی، ہر گزرتے
ساتھ بہت خاص بنتی چلی گئی تھی ان کیلئے۔ اس کا ہنسنا اس کا بولنا، اس کی خوشیاں، اس کے دکھ
اہم ہو گئے تھے۔ وہ اداس ہوتی تو دانیال حسن خود بخود بے چین ہو جاتے، اس کی آنکھ میں آ
لیتے تو رات بھر سو نہ پاتے۔ انہوں نے ذرہ ذرہ سمیٹ لیا تھا اسے اس کی شخصیت کے
بھرنے کیلئے اپنی ساری کوششیں صرف کر ڈالی تھیں۔ ابتدائی دنوں میں وہ کس قدر ڈسٹرب
تھی۔ بیٹھے بیٹھے چونک جاتی۔ بات کرتے کرتے بلاوجہ ہی رو دیتی۔

جب وہ ذرا سنبھلی تو انہوں نے اسے کالج میں ایڈمیشن دلا دیا۔ وہ کتاب سامنے رکھ
کن سوچوں میں ڈوبی رہتی، تب انہوں نے اس کی پڑھائی کا ذمہ بھی اپنے سر لے لیا۔ و
اسے اپنے پاس بٹھا کر ایک ایک چیز سمجھاتے۔ وہ کبھی بہت دھیان سے سنتی اور کبھی بے خبری
کا چہرہ تکنے لگتی۔ تب وہ اسے ہلکا سا ڈانٹ دیتے اور وہ چپ چاپ آنکھیں جھپک جھپک
پیتے ہوئے ان کی ساری باتیں سن لیتی۔ ان ہی کی بدولت ایف ایس سی میں اس نے
پوزیشن لی تھی اور اب میڈیکل کی پڑھائی سامنے تھی تو وہ مطمئن تھی کہ دانیال حسن خود ایک
ڈاکٹر تھے اور ایک بہترین استاد کے ہوتے ہوئے اسے پریشان ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی



زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تھا اور درنجف اتنی تیزی میں اندر داخل ہوئی تھی،
شہر اس کے پیچھے لگا ہو۔ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف دانیال حسن نے سر اٹھا کر دیکھ
بری طرح چونک گئے زرد چہرہ، اڑی ہوئی رنگت، پیشانی سے پھوٹتا پسینہ بیگ صوفے پہ پھینک
خود بھی بے دم سے انداز میں صوفے پہ گری تو وہ گھبرا گئے۔ آج میڈیکل کالج میں اس کا
تھا۔ صبح وہ خود ڈرائیور کے ساتھ اسے کالج چھوڑنے گئے تھے اور اس وقت تک وہ بالکل ٹھیک
تھی، پھر اب......

"کیا ہوا......؟" انہوں نے قریب آتے ہوئے پوچھا تھا اور وہ یوں چونکی تھی گویا ان کی وہاں
سے بے خبر ہو۔
"آر یو آل رائیٹ۔" انہوں نے اس کی ٹھنڈی پیشانی کو چھوا، جواب اب بھی ندارد تھا۔
"درنجف! کیا ہوا ہے تمہیں......؟"
"کچھ نہیں۔" ان کے بے چینی سے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"کیا مطلب کچھ نہیں؟ حالت دیکھ رہی ہو تم اپنی۔" انہوں نے قدرے ناراضی سے اسے
کی پشت پہ سر گراتے دیکھا اور پھر آواز لگا کر احمد کو بی پی آپریٹس لانے کا کہا۔
"ہاں اب بولو۔" وہ اس کی طرف پلٹے تو اسے معلوم ہو گیا کہ اب یہ اصل بات اگلوا کر ہی رہیں

ب جیسے مجبوراً بتانا پڑا تھا اسے۔ ڈرائیور آدھا گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا وہ پریشان ہو کر سڑک پہ نکل
یں ایک کار والے نے اسے لفٹ کی آفر کر دی اور وہ اتنا گھبرائی کہ سامنے سے آتی غلط روٹ
پہ سوار ہو گئی۔ یہ بات کسی اور سمت بس کو جاتا دیکھ کر معلوم ہوئی۔ وہاں سے بڑی ہمت کے
سری بس پکڑی اور اب وہ سٹاپ سے گھر تک پیدل آ رہی تھی۔
گرمی، دھوپ اور ذہنی تناؤ نتیجتاً بی پی لو اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔
دانیال حسن نے بی پی آپریٹس میز پر تقریباً پٹخا تھا۔ اس نے ہلکی سی جھرجھری لے کر ذرا سی
ں کھولیں۔ چہرے کے تاثرات سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اب ڈانٹ پڑ کے رہے گی۔
"سیدھی ہو کر بیٹھو......" وہ صوفے پہ ایک طرف لڑھکنے کو تھی جب انہوں نے بری طرح ڈپٹ
ں نے دانتوں تلے ہونٹ دبا لیا۔ تب انہوں نے اسے گھورتے ہوئے گلوکوز ملا پانی اس کی
بڑھایا۔
"تم مجھے بہت مایوس کرتی ہو درنجف۔ میں تمہیں جتنا بہادر بنانے کی کوشش کرتا ہوں تم بعض
اتنی ہی بزدلی کا مظاہرہ کر جاتی ہو۔" ان کی بات سن کر اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
"ڈرائیور لیٹ ہو گیا تھا تو بھی کالج سے باہر نکلنے کی کیا تک تھی۔ چلو نکل بھی آئی تھیں، کسی
ٹ کی آفر بھی کر دی تھی تو کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس شہر کی سڑکوں پر بیسیوں لوگ ہیں جو
لڑکیوں کو لفٹ کی آفر کرتے ہیں، پھر اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات تھی کہ تم ایک غلط بس پہ
ہو گئیں۔" وہ حسب توقع شروع ہو چکے تھے۔
"تم گھر سے نکلتی ہی اس خوفزدہ انداز میں ہو کہ گیدڑ بھی تمہارے سامنے شیر ہو جائیں، ہر کوئی

تمہیں میٹھی گولی کی طرح اپنے منہ میں رکھ کر نگل لینا چاہتا ہے۔ تم کیوں ایک سہمی ہوئی چڑ طرح ہی ہو کرتی ہو کہ ہر کوئی تمہیں چیل کوے کی طرح دبوچنے کیلئے تیار ہو جائے۔ یاد رکھو اگر عورت کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو اسے ہمت' حوصلے اور اعتماد کے ہتھیاروں سے لیس ہونا پڑتا ہے اپنی شخصیت میں بے خوفی کو جگہ دو۔ اپنی ہاتھوں میں اعتماد کے ایسے خنجر پکڑ لو کہ جن سے تمہا سامنے' آنے والا ہر فرد گھائل ہو سکے۔ اپنی حرکات و سکنات میں جرأت کا مظاہرہ کرو۔ یہ را لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایک فرد اگر تمہیں تنگ کر رہا ہے تو تمہاری ایک آواز پر بیسیوں تمہاری مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن کوشش کرو نجف کہ تمہیں مدد لینے کیلئے دوسروں کو پکارنا نہ پڑے شخصیت کو اتنا مضبوط بنا لو' اتنا مستحکم کر لو کہ عام انسان تم سے بات کرنے سے پہلے ہزار بار سو سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر انہوں نے اچانک ہی پوچھا تو اس نے طویل سانس لے کر میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے' اب تم جا کر آرام کرو۔" اس کا اترا چہرہ دیکھ کر انہوں نے کہا تو وہ فوراً جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ رات کو کھانے کے بعد وہ حسب معمول پڑھنے کیلئے ان کے کمرے میں نہ تو انہیں مجبوراً ملازم سے کہہ کر اسے بلوانا پڑا۔ کافی دیر بعد وہ کتابیں اٹھائے کمرے میں بڑی سے داخل ہوئی اور میز پہ کتابیں رکھ کر وہیں کارپٹ پہ کشن کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"آج پڑھنے کا ارادہ نہیں تھا کیا؟" کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے بیٹھے انہوں نے مصروف انداز میں پوچھا تھا۔ جواباً خاموشی چھائی رہی تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ خفا خفا سے اندا کتابیں کھولنے لگی۔

"ناراض ہو......؟" انہوں نے اندازہ لگایا اور توقع کے برعکس اس نے اثبات میں سر تھا' تب وہ کمپیوٹر آف کرتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیوں بھلا......؟"

"دوپہر میں آپ نے اتنا ڈانٹا مجھے۔ میری خراب طبیعت کی بھی پروا نہیں کی۔" یہ انداز ان کیلئے بالکل نیا تھا۔ وہ زیر لب مسکرا دیئے۔

"شکر کرو صرف ڈانٹا تھا...... مارا نہیں۔"

"تو کیا ہوا' آئندہ کسر پوری کر لیجئے گا۔" اس کے جلے بھنے انداز پر وہ بے اختیار ہنس تھے۔

پاگل لڑکی! میں تمہاری شخصیت کو مکمل اور بھرپور بنانا چاہتا ہوں' ایک دم پرفیکٹ' یہ رونا بزدلی' ڈر خوف یہ سب چیزیں مجھے زہر لگتی ہیں۔ میں تمہیں بہت طاقتور دیکھنا چاہتا ہوں۔ حوصلہ اور نڈر لڑکی کے روپ میں۔" ان کی خواہش کے بے ساختہ اظہار پر وہ سر جھٹک کر تھی۔

پہلے میں ایسی ہی ہوا کرتی تھی' کسی کی پروا نہ کرنے والی۔ جب میں اپنے گھر میں تھی بری طرح چونک گئے (تو کیا یہ ابھی تک اس گھر کو "اپنا" تسلیم نہیں کر سکی) وہ ان کی سوچ نیاز اپنی کہے جا رہی تھی۔

میں پیدل سکول جایا کرتی تھی۔ مگر اس کے باوجود محلے کے کسی لڑکے میں اتنی جرأت نہ تھی میرا راستہ روکتا۔ مجھ میں اتنی جرأت ہوتی تھی کہ خود پر کوئی فقرہ کسنے والے کا منہ توڑ سکوں' سکول تک کا فاصلہ میں بہت محتاط ہو کر طے کرتی تھی۔ اس کے باوجود عظیم۔"

ماضی کا کوئی تکلیف دہ لمحہ اس کی آنکھوں میں نمی بھر گیا تھا اور دانیال حسن جو ٹکٹکی باندھے اس پر اترتے غم کے سایوں کو دیکھ رہے تھے' اس لمحے ان کا دل چاہا تھا کہ وہ اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیں۔ اس کے سارے آنسو اپنی پوروں پر سمیٹ لیں اور کہیں "سنو! تم رویا مت تمہارے آنسو میرے دل پہ گرتے ہیں۔"

مگر وہ اپنی جگہ بت بنے بیٹھے رہے تھے اور درنجف اپنی آنکھیں خود ہی مسلنے لگی تھی۔ انہوں نے بھلا کب کبھی اپنا استحقاق' استعمال کیا تھا' وہ تو بہت محتاط ہو کر زندگی گزار رہے تھے۔

"اور کبھی جو اس کو واپسی کا راستہ طے کرنا ہو تو کوئی زنجیر ایسی نہیں ہونی چاہئے جو اسے باندھ کر رکھنے پر مجبور کر دے۔" انہوں نے فیصلہ کر رکھا تھا۔

اور اس کے بعد وہ دونوں بہت دیر تک گم صم رہے تھے۔ درنجف ماضی کی تکلیف دہ یادوں میں اور وہ مستقبل کے اندیشوں میں لرزتے رہے۔ وہ غائب دماغی سے پڑھاتے رہے۔ بے توجہی سے سنتی رہی۔ دیوار پر لگی گھڑی نے گیارہ کا گھنٹہ بجایا تو انہوں نے کتاب بند میز پہ رکھ دی۔

"میرا خیال ہے' آج کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔"

"ہوں......" وہ یونہی اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔ دانیال حسن وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے دوبارہ کمپیوٹر کے آ بیٹھے۔ کتنی ہی دیر تک سکرین پہ نظریں جمائے رکھنے اور کی بورڈ پہ انگلیاں چلانے کے درنجف کے کمرے میں موجودگی انہیں ڈسٹرب کرتی رہی تھی۔ تب وہ کام روک کر اس کی

طرف پلٹے۔

وہ میز پر کہنی ٹکائے، بند مٹھی پہ چہرہ رکھے نجانے کب سے انہیں خمار آلود آنکھوں سے
رہی تھی، نظریں چار ہوئیں تو اس نے ایک دم پلکیں جھکا لیں۔

"سونے کا ارادہ نہیں کیا؟" انہوں نے جان بوجھ کر کوئی رسپانس نہیں دیا۔

"جا رہی ہوں۔" دانیال حسن کو اس کے انداز میں بے دلی سی محسوس ہوئی تھی۔

"آج میری کچھ کلاس فیلوز نے آپ کو میرے ساتھ دیکھا تھا۔ پوچھ رہی تھیں آپ
بارے میں۔" وہ جاتے جاتے ادھ کھلے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا میرے کزن ہیں، بہت تعریف کر رہی تھیں آپ کی۔"

"اچھا......" انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

"پروقار...... سوبر...... وجیہ اور نجانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔" وہ ہلکا سا ہنسی، تب انہوں
پلٹ کر بغور اسے دیکھا۔ سنہری بالوں کی چھوٹی چھوٹی گھنگھریالی لٹیں اس کے صبیح چہرے کو چھو
تھیں۔ لبوں پر الوہی سی مسکراہٹ، وہ نظریں جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے قالین پر نادیدہ
کھینچ رہی تھی۔ نجانے کیوں انہیں اس کے انداز بدلے سے محسوس ہوئے تھے۔

"ہاں، جب میں وہیل چیئر پہ نہ بیٹھا ہوں تو ایسا ہی لگتا ہوں۔" دانستہ یا نادانستہ وہ دل
چھپی محرومی کا اظہار کر گئے تھے۔ درنجف نے تڑپ کر انہیں دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ ان کی
بات کی مخالفت کرتی وہ بول اٹھے تھے۔

"بہرحال تم نے کیا کہا؟"

اس نے اپنی سیاہ آنکھیں کھول کر ایک بھرپور نظر ان پر ڈالی۔

"میں نے کہا، وہ جتنے اچھے دکھائی دیتے ہیں، درحقیقت اس سے زیادہ اچھے ہیں۔"
اطمینان سے کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی پلٹ گئی تھی اور دانیال حسن بہت دیر تک اس ایک مسکراہ
الجھے رہے تھے۔



وہ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھی۔ جب ایک روز دانیال حسن اسے ساتھ لے کر "
ہاسپٹل" کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"یہ چھوٹا سا ہاسپٹل ڈیڈی نے میرے لئے بنوایا تھا۔ وہ خود بھی ایک معروف سرجن
کی خواہش تھی کہ ہم دونوں اسی ہاسپٹل میں کام کریں اور ہم نے کیا بھی۔ تقریباً پانچ سال

...ڈ ہو گیا، ہماری گاڑی ایک ٹرالر کے ساتھ ٹکرا گئی۔ اس حادثے نے میرے ماں باپ کو مجھ
...لیا اور عمر بھر کی معذوری مجھے سونپ دی۔ اس کے بعد میں نے کئی بار یہاں آ کر کام کرنے
...ی، مگر اپنے ہی مریضوں کی ترحم آمیز نظروں کا سامنا کرنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ اس
...ڈاکٹر افتخار نے اسے خریدنا چاہا، مگر میں راضی نہ ہوا۔ اب یہ ہاسپٹل اور آلات ہمارے ہیں
...ڈاکٹر افتخار کا ہے۔" ان کے لہجے سے یاسیت آمیز اداسی جھلک رہی تھی۔

...اور رضا......؟ کیا وہ یہاں آپ دونوں کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

...وہ بچپن سے ہی امریکہ میں ماموں کے پاس رہا ہے۔ وہ کبھی مستقل طور پر یہاں نہیں آئے
...انیال حسن کی نگاہیں ہاسپٹل پر جمی ہوئی تھیں اور نمی ان کی آنکھوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔
...کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

"تمہیں جب بھی وقت ملے تو یہاں آ جایا کرو۔ یہ کتابیں اور لفظ اس وقت تک کھوکھلے اور
...ہیں جب تک ان میں تجربے کا رنگ شامل نہ ہو" دانیال حسن نے دانستہ موضوع بدلا تھا۔

"میں یہاں ضرور آؤں گی دانیال حسن! اور ایک روز آپ کو بھی گھر کے کونے سے نکال کر
...پٹل کے اندر لا کر کھڑا کروں گی۔ اور پھر ہم دونوں......" وہ خیالوں ہی خیالوں میں دانیال
...کے ہم قدم اس ہاسپٹل کی راہداریوں میں پھرنے لگی تھی۔

اور پھر فائنل ایئر کے بعد وہ مستقل طور پر یہاں آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر افتخار کے بیٹے ڈاکٹر علی،
...حسن کے ایک فون پر اس سے اس حد تک کو تعاون کرنے لگے تھے کہ کچھ عرصے میں ہی اس
...ہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اس تجربے نے اس کی شخصیت کی تعمیر میں بہت مثبت کردار ادا کیا تھا، دن
...ان گنت لوگوں سے ملنے کے بعد وہ بے پناہ پراعتماد نظر آنے لگی تھی۔

اور ان ہی دنوں اس کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا، سب سے ٹاپ پر اپنا رول نمبر دیکھ کر وہ پاگلوں
...رح بھاگتی ہوئی دانیال حسن کے کمرے میں گھس گئی تھی۔

"دانیال حسن...... دیکھیں میرا رزلٹ آ گیا ہے۔ میں ڈاکٹر بن گئی ہوں، میں نے منزل پا لی
...،" وہ ہنستے ہنستے دیوانی ہوئی جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں اس مقام پر پہنچ گئی ہوں، جس کے لیے میں نے دن رات خواب دیکھے تھے۔ ایک ایک
...لڑکی ایک ایک لمحہ گن کر گزارا ہے میں نے...... صرف اس دن کیلئے، اب مجھے اپنے فیصلے پر کوئی
...ال نہیں، اب میں سر اٹھا کر ان لوگوں کا سامنا کر سکوں گی۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ درنجف اتنی کمتر
...تھی۔ وہ کھوٹا سکہ نہیں تھی، اس کی اپنی ایک شخصیت تھی، اپنا وجود تھا، جسے انہوں نے کبھی تسلیم نہیں

کیا تھا۔ میں ثابت کر کے رہوں گی۔ میں ڈاکٹر درنجف' جس کو پڑھانے کیلئے ان کے پاس
تھی۔ جس کی ضروریات کی تکمیل کیلئے ان کے پاس "فالتو روپے" نہیں تھے۔ میں بتاؤں
دانیال حسن! کہ درنجف اتنی ارزاں نہیں تھی۔" وہ ان کا ہاتھ تھامے رو رو کر گھائل لہجے میں
گئی تھی اور انہوں نے جان بوجھ کر اسے کھل کر رونے دیا تھا اور اسی رات وہ ان کے سا
پوچھ رہی تھی۔

"میں اماں! ابا کے پاس جانا چاہتی ہوں! دانیال حسن' کب جاؤں......؟"

اور ان کا دل ایک لمحے کیلئے کانپ گیا۔ "تو کیا ہم اس دوراہے پر آ پہنچے ہیں' جہاں
کو ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے۔" وہ فوری طور پر اسے کوئی جواب نہ دے پائے تھے۔

"بتائیں ناں کب جاؤں؟"

"(کبھی مت جانا) انہوں نے کلائی پہ بندھی گھڑی اتار کر ہاتھ میں لیتے ہوئے
درنجف منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"آج ڈاکٹر علی کا فون آیا تھا۔"

"تو......؟" درنجف کو حیرت ہوئی' وہ اکثر و بیشتر ہی یہاں فون کرتا رہتا تھا' پھر ا
بات تھی۔ جواباً انہوں نے گھڑی دوبارہ کلائی پر چڑھائی تھی اور وہیل چیئر کو حرکت دیتے
رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا تھا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولے تھے۔

"وہ تمہیں میری کزن کی حیثیت سے جانتا ہے۔" درنجف سمجھ نہیں پائی وہ اسے بتار
پوچھ رہے تھے۔

تاہم اس نے اثبات میں جواب دے دیا تھا۔

"درنجف! ڈاکٹر علی تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہے۔" انہوں نے گویا زہر میں بجھا ایک
طرف اچھالا تھا۔ وہ حیرت اور صدمے کے مارے گنگ سی کھڑی رہ گئی تھی اور دانیال حسن
ترس آ رہا تھا۔ غالباً وہ دنیا کے پہلے شوہر تھے جو اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کا پرپوزل د
تھے۔

"تمہیں ان چند سالوں میں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میرے ساتھ رہنے میں تمہیں کیا
پیش آ سکتی ہیں۔ میں نے شروع سے ہی سوچ رکھا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ باندھ کر نہیں ر
آج تم اس منزل پر پہنچ گئی ہو کہ اپنے لئے نسبتاً بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ من پسند راہ چننے کا تمہیں
حق ہے۔ اسی لئے......" وہ پلٹے تھے اور خالی کمرہ دیکھ کر دکھ سے ساکت رہ گئے تھے۔ وہ

کمرے سے نکل گئی تھی انہیں کچھ احساس نہ ہو سکا تھا۔ وہ اپنے آپ میں تھے ہی کب کہ
ں کا کچھ ہوش رہتا۔

"شاید یہ سب کہنے میں' میں نے بہت عجلت سے کام لیا ہے۔" وہ گم صم سے ہو کر رہ گئے تھے'
میں یک گونہ خوشی کا احساس بھی غالب تھا۔



وہ ابھی اپنے کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی' جب ملازم نے آ کر دانیال حسن کا پیغام دیا۔ وہ
جواب دیئے باتھ روم میں نہانے چلی گئی' اب سے کچھ دیر پہلے ہی وہ ہاسپٹل گئی تھی اور ڈاکٹر
پر چڑھ دوڑی تھی۔ وہ بے چارہ ہکا بکا سا اس کے لعن طعن سنتا رہا اور جب بہت دیر بعد دل
نکل گئی تب اسے احساس ہوا کہ وہ اس معصوم انسان سے بہت زیادتی کر بیٹھی ہے۔ یہ
ہوتے ہی اس نے فوراً "سوری" بول دیا تھا۔

"آپ کو پہلے مجھ سے بات کرنی چاہئے تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میں پہلے سے کہیں انگیجڈ ہوں۔"
آخر میں اس نے رسان سے کہا تھا۔

"آپ نے تو کبھی اس بارے میں ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی دانیال حسن نے مجھے بتایا۔ اگر وہ
تو میں ایسی جسارت کبھی نہ کرتا۔" ڈاکٹر علی کا اعتراض بجا تھا۔

"ان سے بڑھ کر انجان تو شاید ہی اس دنیا میں کوئی اور ہوگا۔" وہ جل بھن گئی تھی اور علی سے
پھر اپنی تلخی پر معذرت کرتی ہوئی واپس آ گئی تھی۔

وہ نہا کر نکلی تو ملازم ایک بار پھر کمرے میں موجود تھا۔ "آ رہی ہوں۔" کہہ کر وہ یونہی کمرے
ادھر چکرانے لگی۔ پھر ہمت مجتمع کر کے ان کے کمرے کی طرف چل دی۔

کمرے میں داخل ہوئی تو دانیال حسن کتاب پکڑے بیڈ پر دراز نظر آئے تھے۔ وہ خاموشی
سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو......" انہوں نے کتاب سے نظریں اٹھاتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کا
کرنا چاہا۔ مگر کچھ خاص اندازہ نہ لگا سکے۔ وہ حسب عادت ان سے کافی فاصلے پر کشن گھسیٹ کر
کر بیٹھ گئی۔ دانیال حسن چند لمحے یونہی کتاب پر غائب دماغی سے نظریں جمائے بیٹھے رہے'
اس صورتحال سے اکتا کر انہوں نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور بڑے دھیان
دیکھنے لگے۔

انہوں نے ہلکے زرد رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ سنہری بال خشک ہو کر پوری پشت پر بکھر گئے تھے

اور کتنی ہی ننھی منی گھنگھریالی لٹیں اس کے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ کھڑکی سے آتی ذرد...
کی تپش سے عاری نارنجی کرنوں نے اس کے وجود کو سنہرا پن عطا کر دیا تھا' وہ محویت کے عا...
اسے کسی گہری سوچ میں گم تکتے رہ گئے تھے۔ جب وہ آئی تھی تو ایک نوعمر' لاغر و ہراساں...
صورت میں آئی تھی اور آج وہ کس قدر مکمل دکھائی دے رہی تھی۔ ایک پراعتماد' خوش شکل...
لڑکی' ویسی ہی باہمت' باحوصلہ اور نڈر جیسی وہ اسے بنانا چاہتے تھے۔

"اور کیا اب میں تمہیں خود سے جدا کر سکوں گا؟" ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"کیسا ہوگا وہ لمحہ' وہ ساعت جب تم قطرہ قطرہ زہر میرے وجود میں اتارو گی۔ کیسے لگ...
تمہارے یہ ہونٹ جب تم دھیرے سے کہہ دو گی۔ "میں جا رہی ہوں۔ تمہیں چھوڑ کر......"
لگیں گی یہ آنکھیں جب ان میں اپنائیت' آشنائی کی چمک کی جگہ لاتعلقی اجنبیت اور گریز ہو...
گا۔ اور......

یہ چہرہ...... کیا تب بھی مجھے اتنا ہی حسین لگے گا جب ایک سفاک سی خودغرضی اس پر آ...
جائے گی۔" وہ اس کے بے حد متناسب نقوش کو کھوج رہے تھے اور ان کی ہر بات سے...
درنجف سوچ رہی تھی۔

"کیسا عجیب ہے یہ شخص' گھر میں رہنے کو جگہ دے دی۔ دل میں رکھنے کو تیار نہیں' خود...
مسند پہ چڑھا بیٹھا ہے اور مجھے خودغرضی کی دلدل میں اترنے کی دعوت دے رہا ہے۔ میرا ہاتھ...
ایک ایک قدم چلنا سکھایا اور اب چاہتا ہے' میں اس کے وجود کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جاؤں...
ذرہ سمیٹا ہے اس نے مجھے اور اب ہتھیلی پہ سجائے ہوا کے سامنے کر دینا چاہتا ہے۔ پتھر سے...
کیا کسی دوسرے کے تاج میں سجانے کیلئے۔" اس کا دل بھر آیا تھا۔

"درنجف......!" دانیال حسن نے ایک طویل بے معنی خاموشی سے اکتا کر اسے پکارا...
اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"نجف......! ہر انسان کو اپنے بارے میں سوچنے کا اختیار حاصل ہے۔" انہوں...
سوچ سمجھ کر بات کا آغاز کیا۔

"(مگر آپ اپنے بارے میں نہیں سوچ رہے) نجف نے ان کا مضطرب چہرہ دیکھا۔

"یہ حق تمہیں بھی حاصل ہے۔"

(بے فکر رہیے' میں اپنا حق پوری طرح استعمال کروں گی۔)

"ہو سکتا ہے ڈاکٹر علی کا فون آج دوبارہ آئے۔" وہ بہت باحوصلہ نظر آنے کی کوشش...

(اس کے مزاج تو ٹھیک کر آئی ہوں۔ اب تو آپ کی باری ہے) نجف کو غصے کے ساتھ رونا
گیا۔

"اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔" (مار دو یا زندہ رکھو)

اور وہ جوان سے لڑنے مرنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی۔ ان سے ایک لفظ بھی نہ کہہ پائی۔
آنسو بلا اجازت ہی پلکوں کی باڑ توڑے رخساروں پہ چلے آئے تھے۔

"نجف......! کیا سوچ رہی ہو تم؟" وہ ان گھڑیوں کی طوالت سے گھبرا گئے تھے۔ جواباً اس
اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ دکھ' ناراضی' شکایت' احتجاج' آنسوؤں سے لبریز آنکھوں نے انہیں
طرح شرمندہ کر دیا تھا۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے' خودغرض' نیچ' گھٹیا' ایک ایسی راہ چلتی لڑکی' جو اپنی منزل کے حاصل
تک آپ کے در پر پڑی رہی اور اب آپ کو ٹھوکر لگا کر چل دے گی۔ اتنے سالوں میں بس
یہ جان پائے ہیں آپ مجھے' کسی بچے کی طرح پرورش کی ہے آپ نے میری' پھر بھی اتنی بدگمانی'
بے اعتباری۔"

دانیال حسن اپنی جگہ سن سے ہو کر بیٹھے رہے اور وہ بولتی رہی۔ بہت دیر بعد جب دل کا سارا
نکل گیا تب وہ خاموش ہوئی' آنسو آنکھوں سے ابھی بھی رواں تھے۔

دانیال حسن کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے اسے دیکھتے رہے۔ کیا یہ وہی درنجف تھی جو ان کے
سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی اور آج وہ ان سے ان ہی کیلئے لڑ رہی تھی۔ سب کچھ کہنے کے بعد وہ
ہاتھ گود میں رکھے' سسکیاں بھرتے ہوئے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہی اس کا مخصوص انداز۔
ان کے لبوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ آ ٹھہری تھی۔

"نجف! ادھر آؤ۔" ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سرشاری تھی۔ وہ بغیر ہلے اپنی جگہ
رہی۔

"کیا تم مجھے یہ احساس دلانا چاہتی ہو کہ میں خود اٹھ کر تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔" نجف نے
انہیں دیکھا اور پھر اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی۔

"یہاں بیٹھو......" وہ چپ چاپ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

"جانتی ہو نجف...... اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاتیں' تو میں مر جاتا۔" ان کے لہجے کی گہرائی و
...پر نجف نے دہل کر انہیں دیکھا تھا۔

"آئندہ آپ نے ایسی بات کہی تو......" وہ غصے کے مارے کچھ کہہ نہ پائی۔

"تو......؟"

"تو میں خود بھی مر جاؤں گی۔" وہ ان کے کندھے پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اور دانیال حسن کیلئے اس سے بڑھ کر خوشی کا لمحہ اور کوئی نہیں تھا۔

"تمہیں مرنے کون دے گا پگلی؟" اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے انہوں نے زیر لب کہا تھا۔



اڑھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد جب گاڑی شہر کے شناسا راستوں پر سفر کرنے لگی تو ڈوب چکا تھا' سرمئی آسمان کے کنارے سیاہ پڑ چکے تھے اور کار کی کھڑکی سے نظر آتے آسمان کرلاتی کونج کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا' یہاں کی مانوس فضاؤں میں ایک گمنام سی اداسی ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ کن حالات میں وہ یہ شہر چھوڑ گئی تھی۔ اور اب کس حیثیت سے واپس تھی۔

"لیکن ہر کسی کے ایسے نصیب کہاں؟ کئی ستارے آسمان سے ٹوٹ کر پستی کے اندھیرو جا گرتے ہیں۔ مجھے تو دانیال حسن مل گئے تھے اور ضروری تو نہیں کہ ہر درنجف کو ایک دانیال جائے۔"

وہ کھڑکی سے باہر نظریں جمائے سوچ رہی تھی' تب ہی ڈرائیور نے اسے چونکا دیا۔ وہ کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ درنجف نے تفصیل سے اسے بتایا اور پھر غور سے ان جانے پہچانے را دیکھنے لگی۔ ہر موڑ پر وہ پہلے سے جان جاتی تھی کہ اب یہاں کیا ہوگا۔

"اور اب یہاں سے موڑ کاٹ کر ہم بڑی سڑک پر رک جائیں گے' جہاں بابا تاج فر ریڑھی لگائے کھڑا ہوگا اور اس کے نزدیک شیشم کے درخت تلے پرانی جوتیاں مرمت کرتا موچی' جو انہیں بستے اٹھائے دیکھتا اور فوراً نعرہ لگا دیتا۔

"پہلے کتاب میں پڑھوں گا۔" چند بھولی بسری یادیں اس کی ہونٹوں پر پھیکی مسکراہ ٹھہر گئی۔

"گلی تنگ ہے۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔" ڈرائیور نے بتایا تو وہ گلی کے سرے پ آئی' گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے نجانے کیوں اسے اپنے ہاتھ کانپتے ہوئے محسوس ہوئے وہ ڈرائیور کو وہیں رکنے کی ہدایت دیتے ہوئے خود آگے بڑھ گئی تھی۔ آتے جاتے کئی راہگیر اسے بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ بائیں طرف ایک مزید تنگ گلی کی طرف موڑ کاٹتے ہوئے

تنہا شا دھڑکتے دل پہ قابو پانے میں بہت مشکل پیش آئی تھی۔

سے اندھیرے میں اس گلی کی تاریکی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ کئی بار گرتے گرتے نہیں راستہ خراب تھا یا خود اس کے ہاتھ پاؤں بے قابو ہو رہے تھے اور ذرا آگے جا کر کتنے پہچانے گھر دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ باجی منور کا گھر جو اس کو وقت دروازے میں کھڑی پھاڑ پھاڑ کر اپنے بچوں کو گھر کے اندر بلا لیا کرتی تھی۔ اس سے آگے دو گھر...... اور ایک بوسیدہ سی تین چار سیڑھیوں والا' جس کے سال خوردہ لکڑی کے دروازے کا نیلا رنگ برسوں لا ہو گیا تھا اور جس کے دروازے پر پردے کے نام پر ایک میلی سی مختصر سی چادر ہمہ وقت تی تھی۔

"آہ......" ہلکی سی ٹھوکر لگی تھی۔ اس نے سنبھل کر سر اٹھایا۔ تین چار سیڑھیاں اس کے سامنے سیڑھیوں کی اینٹوں پر سے سیمنٹ اترا ہوا ہے۔ دوسری سیڑھی کے سرے کی اینٹ ہمیشہ کیلئے بے تاب رہتی تھی۔ اسے ابھی تک یاد تھا سو پاؤں بہت سنبھل کر رکھا۔ دروازے کے عین پہنچ کر دل پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے دونوں ہاتھوں سے کھیں رگڑ ڈالیں۔

"کیا ہوگا' اس بند دروازے کے پیچھے۔" ایک لمحے کیلئے اس کا دل چاہا تھا پلٹ کر بھاگتی چلی اور دوبارہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرے۔ مگر کسی نادیدہ قوت نے اس کا ہاتھ اٹھا کر دروازے دیا تھا' جو ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں ایک لمحے کیلئے بند ا۔

"دروازے کے عین سامنے دادی کی چارپائی ہوگی اور دادی حسب عادل کھانا منگوانے کیلئے رہی ہوں گی۔ نینا کچن میں بری طرح مصروف ہوگی۔ ابا چارپائی پہ نیم دراز خلال کرتے عظیم اور چھت پر...... صدف کمرے میں کوئی پرانا رسالہ پڑھتے ہوئے اور اماں ادھر ادھر صحن میں چکراتی پھر رہی ہوگی۔" بس ایک لمحہ لگا تھا اور سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم گیا نے اٹھا ہوا قدم دہلیز پر رکھا اور دروازہ پوری طرح کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

"یہ کیا......؟" وہ اپنی جگہ پتھر ہوگئی تھی۔

"کیا میں راستہ بھول گئی ہوں۔" وہ عالم بے یقینی میں تھی۔ کچھ بھی تو ویسا نہیں تھا جیسا ابھی لمحے وہ سوچ رہی تھی۔ وہ تو ایک قبرستان میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک اجڑے ہوئے' ویران آباد مکان میں' گھر تو کہیں تھا ہی نہیں۔

اڑ چکے پنچھی کسی اور آشیاں کی طرف

نیم کے پیڑ پہ ٹوٹے ہوئے پر باقی ہیں

ہر ایک چیز مہیب تاریکی کی زد میں تھی۔ سناٹا جیسے وحشت زدہ ہو کر چلا رہا تھا۔ ہر دیواریں' برآمدے' کمرے' سب ہی کچھ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہاں صحن کے ایک کونے ایک بوڑھا وجود دم سادھے بیٹھا تھا' اس کے پاس چولہے میں سرخ دہکتے کوئلوں پر سفید راکھ چکی تھی۔ لکڑیاں لگ رہی تھیں' مگر ان میں سے اٹھتا دھواں دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اس وجود کے پاس روٹیوں بھری چنگیر رکھی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس بات نے وجود میں ہوئی تھی۔

اس نے چولہے پر رکھی سیاہ ہنڈیاں کا ڈھکن اٹھا کر لکڑی کی ڈوئی خوامخواہ ہی اس میں تھی۔ اور پھر اس پہ ڈھکن رکھ کر ڈوئی رکھ دی تھی۔ ڈوئی سے سالن کا گھی قطرہ قطرہ بن کر گرنے لگا تھا' تب ہی صحن کے بیچوں بیچ پڑی چارپائی چرچرائی تھی۔ اس پر پڑا نحیف و نزار ہولے سے کھانسا تھا اور کھانستا ہی چلا گیا تھا۔

"ابا......" اسے پہچاننے میں وقت نہیں لگا تھا۔ کھانستا ہوا وجود ایک دم منجمد ہو گیا تھا۔

"اماں......!" اس کے لبوں سے سسکی نکلی تھی۔

"کون ہے......؟" بوڑھی آنکھیں اندھیرا ٹٹولنے لگیں۔

"میں...... درنجف......" وہ ان کی طرف بھاگی تھی۔

"نجف...... نجف...... تو آ گئی' میری نجف......"

اماں سے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو دی تھیں۔ خود اس کی ہچکیاں گئی تھیں۔ اور ابا چارپائی پہ بیٹھ کر خود کو کوس رہے تھے۔

"کاش...... کوئی مجھے ایک بار وہ وقت لوٹا دے۔" ان کی زبان پہ ایک ہی التجا تھی۔

مگر وقت کب کسی کے ہاتھ آیا ہے۔ وہ دونوں گزرے وقت کو رو رہے تھے۔ ابا مرنے کیلئے بین کرتے رہے۔ اماں بچھڑنے والوں کیلئے نوحے کرتی رہی اور وہ ششدر سی سنتی رہی۔

"اور عظیم شراب کے نشے میں دھت اپنے ہی ایک دوست کو قتل کر کے جیل جا پہنچا۔"

"کسے الزام دوں میں...... قسمت کو...... آپ دونوں کو......؟ یا عظیم کو......؟"

وہ ساری رات کسی بے قرار روح کی طرح پورے گھر میں چکراتی رہی۔ آنسو کہاں آنکھوں میں' وہاں تو بس یادیں تھیں۔ کچھ بچھڑی ہوئی ساعتیں' جنہوں نے بہت کچھ یاد دلایا

ی آپا کا تھا وہ ہمیشہ اسی پہ بیٹھ کر کڑھائی کیا کرتی تھیں۔ اس صندوق میں' میں پیسے چھپایا کرتی بزی مینا آپی نے خود کاڑھی تھی اور برآمدے کے اس کونے میں بیٹھ کر مینا نے میری گڑیا کی ستارے ٹانکے تھے۔ یہ کھونٹی سے لٹکی ہوئی چیختے چنگھاڑتے رنگوں والی شرٹس...... جن کے اور کفوں پر میل جوں کی توں موجود ہے۔ یوں جیسے عظیم ابھی ابھی اتار کر گیا ہو اور یہ الماری ی خانے میں پڑے رسالے صدف کے تھے جنہیں پڑھ کر وہ سوتی تھی تو مسکراہٹ رات بھر ہونٹوں سے جدا نہ ہوتی تھی۔ وہ رات انہیں قیامت تھی۔

"میں ان سب سے ملوں گی اماں!" وہ اپنے زخم زخم دل کے ساتھ نڈھال تھی۔

"مل لینا...... سب سے مل لینا...... مگر مینا سے کہاں ملو گی......؟ وہ تمہیں کیسے ملے گی؟" اماں کی کا سیلاب رکنے میں نہ آیا تھا اور نجف اس رات کو سوچتی رہ گئی تھی۔

"اگر تم بھاگ رہی تھیں تو تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ آخری گھڑیوں میں تمہارے پاس تو نہیں جی بھر کے دیکھ تو لیتی اور کیا معلوم میں تمہیں روک ہی لیتی۔ ایسا کچھ بھی نہ کرنے دیتی تمہاری ایسی کوئی خواہش تھی تو اس رات ایک بار اٹھ کر مجھے اپنے گلے سے کیوں نہ لگا لیا۔"

"اور اب ہم کس کس دکھ کو ساتھ لے کر جئیں گے اماں! کس کس یاد کو روئیں گے؟" اس کا فلوج سا ہو گیا تھا۔

اور اگلی صبح اس نے اس گھر کی ایک ایک چیز کو اپنے ہاتھوں سے چھوا تھا' پلکوں سے چوما تھا' یاروں کی یاد کو سمیٹ کر دل میں رکھا تھا اور باہر نکل آئی تھی۔ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے ے پر تالا لگا کر اس نے چابی دیوار کے رستے صحن میں پھینک دی تھی اور پھر سیڑھیاں اتر کر گلی ئی تھی۔ اماں' ابا اس سے کچھ آگے سر جھکائے چل رہے تھے۔

وہ بھی چپ چاپ ان کے پیچھے تھی۔ گلی کے آخری سرے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا وہ ال سے آ گئی تھی' مگر ننھی منی درنجف بوسیدہ سیڑھیوں پر بیٹھی حسرت بھری نگاہوں سے انہیں ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"نجانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اماں' ابا کے سامنے جا کھڑی ہوں۔ گزشتہ ماہ و سال ی ایک ساعت سے وقت کی گرد جھاڑ کر ان کے سامنے رکھوں اور پوچھوں۔

"ذرا بتائیے تو' بیٹے کو بیٹیوں پر فوقیت دینے سے حاصل وصول کیا ہوا؟

ماں باپ تو اولاد میں فرق نہیں رکھتے' پھر آپ نے بیٹیوں کو دھتکار کر بیٹے کو سینے سے کیوں آخر وہ کیا تھا ایسا جو آپ کو عظیم سے مل سکتا تھا' ہم سے نہیں؟

ہمارے جسم میں بھی عظیم کی طرح آپ ہی کا خون دوڑ رہا تھا۔ عظیم کی طرح ہم نے بھی
ہی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ پھر...... پھر ہم اتنے کمتر کیوں ہو گئے؟

آپ نے اپنی اولاد کو بھی مفادات کے ترازو میں تولا اور جو پلڑا بھاری نکلا' اسی پر اپنی
محبت اور چاہت کی مہر ثبت کر دی۔ چھ انسانی جانیں ایک انسان کے برابر' کیا اتنی ارزاں بھی
ہیں۔

کبھی احساس ہوا تھا' آپ لوگوں کو کہ ہمیں کیا چاہئے تھا اور کیا نہیں......؟ ہم اپنی
ضروریات کی تکمیل کو ترستے رہے اور آپ اپنے بیٹے کی عیاشیوں کا سامان کرتے رہے۔

ہمارے لئے آپ کے پاس دودھ نہیں تھا' پھل نہیں تھے' فیس کے پیسے نہیں تھے' تحفظ
پیار' محبت' شفقت' خوشیاں سب کچھ تھا' آپ کے پاس لیکن ہمارے لئے نہیں' صرف عظیم کیلئے
جانتے ہیں' آپ نے بڑی آپا کے ساتھ کیا کیا تھا؟

میں آج بھی اپنے ہاتھ کی پشت پر ان کے آنسوؤں کی جلن محسوس کرتی ہوں' آپ کیسے
باپ تھے کہ ان کے غم کی آنچ آپ کے دلوں کو چھو بھی نہ سکی۔ آج آپا اس گھر میں ایک ملاز
بھی بدتر زندگی گزار رہی ہیں' کیونکہ ان کے شوہر کی پہلی بیوی ٹھیک ہو چکی ہے۔ میں رات
ہوں تو آج بھی میرا تکیہ ان کے غم میں بھیگتا رہتا ہے۔

اور مینا آپی...... ان کے ساتھ کیا کیا تھا آپ نے......

ایک دوزخ میں دھکیلا تھا آپ نے انہیں' اور اب وہ چاہیں بھی تو اس دوزخ سے رہائی
سکتیں کہ ان کا بوڑھا شوہر چار بچوں کی زنجیر ان کے پیروں میں باندھ کر خود مر چکا ہے۔

اور نینا آپی...... جو دن میں بھی خواب دیکھا کرتی تھیں خوشیوں کے' آزادی کے خوا
خواب...... وہ اس دنیا سے ہی رخصت ہو گئیں کہ وہ بڑی آپا اور مینا کی طرح گھٹ گھٹ کر
حوصلہ نہیں رکھتی تھیں۔

اور صبیحہ جسے محض پانچ' چھ سال کی عمر میں آپ نے خود سے جدا کر دیا تھا' صرف اس
آپ کیلئے بیکار تھی۔ کبھی سوچا آپ نے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا۔ وہ زندہ بھی ہے کہ
کی عیاشیوں کی بھینٹ چڑھ گئی یا کسی سڑک کنارے بھیک مانگ رہی ہوگی۔

''اور میں...... درنجف...... جس نے جذبات میں آ کر ایک انتہائی قدم اٹھا لیا
بھاگ آ گئی۔ تمام عمر کیلئے اپنے وجود پر ''بھاگی ہوئی لڑکی'' کا لیبل لگوا لیا۔ اگر اس جذباتی
میری قسمت مجھے دھوکا دے جاتی تو......

اگر میں اس رکشہ ڈرائیور کے ہتھے چڑھ گئی ہوتی' اگر مجھے دانیال حسن نہ ملتے تو......؟ اگر
سی جگہ پہنچ جاتی جہاں عصمت فروشی کا دھندا ہو رہا ہوتا تو......؟

آج میں اس مقام پر نہ ہوتی...... میں کسی کوٹھے پر پیروں میں گھنگھرو باندھے ناچ رہی ہوتی۔
کر رہی ہوتی یا اپنے اس وجود سے انتقام لے رہی ہوتی' جس کی بنا پر میں اپنے ماں باپ کی
کار ہوئی۔ اور آپ کو کیا معلوم آپ نے ہمارا کتنا نقصان کیا ہے۔ کیا کیا چھینا ہے ہم سے۔
ب پوچھنا چاہتی ہوں ان دو انسانوں سے جنہوں نے ہمیں جنم دیا اور جنم دے کر بھول گئے۔ وہ
ماں باپ ہیں۔

لیکن میں یہ نہیں پوچھ پاتی' جب میں ان کی آنکھوں میں اشک ندامت دیکھتی ہوں' جب میرا
تے ہی ان کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں اور جب میں انہیں خدا کے حضور توبہ کی' معافی
کرتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ تب یہ سوال میرے اندر دفن ہو جاتے ہیں۔ میری زبان منجمد
ہے اور میں نئے سرے سے ان کے سب گناہ معاف کر دینے پر تیار ہو جاتی ہوں اور سوچتی
اب تو تلافی کی کوئی صورت بھی باقی نہیں رہی کہ وقت بہت بیت گیا ہے۔

ان کی ذرا سی توجہ' معمولی سی چاہت کو ترسنے والی درنجف آج خود دوسروں کی زندگی دینے کا
گئی ہے۔

میں ہاسپٹل کے کوریڈور سے گزر رہی ہوں تو لوگ حسرت کی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہیں۔ میری
توجہ حاصل کرنے کیلئے میرے سامنے بچھے جاتے ہیں۔ مجھے دعائیں دیتے ہوئے ان کی
ہیں تھکتیں' کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں ہی ہوں وہ ڈاکٹر درنجف جس کے ہاتھ میں خدا نے
فا رکھی ہے۔ جو ایک بار اپنے مریض کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دے تو اس کی آدھی تکلیف کم
ہے' لیکن ان ہی لوگوں کو جب میں ڈلیوری روم سے نکل کر بشارت دیتی ہوں کہ خدا نے
بیٹی جیسی رحمت سے نوازا ہے تو وہ بے یقین سے ہو کر مجھے دیکھتے ہیں۔ ان کے چہرے اتر
ہیں' کندھے جھک جاتے ہیں اور چال میں سستی آ جاتی ہے۔ تب میں انہیں نئے سرے سے
بتاتی ہوں کہ

''دیکھو! بیٹیاں' تتلیوں کی مانند ہوتی ہیں۔ انہیں بے دردی سے ہاتھ میں دبوچ لو گے تو یہ مر
گی' تمہارے امتیازی رویوں کے سامنے ان کی چمک دمک ماند پڑ جائے گی۔ ان کی ذات کے
مرجھا جائیں گے۔ خدارا ان تتلیوں کا خیال رکھنا' انہیں نفرت کی دھوپ سے بچانا' اپنے
کی پناہ میں رکھنا کہ ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وقت بیت جائے تو حاصل وصول کچھ

نہیں ہوتا۔ حساب کتاب کرنے بیٹھوتو کامیابیوں پر زیاں کا احساس حاوی ہونے لگتا ہے۔
دیکھو...... آج میرے پاس بہت کچھ ہے' مگر پھر بھی جو کچھ کھویا ہے وہ پانے سے کہیں زیادہ ہے
دانیال حسن آج بھی مجھ پہ جان چھڑکتے ہیں۔ میرے عزت واحترام میں ہرگزرتے د
ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے' لیکن میں ان کی یہ سب محبتیں حق سمجھ کرنہیں' احسان سمجھ کر وصول کرتی
کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ہمارا معاشرہ ''بھاگی ہوئی لڑکی'' کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اگر چہ
حسن کی طرف سے کبھی اس بات کا اظہار نہیں ہوا' مگر پھر بھی یہ احساس ہمیشہ مجھے کچوکے لگا
گا کہ میں باعزت طریقے سے ان کی زندگی میں داخل نہیں ہوئی۔

اور یہ خوف کہ اگر جو کبھی میرے بچوں کو میرے ماضی کی خبر ہوگئی تو کیا میں ان کے سا
اٹھا کر کھڑی ہوسکوں گی۔''

''الوینہ! کہاں جارہی ہوتم؟'' سخت' کھردرا لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ بر
چونک گئی۔ آواز بلاشبہ وجاہت دانیال کی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا جو بی اے کا سٹوڈنٹ تھا۔

''یہ کس لہجے میں بات کررہا ہے؟'' درنجف کا دل گہرائی میں ڈوب کر ابھرا تھا' ماضی
بے رحم لمحہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

''کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرانے جارہی ہے۔'' وہ فکرمندی سی ہوکر پین یوں ہی ڈا
رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دوست کے گھر جارہی ہوں۔'' الوینہ نے بھائی کے غیر معمولی انداز پر بہت حیر
اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''کیسے جاؤ گی......؟'' لہجہ سخت ہونے کے ساتھ ساتھ تفتیشی بھی تھا۔

''گاڑی خراب ہے' ظاہر ہے رکشہ یا ٹیکسی سے جاؤں گی۔ مگر بھائی! آپ کیوں پو
ہیں؟'' وہ ہنوز حیران وپریشان تھی۔

''اس لئے بہنا! کہ جب میں موجود ہوں تو تمہیں رکشہ' ٹیکسی میں دھکے کھانے کی کیا
ہے۔ چلو میں تمہیں بائیک پہ چھوڑ آتا ہوں۔'' لہجہ ہی نہیں انداز بھی بدل گیا تھا' درواز
تھامے کھڑی درنجف نے سکون کا سانس لیا تھا۔

''سچ بھائی! راستے میں آئس کریم بھی کھائیں گے۔'' ایف ایس سی کی سٹوڈنٹ الو
بھائی کے مضبوط کندھے سے لٹکی جارہی تھی۔

''بس ایک یہی تو چاہا تھا ہم نے۔'' نجف دونوں کو باہر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی

ل چیئر دھکیلتے اس کی طرف بڑھ آئے۔ اب سے کچھ دیر قبل اس کے چہرے پہ لکھی تمام
پڑھ چکے تھے۔

م نے بچوں کی تربیت میں کہیں کوئی کمی تو نہیں چھوڑی' پھرتم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس گھر
دسرا عظیم یا ایک دوسری نجف پیدا ہوسکتی ہے۔'' وہ پوچھ رہے تھے۔ درنجف نے مسکراتے
جھکا لیا۔ دوبارہ اپنے کمرے کی طرف پلٹتے ہوئے اس نے دانیال کے عقب میں صوفے پر
ابا کو واضح طور پر طویل سانس لے کر سر جھکاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر کمرے میں آکر
پر بیٹھ گئی تھی۔

ور مجھے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ماضی میں جو کچھ بھی ہوا' اچھا یا برا...... جب میں دیکھتی
ے ہنستے کھلکھلاتے بچوں کو...... اپنے جانثار شوہر کو...... اپنے پھولوں سے مہکتے گھر کو' اپنی
ندگی کو۔ اس بلند مقام کو جو خدا کے بعد صرف دانیال حسن کی دین ہے اور مجھے یاد رہتا ہے'
ے سامنے جھک جانا۔ سجدہ شکر بجالانا کہ جس نے مجھے عزت سے نوازا اور آسمان کے
تا ہوا چاند بنادیا۔''

کا دل احساس تشکر سے لبریز ہورہا تھا' سوفوراً ہی قلم اور ڈائری بند کرکے شکرانے کے نفل
ٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

ہم ہیں تہی داماں لوگو!

"آر ایچ چودھری......" وہ لڑکی میگزین کھولتے ہی چیخی تھی۔
"اوہ میرے اللہ!" وہ میگزین دونوں ہاتھوں میں جکڑے اسے اپنے لبوں سے چھو رہی تھی
"یہ بندہ میرے سامنے آجائے کبھی..... تو، تو جانے میں کیا کرڈالوں؟"
سرسری نگاہ سے مختلف کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا پلٹ کر اس لڑ
طرف دیکھا۔ کھلے پائنچوں کی پینٹ..... فل سلیوز کی ٹائٹ سی شرٹ۔ گریبان کے بٹن اس حد
کھلے تھے کہ نگاہ کسی مکار کیچوے کی طرح دانستہ پھل پھسل کر اس کے آخری بٹن سے لپٹ جاتی تھی
گلے میں جھولتا لاکٹ ہر سانس کے ساتھ ہلکورے لیتے سینے پہ زخمی سانپ کی طرح لوٹ رہا
گوری رنگت..... نم گلابی ہونٹ..... بھوری آنکھیں..... وہ بلاشبہ بہت خوبصورت لڑکی تھی.....
ہی پل میں بغور اس کا جائزہ لے کر اس نے دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔
"یہ شخص جادوگر ہے پورا....." اس کی آواز میں جلترنگ سی اتری ہوئی تھی۔
اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب واپس کاؤنٹر پہ رکھی اور باہر نکلنے کو پلٹا۔
"یہ دیکھو....." وہ لڑکی اپنی سہیلی کو دکھا رہی تھی۔
ان کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے یونہی نگاہ اٹھائی اور پھر بے اختیار ہی ٹھٹک گ
لڑکی کی دودھیا کلائی سے کچھ اوپر "آر ایچ" کے نیلگوں الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ اس نے
سے نظر ہٹا کر ایک پل کیلئے اس لڑکی کو جی بھر کر دیکھا اور پھر اس بک شاپ سے باہر نکل آ
گاڑیوں، موٹر سائیکلوں، رکشوں سے بچتا بچاتا وہ سڑک پار کر کے فٹ پاتھ پر آ گیا۔ کچھ دور جا
کے بعد وہ ایک جنرل سٹور میں گھس گیا تھا۔ خشک دودھ کا ڈبہ..... ٹی بیگز اور مہنگے برانڈ کے سگر

ردی کی ایک دکان پر چلا گیا..... جہاں بہت سی ردی کھنگالنے کے بعد "کلموہی" نکال کر وہ
وا..... ردی بیچنے والے لڑکے نے اسے دیکھ کر چند اور ناول اس کے سامنے لا رکھے۔
"یہ کتابیں خاص آپ کیلئے چن کر نکالی ہیں۔"
کے کی بات سن کر اس کے ہونٹوں پہ بھولی بسری مسکراہٹ آئی اور پھر لمحوں میں کھو گئی۔ نثار
کی "دریا کے سنگ" اسے ہمیشہ سے پسند رہی تھی۔ دونوں کتابیں اپنے بیگ میں ڈال کر رقم
ئی کر کے وہ وہاں سے نکلا تو پرہجوم راستوں سے نکل کر قدرے سنسان سی سڑک پر آ نکلا۔
"آر..... ایچ چودھری، یعنی رفاقت حسین چودھری....." اس نے اپنی رفتار قدرے دھیمی
ہوئے اپنے چمڑے کے بیگ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور دھوئیں کے مہین سے
فضا میں چھوڑتا آگے بڑھنے لگا۔
"یہ شخص پورا جادوگر ہے....." لڑکی کی پرجوش آواز اس کے کانوں میں گونجی تو وہ سر جھٹک
لے سے مسکرا دیا۔
سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا..... نہ ہی آسمان پر اڑتے پرندوں کے پروں پہ
پوری طرح وارد ہوئی تھی......
ہاں مگر یہ ہوا کہ وہ چلتے چلتے تھک سا گیا تو رک کر ایلیمنٹری کالج کے سامنے بہتی نہر کے
ے جا بیٹھا۔
"یہ بندہ میرے سامنے آجائے کبھی تو....." نہر کا پانی سبک روی سے بہہ رہا تھا۔ اس نے
چھوٹا سا کنکر اٹھا کر پانی میں اچھالا اور پھر بنتے ٹوٹتے دائروں کو دیکھتے ہوئے ٹانگیں اپنے
پھیلائیں اور درخت سے پشت ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔
ای جادو ساکت پل میں اس نے گھڑی بھر کیلئے خود کو سوچا۔
گرد آلود چمڑے کا کھلا جوتا..... گھسی ہوئی جینز..... جس کے پائنچے اس کے جوتے کے ساتھ
گھسٹ کر پھٹ چکے تھے۔ گھٹنوں تک آتا کھدر کا بوسیدہ گرے کرتا..... سیاہی مائل ہونٹ جن
سگریٹ کے دھوئیں کی کڑواہٹ رچ بس سی گئی تھی۔ کھڑی ناک..... بڑی بڑی سیاہ
یں..... گھونگھریالے بال..... جو بڑھ کر بڑے بڑے لچھوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔
ے شانے اور ان پر جھولتا چمڑے کا بیگ..... جس میں آج کے خریدے گئے سامان کے علاوہ
لا کی ڈبیہ..... ادھ جلی سگریٹوں کے کئی ٹکڑے..... چھوٹے، بڑے کاغذ جن پر ادھورے مکالمے
رے کردار تحریر تھے..... یونہی بے معنی سے جملوں سے اٹے ہوئے پرزے دو پین رنگ برنگی

چیونگم اور ایک گھڑی جس کا اسٹریپ ٹوٹا ہوا تھا' لیکن وقت بتاتی تھی۔

''اور یہ میں ہوں آر ایچ چودھری یعنی رفاقت حسین چودھری......'' سورج کی کرنوں کا رنگ مرجھانے لگا تھا...... دھیرے دھیرے چلنے والی ہوا نے لمبی سبز گھاس میں سرسراہٹ سی پیدا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شام کی لالی اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی تھی۔

''اور اگر میں یونہی اس حلیے میں اس لڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوتا......تو......؟ کیا تب بھی اسی طرح......''

گردن پہ تیز چبھن کا احساس ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار ہی ہاتھ اٹھا کر گردن پہ بھورے رنگ کی زہریلی چیونٹی اس کی گردن میں منہ گاڑے بیٹھی تھی...... اس نے اس ننھی مخلوق اپنی چٹکی میں مسلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ گھاس لمبی تھی اور اس میں چھپے کیڑے کتنے زہریلے تھے اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے بیگ کندھے سے لٹکائے وہ ایک بار پھر سڑک کنارے آ گیا۔ انگلیوں کی مدد سے سرخ ہوتی گردن کو مسلتے ہوئے وہ سورج کے ساتھ ساتھ واپسی کا سفر طے کرنے لگا۔

جس وقت اس نے گھر میں قدم رکھا' شام ڈھل چکی تھی اور رات کا اندھیرا ہولے ہولے کائنات پہ اتر رہا تھا...... بیرونی دروازہ شاید اس کی آمد کے انتظار میں کھلا ہوا تھا...... اس نے آ کر کنڈی لگائی اور چپہ بھر صحن عبور کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ بگھار کی خوشبو سارے گھر پھیلی ہوئی تھی اور باورچی خانے میں سے اماں کے روٹیاں پکانے اور لیلیٰ کے باتیں کرنے کی آواز بخوبی سنا دے رہی تھی۔

اس نے بتی جلائی اور بیگ میں سے آج کی خریدی گئی چیزیں نکال کر الماری میں رکھنے لگا لیلیٰ اس کے کمرے میں روشنی دیکھ کر بھاگی چلی آئی تھی۔

''کھانا لاؤں......؟'' اسے سلام کر کے عجلت میں پوچھا۔

الماری کے نچلے خانے میں بیگ رکھ کر وہ مڑا۔

''ہاں لے آؤ۔''

لیلیٰ ان ہی قدموں واپس لوٹ گئی۔

اپنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے اس نے جوتا اتارا تو پیر میں شدید دکھن کا احساس ہوا۔ پتا نہیں بے مقصد و بے ارادہ چلنے کی عادت اس نے کہاں سے چرا لی تھی۔

اور اب تو لگتا تھا چمڑے کے بھاری جوتے کو گھسیٹتے' کولتار کی سڑکوں کو پیچھے دھکیلتے دھکیلتے

...ں کے تلوے سپاٹ ہو گئے تھے۔ اس بے نام مسافت میں خوار ہوتے ہوتے اس کی ایڑیاں ...ں اور انگلیاں پھیل کر کچھ اور چوڑی ہو گئی تھیں۔

اور پچھلے کئی گھنٹوں میں ان چیزوں کی خریداری کے سوا اس نے کیا کیا تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ...کا دھواں اڑاتے ہوئے آتی جاتی سینکڑوں گاڑیوں کو دیکھا تھا۔ شہر کے پوش علاقے میں جا ...ورت' خوابناک بنگلوں اور کوٹھیوں کو اپنی آنکھوں میں سمویا تھا۔ سڑک کنارے بہت دور تک ...ران' بنجر زمین پہ اپنی بستی گاڑے خانہ بدوشوں کے چہروں پہ سجا دربدری کا دکھ چنا تھا۔ ...ت لڑکیوں کے نین نقش چرائے تھے' بھدی عورتوں کی آنکھوں میں اترتی حسرتوں کو شمار کیا ایک بوڑھے فقیر کے ساتھ ریزگاری گنتے ہوئے چند سکے اپنی طرف سے شامل کئے تھے اور ...ے ملنے والی ایک نئی نکور گڑیا کی مالک بچی کو ڈھونڈنے کیلئے وہ پہروں اسی مقام پر کھڑا رہا سینکڑوں مناظر نگاہ کے سامنے سے گزرے تھے...... آنکھ بھر گئی مگر...... دل خالی رہا تھا۔

''اور مجھے خود خبر نہیں ہوتی...... میری بے چینی مجھے کہاں کہاں لے جاتی ہے...... میں ہزار ...ں میں سے کس چہرے کو ڈھونڈتا ہوں......؟ خوبصورت گھروں پہ نگاہ ٹکائے رکھنے کے بعد ایک ...ں بستا گھرانہ مجھے اپنی طرف کھینچتے کیوں لگتا ہے؟ خوبصورت لوگوں سے مجھے محبت اور ...ت لوگوں سے مجھے عشق کیوں ہے؟ سڑک پہ اندھادھند چلتی گاڑیوں کا کوئی مول نہیں۔ مگر ...ت کش بوڑھے کی عمر رسیدہ سائیکل بھی تو انمول ہے۔''

''آ گئے رفاقت حسین......!'' اماں کی آواز نے سوچ کے بہتے دھارے کو روک دیا تھا۔ بند ...ں کھول کر دیکھا...... وہ کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں لئے کھڑی تھیں۔ اس نے ٹانگیں سمیٹیں اور ...تھا۔

...بگھاری دال تھی اور باریک کٹی ہوئی پیاز پر لیموں چھڑکا ہوا تھا...... اس نے ٹرے اپنی طرف ...ئی اور کھانا شروع کرنے سے پہلے اعزازیہ کی بقیہ رقم نکال کر اماں کے سامنے رکھ دی۔ ان ...ہرے پہ یکایک ہی روشنی سی اتر آئی۔

''ارے روپے آ گئے تھے تو گھر کا کوئی سودا لف لے آتے...... کوئی دال سبزی وغیرہ۔'' اماں ...ا الماری میں پڑی چیزیں دیکھ چکی تھیں۔

''مجھے کیا خبر تھی...... کیا موجود ہے کیا نہیں......؟''

لیلیٰ پانی کا جگ لائی تھی۔ اس نے وہیں ایک طرف ہاتھ دھوئے اور کھانا کھانے لگا۔

اماں ادھر ادھر کی باتوں میں لگی رہیں...... وہ جواباً ہوں' ہاں کہنے کا بھی روادار نہ تھا۔ تنگ

آ کر وہ خود ہی خاموش ہو گئیں...... آدھی پون روٹی کھا کر اس نے ٹرے ایک طرف کھسکا
چت لیٹ گیا۔

"چائے بنا دوں تمہیں۔" اماں کا لہجہ پہلے کی نسبت بجھا ہوا تھا...... اس کا لاتعلقی بھرا رو
بڑا دکھ دیتا تھا۔

"نہیں میں اب سوؤں گا...... لیلیٰ سے کہیے...... میرا مگ اچھی طرح دھو کر یہاں
جائے...... پانی کا جگ پڑا رہنے دیں۔" وہ جگ اٹھانے کو جھکی تھیں، اس کی بات سن کر یونہی
سے باہر نکل گئیں۔

لیلیٰ اپنے کبوتر بند کر رہی تھی...... سارا صحن ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گونج رہا تھا
کی کوفت بھری آوازوں اور کبوتروں کی غٹرغوں میں جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔



رات کا دوسرا پہرہ چل رہا تھا۔ وہ لکھتے لکھتے تھک گیا تو چائے کا آخری گھونٹ لے کر ا
ہوا...... کھلا پین یونہی کاغذوں پر رکھ کر وہ باہر نکل آیا۔

اب سے کئی گھنٹے پہلے وہ صرف ڈیڑھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھ گیا تھا اور تب سے اب
صرف اور صرف لکھ رہا تھا۔

کمرے کی نسبت باہر کی فضا خوشگوار بلکہ قدرے خنک تھی...... لیلیٰ کو شاید ٹھنڈ لگی ہو گی
چارپائی خالی چھوڑ کر اماں کے کمبل میں گھسی ہوئی تھی...... اس کا بستر یونہی بچھا تھا۔ اس نے
سلگائی اور لمبے لمبے کش لیتا لیلیٰ کی چارپائی پہ جا لیٹا...... بایاں بازو موڑ کر سر کے نیچے رکھتے ہو
زرد ہالے میں لپٹے چاند کو دیکھنے لگا، جو جامن کی چھدری شاخوں میں سر نہوڑائے پڑا تھا۔ آ
کی رات تھی...... ہوا رک رک کر چل رہی تھی اور کبوتروں کی کابک سے کسی نوزائیدہ کبوتر کی
چیں وقفے وقفے سے ابھر کر خاموش رات کے سینے میں شگاف ڈال رہی تھی۔

وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہانی کا اگلا حصہ بننے لگا۔

ان ہی کہانیوں سے اس گھر کے مکینوں کا پیٹ بھرتا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اپنے
اچھوتے خیالات...... منفرد کردار کبھی اونے پونے داموں فروخت نہ کرتا...... مگر اب......؟
تھی۔

اردو ادب کی ماسٹر ڈگری گزشتہ تین سال سے اس کے کسی کام نہ آئی تھی...... اور اس
اکلوتا سپوت ہونے کے ناتے دانے پانی کی فراہمی اس کا اولین فرض...... کیسا کڑا وقت تھا

پن سے اس کے ساتھ ساتھ تھی، مگر محرومی...... اس سے واسطہ تب پڑا تھا جب تایا جان مین
میں موجود دونوں دکانوں پر اپنی ملکیت جتا کر اپنے بچوں سمیت اس اڑھائی مرلے کے
کوچ کر گئے...... یہ سب کچھ اس کیلئے بے حد اچانک اور غیر یقینی تھا...... کم عمری......
کاری...... وہ اپنے حق کیلئے کچھ بھی نہ کر سکا...... ان چند سالوں کی تنگ دستی، بیماری،
...... اسے کیا سے کیا بنا گئے تھے۔ سیاہ آنکھوں میں دم بہ دم کروٹیں بدلتا قہر و جبر، غصہ،
...... چہرے پہ پھیلی کرخت سی سنجیدگی...... اسے ایک وقت میں کئی محاذوں پر لڑنا پڑا تھا۔
کوچہ رہزناں سے گزرتے ہوئے کچھ لٹانا بھی تھا، کچھ بچانا بھی تھا۔ اپنے ہاتھوں کا سونا لٹایا
ی آنکھوں کی دولت بچالی گئی۔

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں، مگر" اور اپنی انا، خودداری اپنے پندار کو بچانے کیلئے اس نے کیا کیا
نہ کیا تھا۔ دوست چھوڑ دیئے...... رشتے داروں سے منہ موڑ لیا...... غمی، خوشی میں کسی کا ساتھ نہ
ی کو دینے دیا۔ ماموں لاکھوں میں کھیلتے تھے، مگر اس نے اماں سے صاف کہہ دیا تھا۔

"مجھے دو وقت کی بھوک اس روٹی سے کہیں زیادہ پیاری ہے، جو کوئی ترس کھا کر میری جھولی
ال جائے......"

ں نے بیٹے کے تیور پہچانے...... بھائی کو صاف منع کر دیا۔

ں ساری تگ و دو میں ڈگری کسی کام نہ آئی تھی...... وہ ہنر آزمانے لگا...... حالانکہ وہ صرف دکھ
...... وہ دکھ جو اس کے سینے میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

ہی دکھ جو اس کی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کی صورت بستا تھا۔ جو اس کے ہونٹوں پہ لگتا اور
کی پوروں پہ رینگتا تھا۔

کیسی طمانیت، کیسا سکون بھرا تھا اس غم میں کہ لوگ آر ایچ چودھری پر جان دینے لگے تھے اور
یچ چودھری ہی تو تھا جس نے رفاقت حسین چودھری کی چال کا رنگ ڈھنگ ہی بدل ڈالا تھا
یہ ہی وہ دن تھے جب اسے دیکھ کر امائمہ ناز بے اختیار پکار اٹھتی تھی۔

جھکا ہے سر مگر آنکھوں میں وہ رعونت کہ
عجز میں دیکھ لیں ہم نے خدائیاں کتنی

اور وہ سچ کہتی تھی......

رفاقت حسینؒ اس فقیری میں بھی امیر تھا......

اس قناعت میں بادشاہت تھی......

غریبی میں سیری تھی۔



ہلکی سی آواز سے ڈھیر سارا باجوہ آنگن میں گرا...... وہ دیواروں، روشندانوں میں بڑ
بے قراری اڑان بھر کے آنگن میں اتر آئے...... ان کے پروں کی پرجوش کاٹ نے منہ
سے اجالے میں ایسی ہلچل مچائی کہ اس کی آنکھ ایک ہی جھٹکے سے کھل گئی۔

لیلیٰ نے اسے قدرے چونک کر جاگتے دیکھا تو سمجھی کہ شاید اس نے بے وقت ہی اے
ہے...... سہم کر فوراً ہی باورچی خانے میں بھاگ گئی۔

ایک تو چار سال کی بڑائی...... اس پر رفاقت حسین کا سنجیدہ و غصیلا رویہ...... وہ ہمیشہ ا
دب کر رہتی تھی...... حالانکہ وہ کچھ نہیں کہتا تھا...... مگر لیلیٰ اس کے دیکھنے کے انداز سے ہی
تھی۔

"پتہ نہیں چوبیس گھنٹے غصے میں کیسے رہ لیتے ہیں؟" وہ اکثر اماں سے شکایت کرتی۔

"غصہ نہیں ہے اس میں لیلیٰ! بس اپنوں کی بیگانگی نے تلخ بنا دیا ہے اسے۔" اماں
کرتیں...... مگر ایسی تلخی کو سہنا کم از کم لیلیٰ کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس کی آنکھ پوری طرح کھلی تو دانہ چگتے درجنوں کبوتر اس کے عین سامنے تھے......
سانس لے کر اٹھنے کی کوشش میں وہ بے اختیار ہی کراہ کر رہ گیا...... کتنے پہر ایک ہی زاو
لیٹے رہنے سے اس کا بازو گویا مفلوج سا ہو گیا تھا۔ بہت ہولے ہولے مسلتے اور دباتے ہو
نے بازو سیدھا کیا اور کچھ دیر یونہی لیٹے رہنے کے بعد اٹھ بیٹھا۔ چہرے کے بائیں جانب
چارپائی اپنا نشان ڈال گئی تھی...... بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے اچانک دایاں
اپنے سامنے پھیلایا...... رات کہانی کے تانے بانے میں الجھتے ہوئے جانے کب اسے نیند
تھی...... سلگتا سگریٹ یونہی انگلیوں میں دبا رہا...... تپش بڑھتے بڑھتے اس کی انگلیوں تک پہنچ
وہ ہڑبڑا کر جاگا تھا۔ مگر نیند کا غلبہ ایسا تھا کہ وہ بجھی بجھی سگریٹ اچھال کر ایک بار پھر نیند کی
میں کھو گیا اور اب دائیں ہاتھ کی بڑی انگلی پہ سرخ نشان بہت واضح تھا...... اس نے سر جھٹکا
کھڑا ہوا...... نئے دن کے طلوع ہوتے سورج کو دیکھ کر اسے خاصا افسوس ہوا تھا...... کہانی
کی آخری تاریخ نزدیک تھی لیکن اسے ابھی بہت سا لکھنا تھا۔

"خواہ مخواہ سو کر وقت برباد کیا۔"

اس نے آئینے میں اپنی بڑھی ہوئی شیو کا جائزہ لیا اور پھر کھونٹی سے اپنا تولیہ اور سیاہ کرتا

نے کیلئے چلا گیا...... نہا دھو کر گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتا ہوا وہ باہر نکلا تو برابر کے
اماں اور لیلیٰ کے ساتھ کوئی تیسری آواز بھی پورے گھر میں گونج رہی تھی...... خوب چہکتی
ے بھرپور۔

م خشک بالوں میں انگلیاں چلاتا اپنے کمرے میں آ گیا...... یونہی کھڑے کھڑے اپنے
سودے کا جائزہ لیا...... سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا...... وہاں سے جوڑنا اس جیسے موڈی
ے اتنا آسان نہ تھا۔

م کاغذات سمیٹ کر دراز میں رکھتے ہوئے اس نے کچھ دیر کیلئے لائبریری جانے کا فیصلہ کیا

ریبان کے بٹن بند کرتے ہوئے لیلیٰ کو ناشتے کیلئے آواز لگائی اور کف الٹ کر اپنے لئے
انے لگا...... گھر میں اس کے سوا کوئی چائے نہیں پیتا تھا...... معلوم نہیں بڑھی ہوئی مفلسی نے
چھڑوادی تھی یا پھر اماں اور لیلیٰ نے اس عیاشی کو عادت بننے سے پہلے ہی روک دیا تھا، تاہم
شب و روز میں چائے کا عمل دخل روٹی، پانی سے بڑھ کر تھا...... پانی سے بھرے مگ میں راڈ
س نے سگریٹ نکالی اور ماچس تلاش کرنے لگا، جب عقب میں ہلکا سا کھٹکا ہوا اور مسحور کن
کا جھونکا آن واحد میں پورے کمرے میں پھیل گیا۔ کاغذوں کا پلندہ الٹ پلٹ کر وہ قدرے
ا کر سیدھا ہوا تو نگاہ مگ سے ابل کر باہر آتے پانی پہ جا پڑی...... عجلت میں ہاتھ بڑھا کر اس
راڈ کا سوئچ کھینچا اور پلٹ کر حسنہ کو دیکھنے لگا، جو چھوٹی سی ٹرے میں ناشتہ سجائے دروازے کے
بیچ ایستادہ تھی...... خون چھلکاتے سرخ ہونٹ مسکراہٹ روکنے کی کوشش میں بھینچے ہوئے تھے۔

"ناشتہ...... ناشتہ لائی ہوں۔" اسے بہت سنجیدگی سے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ بمشکل بولی۔

"یہاں رکھ دو۔" وہ میز کی طرف اشارہ کرتا دانستہ باہر نکل آیا......

باورچی خانے سے ماچس لے کر وہ دوبارہ کمرے میں آیا تو حسنہ میز پہ پھیلی چیزوں کو ترتیب
رہی تھی۔

"پلیز......" اس نے قدرے سختی سے ٹوکتے ہوئے اسے پیچھے ہٹایا اور خود کرسی سنبھال کر بیٹھ
مگ میں ٹی بیگ ڈال کر خشک دودھ حل کرتے ہوئے وہ اس کی موجودگی سے قطعی بے نیاز بیٹھا
دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑی حسنہ کی نگاہیں اس کی تفکر آمیز لکیر پہ جمی تھیں، جو اس کی دونوں
وؤں کے بیچ بڑی رعونت سے گڑی تھی۔

"کیوں کھڑی ہو اب یہاں......؟" گرم چائے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اس نے براہ

راست اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔ حسنہ سے کوئی جواب نہ بن پایا تو یونہی کھڑی انگلیاں چٹخ
لگی۔

وہ کچھ دیر تک اس پہ نظریں جمائے بیٹھا رہا...... بالکل ویسی ہی نظریں جو بچے کو اس کی غ
احساس دلانے کیلئے تنبیہ آمیز ہوتی ہیں۔ وہ ڈھٹائی سے اپنی جگہ پر کھڑی رہی' یہاں تک کہ
جھٹک کر کچھ بڑبڑاتے ہوئے باقی ماندہ چائے پینے لگا تھا۔ تب حسنہ نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھا
اس ایک نگاہ میں اس مغرور کو قید کر لینے کی آرزو تھی...... اس کا ایک ایک نقش چھو لینے
آنکھ کی پتلی میں گھات لگائے بیٹھی تھی...... وہ دم سادھے کھڑی رہی...... نہیں چاہتی تھی کہ
سانسوں کی سرسراہٹ ابھرے اور یہ طلسم ٹوٹ جائے...... بس کچھ پل تھے اس کے پاس......
پلک جھپکنے کی بھی روادار نہ تھی۔

''کیوں دیکھ رہی ہو اب مجھے اس طرح؟'' اس نے خالی مگ میز پہ رکھا اور سگریٹ سلگا

''یہ آنکھیں میری ہیں رفاقت حسین چودھری!...... یہ وہی عکس چراتی ہیں جسے دیک
خواہش من میں ہو...... اب ان آنکھوں پہ کیسے پہرہ بٹھاؤ گے تم......'' وہ دل ہی دل میں ہنسی
پھر اسی دل کی شرارت پہ نہ جانے کیسے جرأت ہوئی کہ بنا کچھ کہے سگریٹ اس کے لبوں سے
لیا۔

''حسنہ!'' وہ اس زور سے گرجا تھا کہ کسی خوبصورت لمحے کے فسوں میں جکڑی حسنہ
کانپ کر رہ گئی تھی۔

جس تیزی سے اس کی آنکھوں میں غصے کی لالی اتری تھی اسی تیزی سے حسنہ کا چہرہ
میں ڈوب گیا تھا...... سگریٹ اس کی لرزتی' کانپتی انگلیوں سے چھوٹ گیا تھا۔

''تمہیں اپنی حدود یاد رکھنا چاہئیں حسنہ محمود! اس درجہ بے تکلفی کی اجازت میں...... کبھ
نہیں دے سکتا......'' اس کا لہجہ پتھریلا تھا...... کسی بھی رعایت سے عاری۔

حسنہ کی آنکھوں میں امڈتی نمی پر قطعاً توجہ نہ دیتے ہوئے اس نے اپنا لائبریری کارڈ اٹھا
دروازے سے آتی افتاں وخیزاں اماں کو ایک طرف ہٹا کر گھر سے باہر نکل گیا۔



سہ پہر کا وقت تھا جب وہ گھر لوٹا۔ دروازہ دوسری دستک کے جواب میں بھی نہ
دروازے کے پٹ میں موجود خلا میں بمشکل انگلیاں گھسا کر اس نے خود ہی زنجیر گرا دی۔
چھناکے کے ساتھ زنجیر لکڑی کے دروازے سے ٹکرائی تو دیوار کے سائے میں اپنی چونچ سے

ز ایک دم ہی اڑان بھر گئے۔ ان کے بدن سے اترے ننھے چمکیلے پر ادھر ادھر سے اڑ کر
رہ گئے۔

یں غیر معمولی خاموشی تھی۔ جامن کی شاخوں سے لٹکے آبخورے خشک اور چڑیاں پانی
یں ہلکان۔

ں نے ان آب خوروں کو کبھی خشک نہ رہنے دیا تھا...... ڈھیروں چڑیاں یہاں سے دن
بھوک پیاس مٹاتی تھیں...... آج غالباً وہ گھر پہ نہ تھیں...... ایسا سناٹا ان کی غیر موجودگی میں
کونوں کھدروں سے نکلتا تھا...... ناقابل برداشت...... اور اذیت ناک سناٹا۔

ج کا دن یوں بھی خشک اور اداس کر دینے والا تھا...... لائبریری کے ٹھنڈے اور پرسکون
ں سے نکلنے کے بعد اسے موسم میں عجیب سے اداسی اور پژمردگی کا احساس ہوا تھا۔ پودے
ساکت وصامت تھے۔ ہوا رکی ہوئی' ہر چہرے پہ بے زاری اور اکتاہٹ' گاڑیوں کے ہارن
زار بے ڈھنگی...... نہر کا پانی بھی ساکن تھا' کچھ نہ کہتا ہوا سست خفا خفا سا پرندے درختوں کی
چھوڑنے سے گریزاں...... اسکا دل باہر کی دنیا میں نہ لگا تو گھر چلا آیا...... مگر یہاں کی بے
بے زاری باہر سے بڑھ کر تھی۔

نڈیر پہ بیٹھا کوا گھر کی سنسان سی خاموشی میں اپنی کریہہ آواز گھولنے لگا تھا...... وہ کنڈی
ا اپنے کمرے میں آ گیا' جس کی نیم تاریکی میں قدرے سکون تھا......

رے فرش پر پراسرار سی خاموشی رینگ رہی تھی...... اس نے دروازے بھیڑ کر بتی جلا
رہ اس کی غیر موجودگی میں صاف ہو چکا تھا...... اس لئے قدرے کشادہ لگ رہا تھا۔ جوتے
ں کی ٹھنڈک پیروں میں جذب کرتے ہوئے اس نے لیلیٰ کو آواز دی۔ وہ جانے کس کونے
میں گھسی ہوئی تھی۔

ب کوئی آواز ابھری نہ آہٹ...... اس نے خود ہی نکل کر ساتھ والے کمرے میں جھانکا......
دوپٹہ تانے غالباً گہری نیند میں تھی اور اس کے ساتھ دوسرے پلنگ پر...... وہ قدرے
صبح کا واقعہ تمام تر تلخی کے ساتھ یاد آیا تھا۔

نوں بازو گھٹنوں کے گرد باندھے کسی پنڈولم کی طرح ہلتی ہوئی حسنہ نے سر اٹھایا' مگر وہ بنا
پلٹ آیا...... دروازے کی چٹخنی چڑھا کر چائے کا کپ تیار کر کے وہ اپنی کرسی پہ آ بیٹھا۔
نے کے دوران کہانی کے ہر کردار کا انجام ذہن میں دہراتے ہوئے اس کو بالکل بھی یاد نہ تھا
انے صبح سے صرف چند بسکٹ کھائے ہوئے ہیں اور اب تک ان ہی پہ گزارا کئے ہوئے

ہے...... پین میں سیاہ روشنائی بھر کے خود کو تازہ دم کرتے ہوئے اس نے لکھنا شروع کیا تو پھر
چلا گیا۔

اس دوران لیلیٰ کھانے کا پوچھنے آئی بھی تو دروازہ بند دیکھ کر دستک دینے کی ہم
ہوئی...... وہ لکھتے وقت مکمل تنہائی اور یکسوئی چاہتا تھا' نہ کوئی شور' نہ آہٹ' نہ کھانا' نہ پینا' بس
کا دھواں کمرے کی فضا کو بوجھل بناتا جاتا اور اس کا قلم رواں رہتا...... ذرا سی دخل اندازی بھ
چڑا دیتی تھی...... ذہن الجھتا تو کہانی کھو جاتی تھی...... کردار ہاتھ چھڑا لیتے اور لفظ اس کے
میٹی کھیلنے لگتے تھے۔

پھر لکھتے لکھتے انگلیاں شل ہو گئیں...... نجانے کتنا وقت بیتا تھا...... اسے اندازہ نہ ہو
دھواں خشک حلق میں زہریلے کانٹے کی طرح چبھنے لگا' تب اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا پانی
شدید تھی اور جگ خالی۔ اس نے کھلا قلم بند کر کے کاغذوں پر لڑھکایا اور کرسی سے ٹیک لگا کر
دراز ہو گیا۔ گردن میں شدید اکڑاؤ محسوس ہو رہا تھا اور پپوٹوں پہ جیسے کسی نے بھاری پتھر
تھے...... کچھ دیر تک یونہی خود کو آرام دینے کے بعد اس نے اٹھنے کیلئے کرسی کھسکائی اور پھر
چونک سا گیا۔ میز کی بند دراز سے ایک تہہ شدہ کاغذ باہر جھانک رہا تھا۔

کچھ تعجب سے اس نے وہ کاغذ نکال کر کھول لیا۔

''محبت کی حدوں کا تعین کون کر سکتا ہے رفاقت حسین! اس کی آخری حد جنون کی
جا ٹھہرتی ہے...... تم میری محبت تو جھیل نہ سکے...... میرا جنون سہہ لو گے؟''

اور اس سے آگے ایک طویل نظم...... جسے لکھنے والا حسنہ محمود کے سوا اور کون تھا۔ اس
تحریر پڑھے بغیر وہ کاغذ مٹھی میں بھینچا اور بہت سے ردی کاغذوں کے ساتھ کر کے باہر آ گیا
میں چارپائیوں پہ دھلی ہوئی چادریں بچھی تھیں...... ملگجی سی شام دھیرے دھیرے رات کا لبا
رہی تھی۔ حسنہ منہ ہاتھ دھوئے' بال بنائے تازہ دم ہو کر جانے کو تیار کھڑی تھی۔ لیلیٰ اس کے
تیز باتیں کئے جا رہی تھی...... اماں چارپائی پہ بیٹھی سلاد وغیرہ کاٹ رہی تھیں۔ اس کے باہ
ان تینوں نے بیک وقت اسے دیکھا تھا۔

''اماں' کچھ کھانے کیلئے......'' وہ خالی چارپائی پہ آ لیٹا۔

اماں نے فکرمندی سے اس کی تھکن آلود آنکھوں کو دیکھا...... لیلیٰ' اماں کے اٹھنے
باورچی خانے میں جا چکی تھی۔

''تم ہی کیوں نہیں سمجھاتی ہو اسے......'' انہوں نے دبی آواز سے حسنہ کو کہا۔

نیا بھر میں بہت سے لوگ لکھتے ہوں گے...... کیا یونہی تن من کا ہوش بھلا دیتے ہیں۔''
ردن موڑ کر دیکھا...... وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔
یکن صرف لکھنے کا معاملہ نہیں...... ان دنوں فارغ ہو تب بھی یونہی اپنی جان جلاتا ہے......
ب رہتا ہے گھر سے...... کھانے کا پوچھوں نہیں تو اس سے بھی چھٹی......'' وہ آنکھوں میں
ے دیکھ رہی تھیں۔
پہلے دوست' احباب چھوڑے تھے...... پھر ہم سے لاتعلق ہوا...... اب تو لگتا ہے خود سے بھی
رہا ہے۔ حسنہ! یہ کچھ کہتا بھی تو نہیں...... غمی خوشی' سکھ' پریشانی۔ انسان سو باتیں بانٹتا
لاکھ کہتا سنتا ہے...... ایسی زور آور چپ تو گھن کی طرح چاٹ لیتی ہے بندے کو...... خدا کی
ڈر لگنے لگا ہے......'' ان کے لہجے میں کئی خدشے اور واہمے جاگ اٹھے تھے۔
سنہ نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اسے کھو بیٹھوں' یہ میرے دل میں تو بستا ہے...... لیکن میری روح کا
ے ٹوٹتا جا رہا ہے...... جانے کیسا حصار باندھا ہے اس نے اپنے گرد کہ میرا وجدان اس
ک پہنچ ہی نہیں پاتا۔''
لیٰ چاول گرم کر کے رائتہ کے ساتھ لے آئی تھی...... وہ اس کے اٹھنے کے خیال سے چپ
لیکن لیلیٰ کے دوبارہ پکارنے پر احساس ہوا کہ...... وہ سو چکا ہے۔
نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔
قت حسین!'' وہ قدرے گھبرا کر اٹھیں...... آنکھوں پہ رکھے بازو کو ہٹانا چاہا تو وہ ہڑبڑا سا
ی سرخ آنکھیں کھول کر اماں کو دیکھا۔
ھانا کھا لو بیٹا! پھر سو جانا......''
طویل سانس لے کر وہ بہ دقت تمام اٹھا...... لیلیٰ اس کے سامنے برتن رکھنے لگی تھی۔ حسنہ
دروازے کی طرف جاتے ہوئے نظر بھر کے اسے دیکھا اور اماں کو خدا حافظ کہتی باہر نکل
یور پچھلے ایک گھنٹے سے اس کا منتظر تھا۔
انشست پر بیٹھتے ہوئے اسے کسی خالی پن کا احساس ہوا تھا۔
جانے کیا کچھ چھوڑ آئی ہوں......'' اس نے بے وجہ ہی اپنا بیگ کھنگالا۔
ب کچھ وہیں کا وہیں تھا...... اس نے جھنجلا کر بیگ پرے پھینکا اور مڑ کر دیکھنے لگی۔ چھوٹا سا
کی تاریکی کی زد میں آ رہا تھا' لیکن آنگن میں جلتے بلب کی روشنی اسے یہاں سے بھی

دکھائی دے رہی تھی۔ گاڑی لمحوں میں وہ طویل سڑک پار کر آئی تھی' جس کے کبھی نہ ختم ہونے کا
وہ ہمیشہ کرتی تھی۔

"تم گاڑی بہت تیز چلاتے ہو رستم!" اس نے جیسے شکایت کی تھی۔

رستم نے بیک ویو مرر سے اس کا چہرہ بڑی حیرت سے دیکھا تھا...... وہ ابھی تک پیچھے رہ
والے راستے کو تک رہی تھی...... سڑک کا موڑ مڑنے سے قبل آنگن میں جگمگاتی روشنی ایک ننھے
شکل اختیار کر گئی تھی...... حسنہ نے بڑے پیار سے وہ جگنو آنکھ کی پتلی میں سمیٹا اور آنکھیں بند
سیٹ سے سر ٹکا دیا۔

"کتنے جابر ہو تم رفاقت حسین! ہر محبت رد کئے جانے کے قابل نہیں ہوتی اور تم میرے
جذبوں کو بے مول کرنے پر جانے کیوں تلے ہوئے ہو......؟" وہ پوری توجہ سے اسے سو
تھی۔



کہانی مکمل ہو گئی تھی...... وہ ڈاکخانے سے رجسٹری کرا کر باہر نکلا تو خود کو بے حد ہ
محسوس کر رہا تھا...... کچھ موسم بھی دلفریب تھا۔ آسمان بادلوں سے بھرا اور ہوا تیز۔ بکھرے بالو
انگلیاں چلاتے ہوئے وہ کچھ دیر سڑک کنارے کھڑا رہا...... سائیکل سواروں کی ایک ٹولی
بجاتی' پیڈل پر تیزی سے پاؤں مارتی اس کے قریب سے گزر گئی تو وہ سڑک پار کر کے فٹ
آ گیا۔

گھرے بادلوں نے ساری فضا کو سرمئی رنگ میں رنگ دیا تھا...... موسم کی خنکی بد
اتارتے' تیز رفتار گاڑیوں سے پل بھر کیلئے گونجنے والے میوزک سے محظوظ ہوتے وہ
سنسان سی سڑک پر آ گیا تھا۔ سٹیڈیم کے عقبی پارک میں کچھ لڑکے ایکسرسائز کرنے میں
تھے...... وہ ہوا میں رچی سبزے کی بھرپور مہک کو محسوس کرتا یونہی چلتا رہا...... نہ کسی خیال
دل کو تھاما...... نہ ہی سوچ کا کوئی کیڑا دماغ میں کلبلایا...... اس وقت سکون سے لطف ک
ہوئے وہ ہاکی سٹیڈیم کی طرف جا رہا' جب ہلکی ہلکی پھوار اس کے چہرے پہ پڑنے لگی۔

تب ہی ایک سلور گرے کرولا اس کے قریب سے گزری اور کچھ دور جا کر رک گئی۔
دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز اس نے اگر سنی بھی تو توجہ ہرگز نہ دی تھی۔ البتہ اس وقت
طرح چونکا تھا' جب بھاگتے قدموں کے ساتھ کوئی اس تک آیا اور پھر قدم سے قدم ملا کر چ
نے گردن گھما کر قدرے حیرت سے ہلکی پھوار میں بھیگتی حسنہ محمود کو دیکھا۔

اس کے سنہری چہرے پہ سونا بن کر اتر رہی تھی...... لبوں کی مسکراہٹ اتنی ہی بے اختیار
ان سے برستا پانی۔

پھو کیسی ہیں......؟" یہ اتفاق اس کی زندگی کا حسین اتفاق تھا۔ وہ پہلی بار اس کے ساتھ
ہی تھی...... شاید اسی لئے پر جوش تھی...... قدم ڈھنگ سے زمین پہ ہی نہ پڑ رہے تھے۔

یسی ہی جیسی دو دن قبل تھیں۔" اس کی ساری توجہ دائیں طرف بنی نرسری کے سرسبز و
پودوں پر تھی۔

بی ٹھیک تھا...... اور لیلیٰ؟"

وہ بھی ٹھیک ہے۔" بڑی اجنبیت تھی اس کے انداز میں۔

نہ قدرے چپ سی ہو گئی...... اسی چپ میں اس نے بیسیوں جملے ترتیب دیئے تھے اس سے
ر ہر جملہ زبان کی نوک پر آ کر دم توڑ گیا تھا۔

پتا نہیں کیوں میں اس شخص سے کھل کر بات نہیں کر پاتی۔" شدید بے بسی محسوس کرتے
اس نے نگاہ اٹھا کر اس طویل قامت کو دیکھا۔

"سیاہ لباس بہت جچتا ہے اس پر......" پہلی نگاہ سرسری تھی۔ دوسری بار چور نگاہوں سے بغور
ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو میں اس کی سفید رنگت پہلے سے زرد لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد ہلکے
لقے بن گئے تھے۔ اس کا بے اختیار دل چاہا تھا اسے بازو سے تھام کر روک لے اور اس کی آنکھ
پڑوں پر اگر ہلکا براؤن رنگ اپنی پوروں میں سمیٹ لے۔

"آہ......!" پاؤں نجانے کہاں جا پڑا تھا۔

سڑک پر سیدھی منہ کے بل جا گرتی اگر وہ بازو سے تھام کر سہارا نہ دے دیتا۔

"اوہ میرے خدا!" اس کا دل بری طرح دھڑکا...... اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ اس کا بازو
چکا تھا...... بری طرح شرمندہ ہوتے ہوئے حسنہ نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پایا۔

"قدم رکھنے سے پہلے مقام دیکھ لینا چاہئے۔ کہیں کھائی ہوتی ہے...... کہیں کانٹا اور سہارا
دینے والے ہر جگہ موجود نہیں ہوتے۔" حسنہ کے سرخی مائل بھورے بالوں میں اٹکے پانی کے قطروں
پر ایک اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے وہ نصیحت کرنا نہ بھولا تھا۔

حسنہ کے قدم خود بخود سست پڑ گئے۔

ابھی تو اس کی مضبوط گرفت کا لمس بھی اس کے بازو سے جدا نہ ہوا تھا اور وہ جتا گیا تھا۔

"مان لیا کہ سہارا دینا تمہاری عادت نہیں' لیکن اگر یہ جرم تم سے سرزد ہو ہی گیا تھا تو کچھ دیر

کیلئے اپنایا میرا بھرم ہی رکھ لیتے۔" بارش پہلے سے تیز ہوگئی تھی...... اس کا چہرہ بھیگنے لگا۔

"اور کبھی کبھار تو دیکھتے بھالتے بھی کانٹا چبھ ہی جاتا ہے رفاقت حسین یا جانتے بوجھتے کھائی میں جا پڑتا ہے...... تب......؟" اس نے جیسے بے قرار ہو کر سر اٹھایا اور پھر وہیں پہ قد دیئے۔

وہ اس سے کئی قدم آگے جا رہا تھا اور ان دونوں کے بیچ بارش کا پانی مہین پردے کی میں تن گیا تھا۔

حسنہ کتنی ہی دیر تک اس کی پشت پر نظریں جمائے بارش میں بھیگتی رہی...... شاید وہ دیکھے...... اسے ساتھ چلنے کو کہے۔

لیکن وہ اس کی امیدوں پر کبھی بھی پورا نہ اترا تھا...... مایوس ہو کر وہ چند قدم الٹے چلی اور رخ ہی بدل لیا۔

بارش ہوتی رہی...... وہ دانستہ خود کو بھگوتا رہا...... اپنے تنہا رہ جانے کا احساس اسے پل بھر ہو گیا تھا...... مگر پلٹ کر دیکھنا وہ کب کا بھول چکا تھا۔

"لوگ ساتھ چلتے ہیں...... ساتھ چھوڑ دیتے ہیں...... مڑ کر دیکھنا عذاب ہے...... بس تو ہے جو دور تلک ساتھ چلتی ہے۔" بارش کا پانی آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر رفتار کر دی۔

اور کچھ فاصلے پر اسٹیئرنگ تھامے گہرے دکھ کی لپیٹ میں آئی حسنہ نے ونڈ اسکرین پر گ بارش کے قطروں کو دیکھ کر سوچا تھا۔

"پلٹ کر دیکھنے والا اگر پتھر ہو جاتا ہے تو پلٹ کر نہ دیکھنے والا پتھر دل۔" پتہ نہیں تم بے حس اور جابر کیوں بنتے جا رہے ہو رفاقت حسین!"

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے لے کر گھر پہنچنے تک اس کا دل بوجھل ہی رہا تھا۔

اور رات کے آغاز پر جب گھپ اندھیرے میں لیلیٰ اماں کے کہنے پر دیوٹ میں شمع جلا تھی...... ہلکی سی کن من میں حسنہ محمود کا ڈرائیور گلاب کے چند ادھ کھلے پھولوں سمیت ایک پہنچانے آ گیا تھا۔

بجلی بند تھی اور خود وہ اس وقت نہا کر لباس بدلنے کے بعد ریڈیو کھولے بیٹھا تھا...... ڈرائ آواز پہچانتے ہوئے دروازہ اماں نے ہی کھولا تھا...... اور رفاقت حسین چودھری کے نام آنے وا یہ تحائف انہیں کچھ مضطرب بھی کر گئے تھے، پھر بھی انہوں نے دونوں چیزیں اسے لا تھمائی تھیں۔

یٹ کا دھواں، چراغ کے دھوئیں میں اس وقت مدغم ہوا تھا جب تھرتھرائی ہوئی لو میں کارڈ پڑھنے کیلئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ج جب بارش ہوئی
ی اک خیال آیا
ں نہ ایک بادل کو
داں بناؤں میں
ھی مجھ پہ گزری ہے
کو سب سناؤں میں
سے جو بھی کہنا ہے
کو سب سناؤں میں
تمہارے دل پر وہ
ج ہی برس جائے

یئے کی حاسد لو کارڈ کا کونا چاٹ رہی تھی...... وہ تحریر پڑھنے کے بعد چپ چاپ دیکھے گیا۔ "لفظوں میں بڑی طاقت ہوا کرتی ہے...... زنجیر بن کر جکڑ لیں تو دل کو غلام بننے اور روح کو ہرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"...... کاغذ کا یہ ٹکڑا تمہارا رزق بنے۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ؟"

وہ چپ چاپ آگ کو بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر سیاہ راکھ کو ہتھیلی میں مسل کر ہوا برد

شبنمی قطروں سے سجا پھولوں کا گلدستہ وہیں پڑا رہا...... اگلی صبح لیلیٰ کی نگاہ ان ادھ کھلے کی سیاہ پڑتی پتیوں پر پڑی تو گلدستہ اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

تازہ پانی سے بھرے گلدان میں پھول سجا کر وہ آتے جاتے نظر بھر کر انہیں دیکھتی رہی۔ اسے ہت اچھے لگتے تھے۔



آج شب برات تھی۔ آس پڑوس سے چھوٹے بڑے پٹاخے چلنے کی آوازیں آتی رہیں، مگر کے اس پہر گھر میں مکمل خاموشی تھی...... اماں حلوہ بنانے کا اہتمام کر رہی تھیں۔ لیلیٰ نے مٹھی بھر صاف کر کے اماں کے سامنے رکھی اور خود کئی دنوں سے سنبھال کر رکھا گیا ناریل کترنے

لگی...... ماضی کی بہت سی خوشگوار یادوں کو دل ہی دل میں دہراتے ہوئے وہ کبھی کبھی اماں سے کوئی
بات کہتی اور پھر سے مگن ہو جاتی۔
جامن کے درخت تلے کرسی بچھا کر پڑھتے ہوئے اس نے گھڑی بھر کیلئے کتاب اوندھی کی اور
دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر کرسی جھلانے لگا۔

مکین و مکاں سب تمہارے لئے
زمین و زماں سب تمہارے لئے

قریبی مسجد سے کوئی عمر رسیدہ آواز ابھر رہی تھی۔
گھی میں الائچیاں تڑکنے کی خوشبو اس تک پہنچی تو اس نے بے اختیار ہی گردن گھما کر دیکھا
صحن کے ایک کونے میں چولہا رکھے لیلیٰ اور اماں دونوں بہت مصروف تھیں۔
لیلیٰ کو پکار کر کمرے سے سگریٹ اور ماچس لانے کو کہا اور خود دوبارہ سے کتاب کھول لی۔
ہی دروازے کھلا۔
اس نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا...... کھلے دروازے سے حسنہ محمود کا چہرہ جھانک رہا تھا۔
''میں اندر آ سکتی ہوں؟'' وہ پرجوش انداز میں پوچھ رہی تھی۔
اماں بھتیجی کے سواگت کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں...... وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر کمرے میں
آیا...... جانتا تھا اب یہ محفل یہیں جمے گی اور کافی دیر تلک۔
''میں آپ کو لینے آئی ہوں۔'' اس کی بلند آواز کھلے دروازے سے اندر چلی آئی تھی۔ ا
اس سے وجہ دریافت کرنے لگی تھیں۔ وہ کتاب کے صفحے الٹنے لگا۔ اس پل حسنہ بڑے دھڑلے
اس کے کمرے میں چلی آئی۔
''آج ہم نے گھر میں عبادت اور دعا کا انتظام کیا ہے...... ڈیڈی نے خاص طور پر پھپھو کو
ہے اور میں لیلیٰ کو لینے آئی ہوں...... لے جاؤں......؟'' وہ بڑے استحقاق سے بولتے بولتے
پل کیلئے ٹھہر گئی، پھر مدھم لہجے میں بولی۔
''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو......''
''یہ بات تمہیں اماں سے پوچھنی چاہئے۔''
''انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ وہ خود تو ظاہر ہے جائیں گی ہی...... میں تم سے
کی بابت پوچھنے آئی ہوں۔'' اب کے اس کا لہجہ قدرے سپاٹ تھا۔
''لیلیٰ اپنی مرضی کی خود مالک ہے...... وہ جانا چاہتی ہے تو لے جاؤ۔'' سگریٹ ہونٹوں میں

جلاتے ہوئے اس نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی......
بھی لفظ کہے بغیر باہر نکل گئی۔
ہی دیر میں گہری ہوتی شام آنگن میں بیٹھے اس کے تنہا وجود کو دیکھ رہی تھی۔ اماں
کر ڈھانپ گئی تھیں، کھا لینے کی تاکید کے ساتھ۔ لیکن اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔
خود فراموشی کے عالم میں پڑا رہنے کے بعد وہ اٹھا...... سارا گھر تیرگی میں ڈوبا ہوا
تھی نہ اسے ضرورت محسوس ہوئی...... وہ دروازہ کھولے باہر کی رونقیں دیکھتا رہا......
پر نکل گیا۔
سامنے چند چھوٹے چھوٹے بچے پھلجڑیاں ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔ رنگا رنگ
وہاں گرتیں تو ان کے معصوم چہرے دھنک رنگ روشنی میں دمکنے لگتے۔ انہیں دیکھتے
نہیں کیوں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ شاید حیات سے
لمحہ تھا، جو اس لمحے میں یاد آ کر رہ گیا تھا...... مسجدوں سے مختلف آوازیں مل جل کر گونج
وہ اٹھا اور کسی سمت کا ارادہ کئے بغیر چل دیا...... گھر کے ساتھ گھاس پھونس اور جنگلی
ائی زمین تھی، جس کے گرد کسی گئی چار دیواری جگہ جگہ سے گری ہوئی تھی...... اس سے
دروازوں کا ایک مکان جس پر سالہا سال سے تالے پڑے ہوئے تھے، اس سے آگے
ٹوٹے کئی مکانات...... جن میں جلتی بجھتی روشنیاں بستے گھروں کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ
کی نظر سے تمام منظر دیکھتا رہا...... گھروں کی دیواروں پہ جلتے دیئے چھتوں تے چھوٹی
اور رنگا رنگ قمقموں، روشنیوں سی سجی مساجد، حمد و نعت، مناجات...... وہ خوشی...... مطمئن
ہر ہر مسئلے سے جان چھڑا کر وہ مسجد میں جانے والوں کو دیکھتا رہا۔
کھڑے کیوں ہو جوان......؟ اندر چلو......'' ایک بزرگ نے جاتے جاتے اسے پکارا۔
لڑکے رک کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔
کر کے اندر نہیں گیا...... وہیں سے قدم واپسی کیلئے موڑ لئے، ان لڑکوں کی آنکھوں میں
ی...... شبہ بھی۔
لے جوتے کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے وہ استہزائیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے چلتا رہا۔

ہوئے شہر کے مکینو!
نہ دیکھو
میرا سایہ

تمہاری رنگوں نہائی صبحیں
چبا نہ ڈالے
کہ میرا سایہ
کسی کھنڈر میں پرانی محراب کا دیا ہے
نہ میرے سینے میں روشنی ہے
نہ میرے لب پہ کوئی دعا ہے!



چند روز ہی بیتے تھے جب حسنہ محمود کا ڈرائیور ایک بار پھر دروازے پر آ پہنچا۔
ماموں نے ارجنٹ بلوایا تھا...... گاڑی باہر کھڑی تھی۔
یہ بلاوا ایسا اچانک تھا کہ اماں کے ہاتھ سے چیزیں چھوٹ چھوٹ گئیں۔
"خدا خیر...... ایسی عجلت میں آج تک کبھی میرے بھائی نے مجھے تکلیف نہیں دی۔"
انہوں نے گھبراہٹ میں کپڑے بھی نہ بدلے...... لیلیٰ نے دھلی ہوئی چادر انہیں اوڑھا
وہ آناً فاناً گھر سے باہر...... ساری راہ ڈرائیور سے پوچھتی رہیں، مگر تسلی نہ ہوئی...... بھائی کے
پہنچیں تو وہ مزے سے ناشتے میں مشغول...... بہن کے چہرے پہ اڑی ہوائیاں دیکھیں تو
ہوئے تسلی دی...... ملازمہ کو جوس لینے بھیجا...... حسنہ کچھ کہے بغیر ان سے لپٹ کر مسکراتی رہی
ناشتے سے فارغ ہو کر بھائی نے بتایا۔
"لیلیٰ کیلئے رشتہ آیا ہے......"
وہ پہلے حیران ہوئیں...... پھر پریشان...... لڑکے کے مقام و حیثیت کا سنا تو دنگ رہ گئیں
"لڑکے کی گارنٹی میں دیتا ہوں...... تم یہیں اپنی رائے سے آگاہ کرو......"
وہ بیٹے سے مشورہ کئے بنا کیا کہتیں......؟ ان ہی قدموں واپس لوٹ آئیں۔



اپنے کمرے کے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے کھڑے اس نے بغور اپنے اس
مرلے کے مکان کو دیکھا تھا۔ پلستر اکھڑی کائی زدہ دیواروں میں رخنے نمایاں تھے۔ برس ہا
کرائی گئی قلعی خواب و خیال ہو گئی تھی۔ صحن کے فرش پہ سیمنٹ کے پیوند، کمروں کی حالت
بھی بدتر...... قدیم زمانے کے بنے ہوئے اونچی چھتوں والے کمرے جن کی کڑیاں بو
گرنے لائق...... رنگین شیشوں والے روشندان، جن سے چھن چھن کر آنے والی روشنی سا

کمرے کی فضا کو رنگین بناتی تھی، اب بے رنگ ہو کر اپنی جگہ جام ہو چکے تھے...... لکڑی
ں کی چٹخنیاں ٹیڑھی میڑھی اور ان میں لگے شیشے اس درجہ دھندلے کہ آر پار دیکھنا محال۔
ں کا بک جیسے چاروں کمرے آمنے سامنے تھے۔ بیچ میں چھوٹی سی گلی...... کمروں کو ہوا دار
جالی دار کھڑکیاں ہمہ وقت کھلی رہتی تھیں...... اب کے باوجود قدیم لکڑی کی باس اور سیلن
ان چاروں کمروں میں چکراتی پھرتی تھی۔
م نے بتایا نہیں رفاقت حسین! میں انہیں کیا جواب دوں......؟" اماں اس کی طویل خاموشی
ر دوسری بار بولی تھیں۔
ذرا سا چونکا...... پھر گہری سانس لے کر کرسی پہ آ بیٹھا...... چہرے پہ تفکر کے آثار نمایاں
ماتھے پہ کھنچی لکیر لحہ بہ لحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔
ں کی گمبھیر چپ سے اماں کو بے چینی سی لاحق ہونے لگی۔
"نہیں اماں! یہ مناسب نہیں ہے......" وہ بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ کر بولا تو اُن کا دل دھک
یا۔
"لیکن کیوں رفاقت حسین! اتنا اچھا گھرانہ......"
"اتنا اچھا گھرانہ اس اڑھائی مرلے کے مکان میں بسنے والی کو تیسرے درجے کی مخلوق بھی نہ
ا۔"
ا بات نہیں...... انہوں نے خود پسند کیا ہے ہماری لیلیٰ کو......" اماں کا لہجہ لڑنے سے پہلے
تھا۔
رہاتی فیصلے وقتی ہوا کرتے ہیں...... پہلے روز پسند کیا...... چوتھے روز رشتہ بھجوا دیا...... ان کی
مجھے یہاں بیٹھے نظر آ رہی ہے......" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔
یل جول اپنے جیسے گھروں میں ہی اچھا لگتا ہے...... آج آپ دولت کی چکا چوند سے متاثر
، کل اسی دولت کی تاریکیاں آپ کی بیٹی کو نگل لیں گی۔ پوچھ لیں اس سے...... وہ اپنے
سرالیوں کا بچا کھچا کھا سکے گی......؟ طنز، تحقیر، طعنے...... ان کا تحائف کو وصولنے کی ہمت ہے
"
ں دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی رہیں۔
آپ نے مجھ سے رائے طلب کی ہے...... میری طرف سے معاملہ ختم سمجھیں۔" اس کا قطعی
ل کی آنکھوں میں کئی راتوں کی بے خوابی بو گیا۔

دوسری طرف بھائی کی تسلیاں‘ دلاسے تھے۔

”ایک عرصے سے ان لوگوں کو جانتا ہوں...... وہ بھی کوئی جدی پشتی رئیس نہیں
ترشی دیکھ کر ہی اس مقام تک پہنچے ہیں...... اور پھر لیلیٰ میری اپنی بیٹی ہے......کوئی اونچ
کرے ہو بھی گئی تو میں سنبھال لوں گا......“

”لیکن وہ نہیں مانتا۔“ اماں مجبور محض تھیں۔

”وہ...... رافے...... نادان ہے...... بالکل ناسمجھ...... انا کا مارا ہوا‘ اس کی خودداری
ہے کہ تم لوگ ابھی تک اسی جگہ کھڑے ہو...... ورنہ میرے لئے تین بندوں کا بوجھ اٹھانا
تھا......؟ ایک سے ایک تعلیمی ادارے میں پڑھتے‘ یہ دونوں بچے...... اور پھر تم دیکھتیں
معاشرے میں کیا مقام ہوتا ان کا...... نہیں تو یاد ہوگا نا ہاتھ پاؤں جوڑ کر منع کیا کرتی تھیں
آنے سے۔ اس کی نام نہاد انا کی خاطر مجھے پیچھے ہٹنا ہی پڑا......“

اماں سر جھکائے سنتی رہیں‘ وہ کچھ بھی غلط نہ کہہ رہے تھے۔

”لیکن یہ معاملہ اس کا نہیں‘ لیلیٰ کا ہے...... جسے اچھی زندگی گزارنے کا پورا حق
بے وقوف کی فکر مت کرو...... میں سمجھا لوں گا۔“

لیکن سمجھانے کی نوبت تب آتی جب وہ ان کے ہاتھ آتا...... انہوں نے پیغام
طرف بلایا بھی تو جواب ملا۔

”مصروف ہوں‘ نہیں آسکتا......“



”میں نے ہاں کہہ دی ہے رفاقت حسین!“ جو مشکل یہ بات کہنے سے پہلے
تھی...... اس سے کہیں زیادہ مشکل بات کہنے کے بعد ان پر آن پڑی تھی......

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ایک دم چپ۔

وہ چند لمحے انتظار میں رہیں‘ پھر دل سے گھبرا کر دوبارہ بول اٹھیں۔

”وہ لوگ باقاعدہ رسم کیلئے تاریخ مانگ رہے ہیں۔“

”یہاں آئے گا وہ مل اونر...... رسم کرنے کیلئے؟“ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”بھائی صاحب سارا انتظام......“

اور بس...... ایک اسی بات کا خدشہ تھا اسے...... اور ایک ہی بات اس کی برداشت
تھی...... کرسی دھکیل کر جس طوفانی انداز سے وہ اٹھا تھا...... اماں ہول کر رہ گئیں۔

’رفاقت حسین!‘‘ وہ تڑپ کر پکار اٹھیں...... دروازے سے باہر نکلتے ہوئے وہ یک لخت ہی

”خسارے تو پہلے بھی کم نہ تھے میرے نصیبوں میں۔ آپ نے ایک تحفہ اور دے دیا۔“ اس کا
...یا ٹوٹے کانچ کی صدا‘ اماں بلک اٹھیں۔

”اس طرح سے مت کرو...... رفاقت حسین! دکھ سکھ کا بٹوارہ ضروری ہوتا ہے۔ رشتوں کی
ں کو بوجھ مت بناؤ...... یہ سانجھ‘ یہ شراکت جینے کیلئے سانس دیتی ہے۔ اسے پھانسی کا پھندا
بناؤ۔“ وہ رو رو کر غبار نکالتی رہیں۔

لیلیٰ دم بخود دروازے سے لگی کھڑی رہی۔

وہ جس سے یہ سب کہہ رہی تھیں...... وہ کب کا جا چکا تھا۔

اماں شام تک سسک سسک کر بے حال ہوتی رہیں...... گھر کی فضاؤں میں گھٹا سا سوگ اتر
تھا۔ لیلیٰ چولہے میں جلتی لکڑیوں کے ساتھ ساتھ سلگتی رہی...... اور خود وہ...... رات کی تاریکی میں
توں کے جھنڈ تلے بینچ پر بیٹھا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا...... اس کے وجود میں دھواں ہی دھواں
جسے نکلنے کا کوئی راستہ نہ مل رہا تھا۔

اس کی برسوں کی ریاضت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ جن سے ہاتھ چھڑا کر اپنے پیروں پہ کھڑا
ا تھا۔ ایک بار پھر اسے ”لیٹ ڈاؤن“ کر چکے تھے...... اسے اپنا آپ قبر میں پڑے اس مردے
سا لگ رہا تھا جس پر سب لوگ تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ مٹھی بھر مٹی ڈال کر آگے بڑھتے جا
رہے ہوں۔

یہ رات کانٹوں بھری رات تھی...... جس کا بیت جانا کوئی اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کی آمد کے
انتظار میں دروازہ رات بھر کھلا رہا...... اماں جاگتی آنکھوں سے دہلیز کو تکتی رہیں...... لیلیٰ کی نیند وقفے
وقفے سے ٹوٹتی رہی۔

دن چڑھا...... سورج نکل آیا...... دھوپ سارے صحن میں پھیل گئی۔

اماں چپ کی بکل مارے دروازے سے چپک کر رہ گئیں۔

پورا دن رینگ رینگ کر کائنات کی گود سے باہر جا گرا‘ تب چپکے سے شام آنگن میں اتر
آئی۔ عجیب زرد رو اداسی بھری شام تھی...... اماں دوپٹے کا پلو منہ پہ ڈالے کر چارپائی پہ گر گئیں۔

لیلیٰ بھوکے پیاسے کبوتروں کو دانہ ڈالنے لگی۔ تب ہی دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔
کبوتروں کی غٹرغوں میں مانوس سی چاپ ابھری تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر

پرسکون سی سانس لے کر ڈھیر سارا باجرہ ایک دم آنگن میں بکھیر دیا۔ اماں نے چونک کر دوپٹا
چہرے سے ہٹایا...... وہ بہت خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا...... اماں کے بے جان تن
نئی روح پڑی تو جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں......

"تم آٹا گوندلو لیلیٰ! میں ہانڈی چڑھاتی ہوں" بے پایاں مسرت سے ان کی آواز لرزا
تھی۔ لیلیٰ بھی جواباً مسکرادی تھی۔



اور پھر وہی سب ہوا جو ہونا تھا۔
منگنی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ نظر ثانی کی رعایت ماموں نے نہ دی۔
منگنی سے لے کر شادی تک کے تمام معاملات ان ہی کے زیر سایہ...... ان ہی کے بنگلے
طے پائے تھے...... تابش کے گھر والے لڑکی کی حیثیت سے واقف تھے، مگر شادی پر اپنے خاندا
کیلئے مناسب پروٹوکول چاہتے تھے۔

"لیلیٰ، حسنہ سے کم تو نہیں...... وہ اس گھر سے اپنے تمام حقوق لے کر ہی رخصت ہوگی۔"
انہوں نے وعدہ کیا تھا اور نباہ بھی رہے تھے بیش قیمت فرنیچر، کراکری، لباس...... لیلیٰ کو
نے ایک ہفتے سے اپنے پاس روک رکھا تھا...... اس کیلئے تو ہر روز، روز عید اور ہر رات، شب برا
تھی...... نئی گہما گہمی...... خوشگوار ہلچل...... دل پسند ہنگامہ۔

اماں صبح جاتیں اور شام میں لوٹ آتیں۔ ان کے دل میں کانٹا سا گڑا تھا جو کسی صورت نکا
نام نہیں لے رہا تھا...... رفاقت حسین کا ستا چہرہ، بجھی آنکھیں اور سرد مہری کے جامے میں
چپ...... جو انہیں ہر آن ہراساں کئے رکھتی تھی...... وہ غصہ جو لاوے کی طرح اندر ہی اندر پکتا ر
بہت خطرناک ہوتا ہے اور انہیں اسی چپ کے پیچھے کوئی بہت بڑا طوفان کروٹیں لیتا دکھائی د
تھا۔

"کیوں نہیں مان جاتے رفاقت حسین! تمہاری بہن کا گھر بسنے جا رہا ہے...... اس کی خوش
میں شریک ہوگئے تو مان بڑھ جائے گا اس کا...... لوگوں کو کیا جواب دوں گی......؟ اکلوتا بھائی ش
میں شامل کیوں نہیں ہے؟" وہ تھک ہار کر اس کے سامنے رو دیں۔ دھوئیں کے مرغولے فضا
چھوڑتا، سپاٹ نگاہوں سے انہیں دیکھتا وہ پہلے سے کہیں زیادہ بے حس لگ رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں، تمہارے دل کو جو صدمہ ہے۔"

"کوئی صدمہ نہیں ہے اماں! جو جیسے ہو رہا ہے، ہو لینے دیں...... کوئی آپ سے جواب ط

......اور کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کبھی کوئی فرق پڑا ہے؟ اپنی خوشیاں، اپنے غم......
ہوتے ہیں...... نہ انہیں کوئی بڑھا سکتا ہے نہ گھٹا سکتا ہے...... بہت روشنیاں ہوں گی
ؤں سے بنے مکان میں...... شہر کی اعلیٰ سوسائٹی کے خوش پوش، خوش باش اور خوش طالع
بیچ ایک رفاقت والا......" اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے گویا انہیں بھی اپنی
یونہی علیحدہ کر پھینکا تھا۔
پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے اجنبیت بھرے انداز کو دیکھتی رہیں۔
روز لیلیٰ کی مہندی تھی...... حسنہ صبح سویرے ہی اماں کو لینے آ پہنچی۔
کیھ اس کو ذرا...... روئی کا لقمہ تک نہیں توڑا اس نے۔ رات کے برتن بھی یونہی دھرے
سے کہو حسنہ! اتنا کٹھور مت بنے...... اپنی جان کو اذیت دے کر مجھے تڑپا رہا ہے یہ
ہوگئے، میری جان سولی پر اٹکی ہے۔ کیا گناہ سرزد ہوگیا ہے مجھ سے کہ جس کی کوئی معافی
ا کے چہرہ دیکھو اس کا۔ ایسا پتھر کہ پہچانا ہی نہیں جاتا...... وہ مرہی نہ جائے حسنہ!"
خدا نہ کرے پھپھو! کیسی باتیں کرتی ہیں۔ سنبھالیں اپنے آپ کو...... میں دیکھتی ہوں
وہ عجلت میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔
آنکھوں پہ بازو رکھے...... وہ چت لیٹا تھا...... حسنہ نے ایک دوبار پکارا۔ مگر وہ گہری نیند میں
سنہ الٹے پاؤں واپس آگئی۔
پ تو خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں...... اچھا بھلا تو ہے وہ۔" دل ہی دل میں دوبارہ یہاں
مد کرتے ہوئے اس نے انہیں تسلی دی اور پھر جلدی جلدی کا شور مچاتی انہیں لے کر باہر
یکن ان کا دل پکے ہوئے پھوڑے کی مانند درد کی شدید لہریں پورے جسم میں پھیلا رہا
حال چہرہ، سوجی ہوئی آنکھیں، لبوں پہ دم توڑتی سسکیاں...... بھائی نے اپنی بہن کی یہ
ھی تو سکون آور گولی کھلا کر کمرے میں لٹا دیا...... شام کو بہت سے کاموں میں سے بمشکل
کردہ بھانجے کی خبرگیری کرنے گھر آ پہنچے۔
وہ نہ بھی آیا تو ہاتھ پاؤں باندھ کر، گاڑی میں ڈال کر لے آؤں گا۔" وہ خوشگوار موڈ میں
ے کہہ کر آئے تھے۔
بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔
"رافی، رافی......" انہوں نے آنگن میں کھڑے ہو کر پکارا...... مگر جواب ندارد۔ خالی گھر
بھائیں کر رہا تھا...... لائیٹر جلا کر انہوں نے سوئچ بورڈ ڈھونڈا۔ ایک کمرے کی بتی جلائی۔ پھر

دوسرے کی...... کسی ذی روح کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ ان کا دل تاسف سے بھر
اضافی بتیاں بند کیں اور آنگن میں روشنی جلا کر وہاں آ بیٹھے۔
لمحہ لمحہ قیمتی تھا۔ مگر وہ انتظار کرتے رہے...... کبوتروں کے کابک کھلے تھے...... ان کی
غٹرغوں اس آسیب زدہ ماحول کو کچھ اور بوجھل بنا رہی تھی...... تنہا بیٹھے بیٹھے انہیں خلجان
لگا۔ کلائی پہ بندھی گھڑی پر وقت دیکھا...... انہیں یہاں آئے ہوئے پونا گھنٹہ ہو چکا تھا۔
کی تاب ان میں نہ تھی' اس لئے مایوس ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے...... گھر سے باہر نکلتے
بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھانا نہیں بھولے تھے۔



سرخ شعلوں کا بے درد الاؤ تھا۔ جو اسے بری طرح جھلسائے دے رہا تھا۔ چہار جا
ہی آگ تھی۔ تن...... من کو جلاتی' آتی جاتی سانسوں کو دہکاتی۔ دماغ میں جیسے شرارے
رہے تھے۔ بے بسی سے کروٹیں بدلنے کے بعد وہ دونوں ہاتھوں پہ زور دیتا بمشکل اٹھ
دہکتی انگارہ آنکھیں کھول کر اس نے اپنے اطراف میں دیکھا۔ کمرے کی کوئی چیز اپنی جگہ
دے رہی تھی...... گول گول گھومتی ہوئی دیواریں' آگے پیچھے کھسکتی ہوئی میز۔

اس نے اپنا سر جھٹکا اور ایک ہی جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی زور کا چکر آیا تھا۔
گرنے کو تھا کہ کرسی ہاتھ میں آ گئی۔

چھ پل یونہی کھڑے رہ کر اس نے اپنے حواس بحال کئے اور پھر لمبے لمبے ڈگ
خانے میں چلا آیا۔ نل کھول کر ہاتھوں کے پیالے بھر بھر کر چہرے پہ پانی ڈالنے سے کچھ
ہوا تو وہ واپس کمرے میں آ گیا...... نڈھال سے انداز میں چارپائی پہ گرتے ہوئے ا
جیسے پیٹ میں کوئی دوزخ بھڑک اٹھا ہو۔ انتڑیاں بھوک سہہ سہہ کر گویا سکڑ گئی تھیں۔ جز
ہر تکلیف اور اذیت کو سہتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں۔ کمرے کی چھت
نیچے آ گئی تھی۔

"آہ......" خود کو بچانے کی کوشش میں اس نے دونوں بازو بے اختیار ہی چہرے پہ
کتنے پل بیت گئے۔ تب ہی کوئی آواز' کوئی آہٹ ابھری تھی...... اس نے دھیرے دھیرے
لئے...... آس پاس کوئی نہ تھا اور کمرے میں گھٹن تھی...... شدید گھٹن...... وہ لمبے لمبے سانس
وجود میں بھرے حبس سے جان چھڑانے لگا...... بے دم ہونٹوں پہ پیاس تڑپ رہی تھی
دروازے کی چوکھٹ پر کوئی ہیولا سا نمودار ہوا تھا...... کسی موہوم سی آواز نے خاموشی

یں سی ڈالی تھیں۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھنے اور سننے کی کوشش کی......
کمرے میں اندھیرا تھا یا پھر اسے خود ہی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ لیکن آس پاس کوئی ہلچل ضرور
شعور و لاشعور کی جنگ میں ڈوبتے ابھرتے اسے اپنی جھلستی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈک سی محسوس ہوئی
رگ جاں کو سکون بخشنے والی ٹھنڈک۔ پانی کی باریک دھاریں کنپٹی پر رینگ رہی تھیں......
بلتی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگی تھیں...... طمانیت بھری نیند اسے تھپک رہی تھی۔
پھر کوئی پکارا تھا...... نزدیک ہی۔ بہت قریب۔ اس نے دھندلائی آنکھیں کھول کر خود پہ جھکے
ود کو پہچاننے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے جو چیز اسے محسوس ہوئی تھی وہ مہندی کی خوشبو تھی۔ اس
ے چہرے کو نرمی سے تھپتھپاتا مہندی کی خوشبو میں بسا ہاتھ اور اس ہاتھ کا نازک سا لمس۔

اس نے بے اختیار ہی اس رنگی ہوئی ہتھیلی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"کون' لیلیٰ؟" سوکھے لبوں سے بمشکل لفظ ادا ہوئے تھے۔

جواباً مدھر سی ہنسی کی آواز ابھری تھی۔

وہ ایک پل میں پہچان گیا۔

حسینہ محمود اپنا صندلیں وجود لئے اس پر جھکی کچھ کہہ رہی تھی...... لیکن اسے کچھ بھی سنائی نہیں
دے رہا تھا۔ بجز چوڑیوں کی کھنک کے...... اپنے چہرے سے ٹکراتی خوشبودار سانسوں کی مہک کے سوا
اسے کچھ محسوس نہ ہو رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر خود سے کچھ کہتے ان احمریں لبوں کو دیکھا۔

"تم بے بس ہو چکے ہو رفاقت حسین چودھری۔" اسے لگا' حسینہ محمود جتا رہی ہے۔

اس کی بے بسی پر مسکرا رہی ہے...... اس کی بے قبر لاش پر مٹھی بھر مٹی۔

"نہیں......" کسی نے کھولتا ہوا پانی اس کے مردہ تن پہ انڈیلا تھا۔ سینے میں کروٹیں لیتا آتش
فشاں پھٹ پڑا تھا۔

گداز رنگ دار ہتھیلی پہ اپنی مضبوط انگلیاں گاڑتے ہوئے اس کے اندر ایک ایسی وحشت
جاگی تھی جو انسان کو حیوان بنانے میں ایک پل نہیں لگاتی۔



اماں مکلاوے کی رسم کے بعد ہی گھر آ گئی تھیں۔ پہلے رفاقت حسین ان سے خفا تھا۔ اب
اس سے ناراض تھیں...... ان کا خیال تھا' ہزار مخالفت کے باوجود وہ آئے گا صرف اور صرف ماں
لاج رکھنے...... لیکن اس نے بڑا دل دکھایا تھا۔

اور لیلیٰ...... اس کا صبر وضبط یاد آیا تو دل پھر سے آزردہ ہو گیا۔

"بچی کی آنکھیں دروازے پہ لگی رہیں...... باپ تو قبر میں پڑا تھا۔ بھائی کا دست شفقت نصیب نہ ہوا...... خیر اللہ اس کا بھلا کرے...... اتنی خوشیاں پائے کہ سمیٹی نہ جائیں۔ بڑ فرمانبردار...... میری سہیلی...... تنہا کر گئی مجھے تو......"

بدن کے ریشے ریشے میں تھکن سی اتری تھی...... ملنے جلنے کا یارانہ تھا...... پر کام دھندے جیتے جی جان کون چھڑائے؟ اور پھر اب تو لیلیٰ بھی نہ تھی...... رات کیلئے دال، روٹی کی فکر ان کے اور کون کرتا؟

چاروناچار اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کبوتر بھوکے تھے...... آب خورے خشک...... آنگن میں گرد ہی گرد پھیلی ہوئی تھی۔ پرندو دانہ پانی ڈال کر وہ بکھری چیزیں سمیٹنے لگیں...... برآمدے میں رکھی کرسی پہ دھرا شولڈر بیگ انہیں طرح چونکا گیا۔

"حسنہ کا بیگ......؟" انہوں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"مہندی کے روز مجھے لینے آئی تھی...... تب شاید یہیں چھوڑ گئی ہو۔" انہوں نے بہت سن کر بیگ الماری میں رکھ دیا۔

"ایسی لاپروا تو نہیں وہ...... خیر کسی روز جاؤں گی اس کی خیر خیریت، پوچھنے تو لے جاؤں شادی کی مصروفیت نے اس بے چاری کو بھی ہلکان کر ڈالا...... اتنا سا منہ نکل آیا تھا۔"

وہ خود کلامی کرتی باہر نکلیں جب وہ دروازے سے اندر آیا۔

سرسری سی نگاہ اس پر پڑی تو جیسے پلٹنا ہی بھول گئی۔

اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں...... سیاہ حلقے، پیلی رنگت...... لاغر بدن۔

اس نے ماں کو دیکھا اور پھر نظر چرا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

"رفاقت حسین!" انہوں نے بازو سے تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ لڑکھڑا سا گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ خوف کے عالم میں اسے بری طرح جھنجوڑنے لگیں۔

"چند روز میں کیا ہو گیا تمہیں...... تم بول کیوں نہیں رہے؟"

"کچھ نہیں ہوا......" اس نے کترا کر نکلنا چاہا۔

"کچھ نہیں ہوا......؟ تم نے اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں۔" وہ راستے میں دیوار بنی کھ تھیں۔

ے رہنا دشوار تھا...... وہ قریب پڑی کرسی پہ گر سا گیا۔

یوں کر رہے تم ایسا...... ماں سے بدلہ لینا چاہتے ہو تو کوئی اور طریقہ آزماؤ...... اپنی یہ ر کند چھری سے ذبح کرتے ہو مجھے...... اتنے ظالم مت بنو...... رفاقت حسین! یہ تکلیف ے باہر ہے۔" ان کی آنکھوں سے آنسو قطار در قطار بہہ نکلے تھے، وہ لب بھینچے بیٹھا رہا۔

ے خبر...... تکلیف کس کے بس سے باہر ہے...... کون بدلہ لے رہا ہے؟ سزا کسے مل رہی شب و روز ساری بساط ہی الٹ گئے ہیں۔

بغیر کچھ کہے اماں کی گریہ وزاری سنتا رہا...... پھر وہ خود ہی انہیں اور محلے کے کمپوڈر کو بلا اس نے بخار چیک کیا...... دوائیاں لکھیں اور انجکشن دے کر چلا گیا۔ اماں آنسو پونچھ کر رہیں۔

گرم دودھ کے ساتھ چند بسکٹ کھلائے۔ دلیہ، کھچڑی بنا کر سرہانے رکھا...... اور نہ جانے کون آیتیں پڑھ کر پھونکتی رہیں اور رفاقت حسین حد درجہ تکلیف دہ شب و روز کے بعد اس رات سکون سے سویا تھا۔



اس کے سامنے بہت سے کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ ہر کاغذ پر کوئی آدھی پونی تحریر رقم تھی بے ربط...... گونگے بہرے کردار...... کسی پر آڑی ترچھی لکیریں اور کسی پر بے تحاشا دائروں سے بھنور...... اسے لگ رہا تھا۔ وہ ایک ایسی کہانی ہے جس پر سیاہی کی پوری دوات آ گری ہو۔ اس ں اوپر تلے ہو گئی ہوں۔ لفظ آپس میں گڈمڈ اور لاچار پڑے حروف اپنی شناخت کھو چکے

ں کا دل چاہا...... وہ پوری قوت سے اپنا پین میز کی کھردری سطح پر مارے اور اس کی نب توڑ

تھک ہار کر اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ تب ہی کوئی چپکے سے دروازے میں ہوا۔

"بھائی جان!" مدھم آواز بھی پرجوش تھی۔

اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں...... اور غائب دماغی سے اسے دیکھنے لگا۔

چند روز جدائی کے بعد "اپنوں" سے ملنے کی تڑپ اس کے چہرے پر خوشی بن کر اتر رہی ...... محبت بھری بے چینی...... اپنائیت آمیز بے قراری...... لیلیٰ کے چہرے سے ایک ایک تاثر

عیاں تھا۔لیکن اسے اپنے دل میں کوئی ہلچل محسوس نہ ہوئی۔
ایک پل' دو گھڑیاں' کچھ لمحے' لیلیٰ کا سارا جوش ملال میں بدلتے اس نے خود دیکھا تھا۔
دروازے کی چوکھٹ پر دائیں' بائیں رکھے ہاتھ بے جان ہوکر اس کے پہلو میں لٹک گئے تھے......
کپکپاتے ہونٹوں کو اضطراری انداز میں کاٹتے ہوئے وہ پلٹی۔تب اس بت بے تعلق میں جنبش
ہوئی۔

''اماں باورچی خانے میں ہیں۔''
اور لیلیٰ اس کی بات سن کر ایسی حیرانی سے اس کی طرف پلٹی تھی جیسے یقین ہی نہ آرہا ہو کہ کوئی
ماں جایا ایسا بے حس بھی ہوسکتا ہے......اور اس بے یقینی کے جواب میں اس کیلئے جو سرد مہری جو کھو
پن اس کے چہرے پہ ظاہر ہوا تھا اسے دیکھ کر لیلیٰ کے سارے حوصلے دم توڑ گئے تھے۔
دروازے کی بھری چوکھٹ ایک دم ہی خالی ہوگئی۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کاغذوں
لکیریں کھینچتے ہوئے ٹھنڈی ٹھار چائے کے گھونٹ بھرتا رہا......ذرا دیر بعد ہی صحن سے شڑاپ شڑاپ
کی آوازیں ابھرنے لگیں......لیلیٰ اپنا پرانا سوٹ پہنے اس طرح گھر میں گھوم رہی تھی جیسے یہاں سے
کہیں گئی ہی نہ ہو......اس کے کبوتر خوشی کے ارے پورے آنگن میں بکھرے ہوئے تھے......
پانی میں خود کو بھگوتے...... چک پھیریاں کھاتے' ان کی غٹرغوں میں کانوں پڑی آواز سنائی نہ د
رہی تھی۔وہ اٹھ کر دروازے میں آ کھڑا ہوا۔
لیلیٰ صحن دھونے کے ساتھ ساتھ اماں کے ساتھ اونچی آواز میں باتیں کررہی تھی۔اس کی
رنگت میں سرخی سی گھلی ہوئی تھی اور ہونٹ قندھاری انار کی طرح سرخ' آنکھوں میں گویا ستار
چمک رہے تھے اور ہر دوسرے لمحے ہونٹوں پر درآنے والی مسکراہٹ اس کے چہرے کو کسی جگنو
طرح روشن سا کردیتی تھی۔
وہ اپنی گاڑی پر اپنے ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔
''آج سارا دن یہاں رہوں گی۔خوب سوؤں گی۔'' وہ پہلے سے کہیں زیادہ بول رہی تھی۔
''کل حسنہ آپا کی طرف بھی گئی تھی...... ماموں بتا رہے تھے......طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔
پہروں اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی ہیں...... مجھے بھی پہلے سے کچھ کمزور لگ رہی تھیں۔بات بھی ٹھیک
طرح سے نہیں کی' اس لئے جلد ہی واپس آ گئی......''
سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اسے بڑے زور کی کھانسی آئی تھی......آنکھوں میں پانی بھر گیا۔
چند گھونٹ پانی پینے کے بعد وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا' لیکن کمرے میں آکسیجن کم تھی۔ا

ہوئی......تو سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس جیب میں ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔
روز چکر لگاؤ گی تو میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔'' اس نے آخری پل اماں کو کہتے

کے جانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی...... ماموں کا بلاوا اس سے پہلے آ گیا تھا۔
وز رفاقت حسین چودھری سے شادی کرے گی......
ن' قلاش قلم کار سے جو دیوانوں کی طرح شہر کی سڑکوں پہ صبح سے شام کرتا ہے......
دانا اور بے شعور ضد کا ایک زمانہ گواہ ہے۔
شتے نبھانے کے ہنر سے آگاہ ہی نہیں۔''
نے سمجھا بجھا کر دیکھ لیا...... پیار' محبت' دلیل' دھمکی کون سا وار تھا جو آزمایا نہ گیا۔لیکن
ی جو نہ جھکنے میں آرہی تھی' نہ ٹوٹنے میں۔
ر میں کیا تھا...... جو اس سے چھپا ہوا تھا۔
' تنگ دستی' غربت' افلاس اور پھر رفاقت حسین چودھری کی بے رحمی' بے حسی' سنگ دلی'
ب کچھ تو اس کے سامنے تھا' پھر کیا چیز تھی جو اسے دھوکہ دے رہی تھی۔
ت......؟'' جو اسے ہر روز کھینچ کر اس بے رنگ و روغن خستہ حال دروازے کی اور لے
...لیکن اس کی محبت کی تپش برف کے اس مجسمے کو کہاں پگھلا پائی تھی۔
لفظوں سے پر کاغذوں کے جلنے کی سیاہی۔
خ گلابوں کی سیاہ پڑتی پتیاں۔
ان دو سیاہ آنکھوں میں بسی لاتعلقی۔
ں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔
ی کا یہ سیاہ رنگ تیرے سارے بخت چرا لے گا حسنہ! جانتے بوجھتے کانٹوں سے الجھنا
...کانچ بچھا رہی ہے اپنے راستے میں' میں ماں ہوں۔مجھ سے بڑھ کر اور کون جانے گا
ل جائے گی میری دھی...... آنکھوں پہ بندھی پٹی کھول دے۔'' انہوں نے اپنی سی پوری
کر وہاں کوئی اثر نہ تھا۔
رے میں تاریکی تھی...... اور تاریکی میں آنسوؤں کے جگنو۔ جو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے
الجھتے رہے۔
ل ایک وہی...... اور کوئی نہیں۔''

وہ دو دن بعد کمرے سے باہر نکلی تھی...... بکھرے بال...... وحشت زدہ آنکھیں...... ہ
آور گولیوں سے بھری تھی۔

"ایک بار جانے کی ٹھان لی تو...... آپ میں سے کوئی بھی روک نہ پائے گا......
جایئے...... میری چاہ ہے...... دل کی خواہش ہے۔ آخری سمجھ کر پوری کر دیجئے۔" وہ التجا کر ر
باپ کا سر جھکا ہوا تھا...... بھائیوں نے تنفر سے نگاہ پھیر لی۔

"ہم سب کو چھوڑنا ہوگا۔" ترپ کا پتہ چلایا گیا تھا۔

ایک پل کیلئے تو کائنات بھی تھم گئی۔

چاروں اور خاموشی تھی...... وہ نیم جان ٹکر ٹکر ایک ایک کا چہرہ دیکھتی رہی...... مٹھی
گولیاں ایک ایک کر کے گرتی چلی گئیں...... یہ زہر پھانکتی تو کئی راز طشت از بام ہو جاتے۔
بھید' بھید ہی رکھنا تھا۔

"مجھے منظور ہے......" یہ تین لفظ کئی لوگوں کے اعتماد' مان' محبتوں کے پرخچے اڑا کر
تھے۔

"جمعے کے روز رفاقت حسین کو لے آنا...... اب تم جاؤ۔"

اماں کا دل ریتلی مٹی کی طرح بکھرتا جا رہا تھا...... من من بھر کے قدم اٹھاتی...... نگاہ
باہر نکل آئیں۔

"پھوپھو!" وہ ان کے پیچھے چلی آئی تھی۔ "وہ نہیں مانے گا۔ لیکن اس سے کہنا مان
لرزتے ہونٹ حد درجہ سرخ آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر دوا ہے' فکریں اندیشے۔ کچھ تھا جو پ
پیچھے تھا۔ وہ جو نظر نہیں آرہا تھا' وہ الجھ کر رہ گئیں۔

"وہ نہیں مانے گا...... لیکن اس سے کہنا کہ یہ زندگی کا معاملہ ہے۔" دونوں باز
باندھے وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے پوری طرح بھیگ گیا۔

"اور اگر تب بھی نہ مانے تو کہنا...... کہنا کہ۔" اس نے ہونٹ کاٹ کاٹ کر زخمی
تھے۔

انہیں اپنے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اسے بتانا کہ...... یہ ایک نہیں دو زندگیوں کا معاملہ ہے۔" وہ کہنا چاہتی تھی مگر ہچکچا
گئیں...... نہیں کہہ پائی۔

اماں اسے یونہی روتا چھوڑ کر دہلیز پار کر آئیں۔

"د' تین صرف تین روز میں کیونکر منا پاؤں گی اس ضدی انسان کو جو اپنے ہر فیصلے کا
پنے ہی ہاتھ میں رکھتا ہے...... جسے کسی کا خیال ہے نہ پروا...... کیسی مشکل گھڑی ہے
چ دریا میں کھڑی ہوں اور کنارہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔" رات بہت بیت چکی تھی......
ن کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور وہ ابھی ابھی مگ میں پانی بھر کے یہاں سے گزرا

چینی سے کروٹیں بدل بدل کر وہ بالآخر اٹھ کر اس کے کمرے میں آگئیں...... بے خوابی
بوڑھی آنکھوں میں جیسے ریت سی بھر دی تھی۔ وہ چارپائی پہ پڑے بے شکن بستر پر جا
س کی پشت اماں کی جانب تھی اور وہ اس کے بے تاثر چہرے کا صرف دایاں حصہ ہی دیکھ
...... چائے کا بھاپ اڑاتا مگ اس کے سامنے تھا۔ سلگتا ہوا سگریٹ ہونٹوں میں دبا تھا
ں پکڑا قلم پوری طرح رواں۔

رفاقت حسین!" ان کی پکار پر اس نے یونہی ایک ثانیہ کیلئے پلکیں اٹھائیں اور پھر سے قلم کی
جما دیں...... اس نے رخ نہیں بدلا تھا۔ لیکن تیزی سے لکھتا ہوا قلم رک چکا تھا۔ گویا وہ ان
ننے پر آمادہ بھی تھا اور متوجہ بھی۔

ہولے سے کھنکھاریں۔ بات کا کوئی سرا نہ مل رہا تھا۔ کیا کہیں اور کیسے؟ انہوں نے ہاتھ
ل الگ اپنی لے بدلنے لگا تھا۔ ان کی خاموشی سے اکتا کر سگریٹ انگلیوں میں لے کر طویل
یتے ہوئے اس نے گردن گھما کر اماں کی طرف دیکھا۔

ا کی گہری شش و پنج میں تھیں...... بری طرح الجھی ہوئی۔

"جمعہ کو تمہارا اور حسنہ کا نکاح ہے رفاقت حسین......!"

...... یا پار۔ انہوں نے ہر مصلحت بالائے طاق رکھ کر کہا تھا...... لیکن دل کی دنیا اس ایک
ہی اتھل پتھل ہو گئی تھی...... کسی متوقع صورتحال سے نمٹنے کیلئے وہ پلکیں جھپکے بغیر ایک ٹک
ئیں۔ اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پہ ٹکی تھیں...... ایک منٹ کی خاموشی کا وقفہ ان
یچ آیا تھا۔

یک ہے......" اس نے جلتی ہوئی سگریٹ میز کی کھردری سطح پر کچل دی اور وہ اپنی جگہ بیٹھے
ئیں۔

کیا کہا ہے اس نے......؟" وہ ششدر تھیں...... بے یقین تھیں...... کیا ابھی بھی اس دنیا
ہوتے ہیں...... پتھر کیسے پگھلا تھا......؟ انہیں کچھ خبر نہ رہی تھی۔ وہ بس اسے دیکھے

گئیں...... جو فیصلہ سنا کر گرم بھاپ اڑاتی چائے کا مگ ایک ہی سانس میں خالی کر گیا تھا اور
آنکھیں اپنے ہونٹوں پر اتری جلن کے احساس سے نم سی ہو گئی تھیں۔ وہ اسے دیکھتی رہ
دیکھتی رہیں...... یہاں تک کہ پھر یکلخت ہی چونک گئیں۔

ان کے کمرے کی بند الماری میں پڑا ہوا شولڈر بیگ ٹھک سے ان کے دھیان کی گود میں
تھا۔



ان دونوں نے برابر بیٹھ کر نکاح نامے پر دستخط کیے تھے۔ حسنہ کے دونوں بھائی نکا
شریک نہ ہوئے تھے...... ماموں کا چہرہ ستا ہوا' آنکھ نمی تھی۔ نکاح کے فوراً بعد وہ اٹھ کھڑے
رستم گاڑی لئے تیار کھڑا تھا۔

''بھائی تم سے تعلق توڑ چکے حسنہ! لیکن تمہارا باپ اپنی شفقت سے تمہیں کبھی محروم نہیں
گا۔ تمہارا جب دل چاہے مجھ تک چلی آنا' جب تک زندہ ہوں تب تک۔'' ان کی مسکراہٹ
پھیکا پڑ چکا تھا۔

بے رنگ ہاتھوں' سونی کلائیوں اور ویران آنکھوں سمیت حسنہ محمود تین کپڑوں میں با
گھر سے رخصت ہو گئی تھی۔

''میں آ جاؤں گا۔'' اماں اور حسنہ کو گاڑی میں بٹھانے کے بعد اس نے ڈرائیور کو چلنے
کیا اور خود کسی سے ہاتھ اور نگاہ ملائے بغیر مخالف سمت میں چل دیا۔ اس سے پہلے یہ مساف
کبھی اتنی گراں نہ لگی تھی...... چند قدم کے فاصلے سے ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور پیر اس کا بوجھ
سے قاصر۔ کچھ دور جا کر وہ ایک کوٹھی کے باہر لگے جنگلے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر
تھا۔

زندگی میں اس سے بدتر لمحہ اور کوئی نہیں ہوتا جب آپ اپنی ہی غلطی سے اپنے حریف
بنا دیں۔ اس ہار میں خود شکستگی' پچھتاوے اور ندامت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اور وہ رفاقت حسین چودھری آج ایسی ہی شکست سے دوچار تھا۔

''کچھ بھی نہیں پایا رفاقت حسین! اور سب کچھ کھو دیا...... کیا وقعت ہے تمہاری اور کس
سے جیو گے۔'' وہ خود پہ ہنستا' گرد اڑاتا ایک بار پھر چل دیا اور جس پل اس نے اپنے تھکے
پیر گھر کی دہلیز پہ رکھے...... رات بھیگ چلی تھی اور اماں خنک سی فضا میں کھری چارپائی پہ بیٹھی
منتظر تھیں۔ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

انا لاؤں؟''

یں۔'' اس نے غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔

ب وقت بے وقت گھر آنا چھوڑ دو رفاقت حسین! نئے اصول' طریقے اپناؤ' وہ اس گھر میں
تو اس کے سارے حقوق پورے کرنے ہوں گے۔'' وہ اس کے باہر نکلنے کی منتظر تھیں......
کہے تولیے سے منہ صاف کر کے مہمان خانے میں آ گیا۔ جسے اماں نے اس کے اور حسنہ
ے سرے سے ترتیب دیا تھا۔

نیند کی گولی کے زیر اثر گہری نیند سو رہی تھی...... پہلے سے کہیں کمزور...... زرد رو......

و ہو گیا تو اسے مان لے
کہ یہ داغ وہ ہیں جو سات بحروں
کے پانیوں سے نہ دھل سکیں گے
ہوا کے رستے میں اڑنے والے اداس پتے
نہ رک سکے ہیں نہ رک سکیں گے
جو ہو گیا تو اسے مان لے

وہ کرسی پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ آنکھیں چھت کی بوسیدہ کڑیوں پہ جمی تھیں' اس نے یہ ساری
سگریٹ پھونکتے اور جاگتے ہوئے گزاری تھی۔



''تم تو ناشتے میں جوس پیتی تھیں نا اب میں تمہیں کیا دوں حسنہ؟'' اماں کا لہجہ اس قدر
وانہ تھا کہ وہ بے اختیار ہی مسکرا دی۔

کتنے ہی روز بیت گئے۔ وہ نیند کی گولی لے کر سوتی تو پھر دن کے کئی پہر سو کر گزار دینے کے
ہی اٹھتی تھی...... ایسے میں دوپہر کے کھانے کا وقت قریب ہوتا...... جو دال روٹی ہوتی' وہ کھا لی
اور آج وہ صبح صبح ناشتے کے وقت ہی اماں کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''کچھ نہیں چاہئے اماں! ناشتے میں جو بن رہا ہے وہی کھا لوں گی......''

''بغیر دودھ' دہی کے...... سادہ روٹی...... کہاں کھائی جائے گی تم سے۔'' وہ فکر مند ہوئیں۔

''خیر...... یہ الماری میں بسکٹ رکھے ہیں...... وہ نکالو۔ میں چائے کا بندوبست کرتی ہوں۔''
ٹنوں پر زور دے کر اٹھیں۔

''رفاقت حسین!'' انہوں نے کمرے میں جا کر اسے پکارا۔

درواز میں سے کاغذ نکالتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
"چائے بناؤ تو ایک کپ حسنہ کیلئے بھی بنالینا۔"
اس نے ہاتھ روک کر ان کی بات سنی اور الماری میں سے چائے کا سامان نکال کر ان
ہاتھ پہ رکھ دیا۔
"ارے مجھے کیا خبر' یہ الم غلم چیزیں چائے کیسے بنائیں گی......" وہ ایک دم پریشان ہوئیں
"جس نے پینی ہے' اسے ہوگی خبر۔ آپ لے جائیں۔" وہ روکھے لہجے میں کہتا شیو کا
اٹھا کر صحن میں لگے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
جس وقت اماں نے ناشتہ دے کر حسنہ کو اس کے کمرے میں بھیجا' وہ نہا دھو کر کپڑے بدل
تھا۔ چھوٹی سی ٹرے اس کے سامنے میز پہ رکھتے ہوئے حسنہ نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے د
سگریٹ حسب عادت لبوں میں دبا ہوا تھا...... شیو کی تازہ نیلاہٹوں میں چہرے کا سیاہ تل اس
بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔
وہ ٹرے رکھ کر واپس مڑ گئی تب بھی اس نے ذرہ بھر توجہ اس کی طرف نہیں کی تھی...... دو
چل کر دوبارہ پلٹ آئی...... بہت آہستگی سے اس کے لبوں سے سگریٹ چھڑا کر وہ قدرے تلخ
میں بولی۔
"تمہاری زندگی اب صرف تمہاری نہیں رہی آر ایچ چودھری! اس پر کچھ حق اب میرا
ہے۔" کیسا تفاخر بھرا تھا اس کے لہجے میں۔
اس کے خون میں ابال اٹھا تھا۔ مگر حسب سابق وہ نہ چلا سکا...... نہ بھڑک سکا۔
"یہ صرف میری کمزوری تھی حسنہ محمود! کہ تم یہاں حق جتانے آ گئیں...... اور جس طرح
آئی ہو اس پر فخر کرنے کی جرأت تمہیں کبھی نہیں کرنا چاہیے۔"
یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آگ بھڑک رہی ہو...... اور حسنہ محمود کو اس کے جسے کے انگارے نہ



لیلیٰ' اماں سے ملنے آئی تو حسنہ اور اماں کو ساتھ ہی لے گئی...... وہ گویا کسی بوجھ سے آزاد
گھر کی تنہائی میں گھومتا رہا...... رات گئے تک ریڈیو سے دل بہلایا...... اگلی صبح وہ دونوں وا
آ گئیں...... دونوں ہی قدرے چپ چپ کھوئی کھوئی سی تھیں۔
لیلیٰ اپنے گھر میں خوش باش' راج کر رہی تھی۔
اماں نے اسے سونے چاندی میں کھیلتے دیکھا تو حسنہ کا خیال کر کے آزردہ ہو گئیں......

ں ان کی بیٹی روپیہ' پیسہ پانی کی طرح بہا رہی تھی' خود اس کی ناز دن پلی رانی بیٹی محل سے
ی تھی۔
و لیلیٰ اور اس کے شوہر کی باہمی محبت' رفاقت اور وارفتگی نے اداس کر دیا تھا۔ ہنستے' کھیلتے'
...... بہت عام لیکن خوبصورت' رنگوں بھری زندگی گزار رہے تھے وہ دونوں۔
و شب و روز ہم گزار رہے ہیں وہ......؟
ی سوالیہ نظریں بار ہا اس کی طرف اٹھیں جسے کاغذ' قلم' چائے' سگریٹ کے سوا زندگی میں
نہیں تھی۔
ا لکڑیوں کی طرح سلگتے ہوئے دن رات...... جن کا کسیلا دھواں آنکھوں کے سب خواب
ہا تھا۔
تے ہوئے تکلیف دہ زخم کی طرح اذیت ناک زندگی۔
ہ قطرہ پگھلتی ہوئی شمع جیسی...... قابل رحم۔ وہ بے چین روح کی طرح سارے گھر میں
رہتی۔ اماں نے ایک آدھ بار اسے پکارا بھی تو وہ سنی ان سنی کر کے آنگن میں آ گئی۔
م پڑ گئی تھی۔ جامن کا درخت ساکت تھا۔ پتے بے حس اور اپنے پروں کو کھجلاتے بیزار
-
ں کے اداس دل میں عجیب بے قراری سی بھر گئی...... دکھن بھری بے چینی جیسے کوئی دل پہ
نڈ کو ناخنوں سے ادھیڑ رہا ہو۔
طرف خاموشی ہی خاموشی...... رگوں کو کاٹتی ہوئی تنہائی۔
ں نے ہاتھ میں پکڑا گلاس پوری قوت سے سامنے دیوار پہ دے مارا اور پھر دھاڑ سے بند
کا دروازہ کھول کر اس کے سر پہ جا کھڑی ہوئی۔
"کیا مسئلہ ہے تمہارا رفاقت حسین۔" وہ چارپائی پہ اوندھا لیٹا گہری نیند میں تھا' جب دونوں
بھینچے وہ اس کے سر پہ جا کر چیخی تھی...... وہ ہڑبڑا کر جاگا اور ایک پل میں اٹھ بیٹھا...... کچھ
لیے تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔
"کیسے انسان ہو تم......؟ کس مٹی سے بنے ہو......؟ تم پہ کسی چیز کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟"
"کیا بدتمیزی ہے یہ......؟" اس کی غیر معمولی بلند آواز پہ ناگواری سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"بدتمیزی نہیں ہے یہ...... مجھے بتاؤ۔ مجھ سے کیا رشتہ ہے تمہارا......؟ کیوں آئی ہوں میں اس
ں؟ کس واسطے......؟ تمہارے لئے؟ تم جو آنکھ اٹھانے' بات کرنے کے روادار بھی نہیں ہو۔"

وہ پہلے سے بڑھ کر چلائی تھی...... اماں ہول کر بھاگتی ہوئی دروازے تک آئیں اور پھر تھم کر رہ گئیں۔

"اگر نہیں منظور تھا تو کیوں لائے مجھے یہاں' انکار کر دیا ہوتا رفاقت حسین! میں کچھ کھا کر مر لیتی......"

"بکواس مت کرو حسنہ!" وہ ڈپٹ کر بولا تھا۔

"بکواس نہیں ہے یہ...... بکواس وہ زندگی ہے جو میں اس گھر میں گزار رہی ہوں...... قابل قابل ترس' بھیک میں ملی ہوئی زندگی کوڑے کے ڈھیر پہ پڑی گلی سڑی چیزوں جیسی۔" وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

"مت بھولو کہ یہ بھیک تم نے خود اپنے لئے مانگی تھی......" اس کے سفاک لہجے پر حسنہ نے چاہا' وہ ایک قیامت برپا کر دے۔

"اپنے لئے......؟ اپنے لئے نہیں رفاقت حسین! اس داغ ندامت کیلئے جس میں تم بھی کے شریک تھے...... اس گناہ۔"

"حسنہ!" وہ اس زور سے دھاڑا تھا کہ حسنہ کی آواز کہیں دب کر رہ گئی تھی۔

"مت چلاؤ اس طرح۔" وہ جواباً اس سے بڑھ کر چلائی تھی۔

"میری خاموشی کو میرا ہی جرم مت بناؤ...... قصوروار تم خود ہو اور سزا بھی مجھے ہی دے ہو۔ میری مسیحائی کو میرا ہی قاتل بنا دیا تم نے کیا ہوتا جو میں اس روز نہ آئی ہوتی' اسی درد حالت میں......"

"زبان بند کرو حسنہ!" اس کی آہنی گرفت پل بھر میں اس کا منہ بند کر گئی۔

"بس...... اب اس سے آگے ایک لفظ نہیں......"

اس کی نیچی آواز میں بھیڑیے کی سی غراہٹ تھی اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

خود کو بے بس پا کر حسنہ نے پوری قوت سے اسے پرے دھکیلا اور خود پھوٹ پھوٹ کر رو ہوئے کمرے سے باہر بھاگ گئی...... اماں اس سے پہلے ہی منظر سے ہٹ چکی تھیں۔



"مجھے معاف کر دو رفاقت حسین! پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا......؟" اسی رات وہ اس کی کر ہتھی تھامے بے بسی سے کہہ رہی تھی...... اس نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی...... آنکھیں متورم ہونٹوں پہ سرخ مفقود...... سرخی مائل بھورے بال بے ترتیب سے کاندھوں پہ بکھرے ہوئے تھے

ایک عورت ہوں رافے! ایک بہت ہی عام سی عورت...... میرے سینے میں بھی دل ہے کہ تم میری طرف دیکھو...... مجھ سے باتیں کرو...... مجھے چاہو...... سراہو...... تم یہ سب ہتے...... تو بھی ٹھیک' مجھے منظور ہے۔" پلکیں جھپکتی وہ بڑے ضبط سے بول رہی تھی۔ وہ مرغولے اڑاتا نیم وا نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

لیکن پھر بھی...... پھر بھی کچھ معاملات ہیں۔" وہ اضطراری انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

یسے معاملات جن میں مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔" وہ بہت ہمت اور جرأت سے کام ...... پھر بھی جانے کیا مشکل تھی...... الجھے بالوں میں انگلیاں چلاتی وہ اس کے پیچھے سے امنے آ بیٹھی تھی...... آنسوؤں کے باریک قطرے اس کی پلکوں پہ چمک رہے تھے۔

پھر اچانک ہی حسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا...... اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے' وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے اور اپنی نازک انگلیوں سے بوط ہاتھ جکڑے وہ جیسے کسی سہارے کی متلاشی تھی۔

رافے! تم......" وہ بات مکمل نہیں کر پا رہی تھی...... اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر ت اتر آئی تھی۔

تم جانتے ہو' تخلیق کا مرحلہ کتنا دشوار ہوتا ہے۔ میرے لئے اکیلے یہ سب سہنا بہت مشکل مجھے تمہارا ساتھ چاہئے۔ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔" وہ کہتے کہتے رو دی۔

اور وہ آنکھیں پھیلائے اس کی بات کو دہراتا ہی رہ گیا تھا۔

"تم جانتے ہو تمہیں اور خود کو بچانے' چھپانے کیلئے میں نے کیا کچھ چھوڑا ہے؟ اتنا سب کچھ کے بعد یہ تنہائی میرے سارے حوصلے چھین کر لے گئی ہے۔ میں تمہاری بے اعتنائی...... ہاریگانگی سہتی آئی ہوں...... آگے بھی جھیل سکتی ہوں مگر ابھی نہیں' ابھی میں بہت اکیلی ہوں...... کیلی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے رفاقت حسین!" وہ اس کے کندھے سے لگی سسک رہی تھی۔

وہ اپنی جگہ ساکت و صامت تھا۔ نکاح کے بعد کے تمام عرصے میں وہ اسے چھونے تک کا وا تھا۔ پھر بات کی تہہ تک پہنچنے میں اسے کچھ پل لگے تھے۔ حسنہ کے کندھوں پر ہاتھ جما اسے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے اس نے بغور اس کا چہرہ دیکھا اور پھر دھیرے سے رہلا دیا۔

ہیں حسنہ......" اس کے ٹھہرے ہوئے ٹھنڈے ٹھار لہجے پر حسنہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔

مجھے یہ بچہ نہیں چاہئے۔" اس کے چہرے پہ اترتی سفاکی نے حسنہ کے قدموں تلے سے

زمین کھینچ لی تھی۔



لیلیٰ امید سے تھی...... اماں نے جب سے سنا تھا' پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔

حسنہ کا کئی بار دل چاہا...... اپنے بارے میں بتانے کو...... مگر کوئی انجانا خوف تھا جو ا
رہا تھا۔

جس خوشی کا وجود ابھی خطرے میں تھا' اس کے بارے میں انہیں کیا آگاہ کرتی......؟

''بہت سے درست لکھے گئے الفاظ میں ایک غلط لفظ کیا حیثیت رکھتا ہے' اسے کاٹ د
ہے...... یا مٹا دیا جاتا ہے۔ باقی رکھ لیا جائے تو تحریر بدنما لگنے لگتی ہے...... ایک غلط نقطہ بھی ز
زحمت بنا دیا کرتا ہے۔''

''لیکن یہ روشنائی سے لکھا ہوا کوئی لفظ تو نہیں ہے رفاقت حسین...... اسے کاٹنا یا مٹا د
آسان ہے کیا......؟ ایک جیتا جاگتا' زندہ' سانس لیتا وجود...... جو میرے اور تمہارے ہونے کی
دے گا۔''

''وہ صرف اس کمزور لمحے کی گواہی دے گا حسنہ بیگم! جو کبھی میری اور تمہاری زندگی م
تھا۔'' وہ اس طویل بحث کا اختتام من چاہے فیصلے پر چاہتا تھا۔

''کسی کو کیا خبر ہوگی...... شادی کے بعد سب ہی عورتیں بچے پیدا کرتی ہیں۔'' اس
میں ابھی سے اس ننھے وجود کیلئے تڑپ کروٹیں لے رہی تھی۔

''مجھے تو خبر ہوگی نا اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا...... یہ میری زندگی کی بدترین ہار تھی
اور ہار ماتھے پہ سجا لینے والی چیز نہیں ہوتی...... مزید بحث کی گنجائش نہیں ہے۔'' اس نے اسے
کچھ بولنے سے قبل ہی اسے خاموش کرا دیا تھا۔

''جو میں نے کہا ہے...... وہ کرو...... جس وجود کیلئے میرے دل میں گنجائش نہیں اس کیلئے گ
میں بھی گنجائش نہیں نکلے گی......'' اس کے حد درجہ سنجیدہ رویے نے اسے بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا

''میں کچھ روز کیلئے ڈیڈی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔'' اسے ایک ہی راہ فرار نظر آئی تھی۔

''چلی جاؤ...... لیکن واپسی پر اس بوجھ سے آزاد ہو کر آنا۔'' اس کا انداز قطعی تھا۔



لیلیٰ اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ جا رہی تھی۔ ساتھ ہی عمرے کا پروگرام بھی بنا تو وہ اماں کو لے
پہنچ گئی۔

موں بھی ساتھ چلنے کو تیار ہیں...... عمرے کے بعد آپ ان کے ساتھ واپس آجایئے
ں اپنے میاں کے ساتھ انگلینڈ فلائی کر جاؤں گی۔'' وہ بہت پرجوش ہو رہی تھی۔

ئی اور وقت ہوتا تو شاید اماں سوچنے کا وقت لیتیں...... لیکن اس مبارک ساعت میں انہیں
نے کیلئے ایک پل بھی نہ لگا تھا۔

روز' روز بلاوا نہیں آتا...... میرے سرکار کی رحمت ہے۔ میں ضرور جاؤں گی۔''

سنہ بھائیوں کی بے اعتنائی کے باوجود ایک ماہ سے وہاں تھی...... ان سب لوگوں نے جانے
ں باندھی تو ماموں رفاقت حسین کی تنہائی کے خیال سے اسے گھر چھوڑ گئے تھے۔ اماں جانے
ے جانے کیا کیا تاکیدیں' نصیحتیں کرتی رہیں۔

' فکر مت کرنا...... میں تمہاری ڈلیوری سے پہلے ہی لوٹ آؤں گی۔'' وہ خوش تھیں اور اس
ں خوشی کا اظہار بھی کر رہی تھیں۔

سنہ زبردستی چہرے پہ مسکراہٹ سجائے انہیں ٹالتی رہی...... ہزار دعاؤں سے نواز کر وہ
ت ہو گئیں۔ حسنہ بھائیں بھائیں کرتے گھر میں تنہا رہ گئی۔

شام کا وقت تھا آنگن میں بیٹھے بیٹھے اسے خوف آنے لگا تو کمرے میں آ گئی...... اس سنگ دل
بھی تک سامنا نہ ہوا تھا۔

''خبر نہیں' اس نافرمانی پر میرا کیا حشر ہوگا۔'' اسے ابھی سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔
یروں میں سنسناہٹیں سی دوڑ رہی تھیں۔

ات گئے وہ گھر میں لوٹا...... تو کمرے میں روشنی دیکھ کر اسی طرف چلا آیا۔

روازے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اس نے بس ایک ہی نگاہ ڈالی تھی اس کے سراپے پر اور
جان ہوا ہو گئی۔

''کھا...... کھانا لاؤں آپ کیلئے......؟'' وہ بڑی مستعدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ قدم قدم چلتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا...... یک ٹک اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس کی
بھیگ گئی تھی۔

''م...... میں گئی تھی ڈاکٹر کے پاس...... اس نے کہا دے...... دیر ہو چکی ہے۔''

''چٹاخ'' اس کا ہاتھ پوری قوت سے گھوما تھا...... اور اس کے لڑکھڑا کر گرنے سے پہلے ہی
ے دونوں بازوؤں سے تھام کر سامنے کھڑا کرتے ہوئے پھنکارا تھا۔

''تم ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی تھیں حسنہ محمود!''

وہ سانس روکے بے یقینی کے عالم میں کھڑی تھی۔ چہرے کی زرد رنگت پہ چار انگلیوں
نشان بہت واضح تھے۔

"تم میری ضد میں کر رہی ہو یہ سب' لیکن میں تمہیں نہیں کرنے دوں گا۔" اس کی
گرفت اس کے بازوؤں کو شل کیے دے رہی تھی' مگر وہ دم بخود تھی۔

"یہ ان چاہا وجود اس دنیا میں آئے گا...... اور اس کیلئے مجھے اگر تمہاری جان بھی لی
میں وہ بھی کر گزروں گا......" اس کا ہاتھ حسنہ کی شہ رگ تک جا پہنچا تھا۔

"دی ہوئی نہیں حسنہ بیگم! تم دیر کر رہی ہو...... لیکن ایک بات یاد رکھو...... اس وجود
چھٹکارا ہی میری' تمہاری نئی زندگی کا ضامن ہوگا...... ورنہ میری زندگی میں تمہارے اور تمہارے
کیلئے کوئی جگہ نہیں ہوگی...... مائنڈ اٹ۔" وہ انگلی سے اس کے ماتھے پہ ضرب لگاتا باہر نکل گیا۔

اس کا لہجہ ٹھوس تھا...... کسی بھی گنجائش سے عاری...... گویا جو وہ کہہ رہا ہے...... وہ کر
گزرے گا۔ وہ بت بنی خود پہ بیتی واردات پر حیران تھی۔

اسے یقین ہی نہ آتا تھا...... کہ واقعی یہ سب رفاقت حسین چودھری نے کہا اور کیا یہ
رفاقت حسین' جس سے اس نے ایک عمر محبت کی...... اس کی ہر ہر خامی کے باوجود اسے چاہا۔

اس نے یونہی بیٹھے بیٹھے رات بتادی۔

کبوتروں کی کابک سے کسی نوزائیدہ بچے کی چیں چیں بھوک سے بے قراری کا اعلان کر
تھی۔ اس معصوم آواز پہ کوئی نوزائیدہ پکار بھی غالب آئی تھی۔

"نہیں رفاقت حسین! باوجود اس کے کہ تم مجھے ایک نئی زندگی کی پیشکش کر رہے ہو......
ہو سکتا ہے' تمہاری محبتوں سے لبریز بھی ہو...... لیکن پھر بھی رفاقت حسین! میں یہ قتل نہیں کر سکتی
فیصلہ ہو گیا تھا۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے وہ یہ گھر خود اپنی مرضی سے چھوڑ کر جا چکی تھی۔



آئینہ بتاتا تھا کہ ماہ و سال بیت گئے ہیں۔

"کتنے......؟" یہ نہیں بتاتا تھا اور نہ ہی اسے خود اندازہ تھا...... ہاں بس یوں تھا کہ اب
آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو پہچان نہیں پاتا تھا۔ سرمئی گھونگھریالے بال کھچڑی ہو گئے تھے...... گنجا
داڑھی' ہاتھ کی لٹکی ہوئی جلد سے ابھری نسیں' تنی ہوئی رسیوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں...... عینک
ٹے شیشوں کے پیچھے آنکھوں کا رنگ نظر ہی نہ آتا تھا۔ راہ میں آنے والی ہر چیز کو ٹھوکر

پیر اب بسا اوقات خود ٹھوکر کھا جاتے تھے۔

ں کے چلے جانے کے بعد گھر بھی تو پہلے جیسا نہ رہا تھا۔

ے ایک کمرے اور باورچی خانے کے سوا سارا گھر بند تھا...... در و دیوار پہ خاک اڑتی
وں کے کابک خالی...... آبخورے ندارد...... چڑیاں اس گھر کا راستہ ہی بھول گئیں۔

اسی طرح...... جس طرح لیلیٰ انگلینڈ سدھاری تو پھر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

طرح اماں عمرہ کرنے گئیں تو وہیں خوشبودار مٹی کو اپنا مدفن بنا لیا۔

طرح حسنہ نے اپنا کوئی اتا پتا نہیں چھوڑا۔

گئے برسوں میں ایک ایسی ہی شام آنگن میں اتری...... جب خودی کے زعم میں اس نے
ے انداز میں سوچا تھا۔

ی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

وں کے فراق میں جامن کا درخت اپنی جڑ سے اکھڑے گا نہ محبتوں کے ہجر سے رفاقت
دھری کے قدم ڈگمگائیں گے۔

ن وقت بہت سے اندازے غلط ثابت کر دیتا ہے...... بظاہر بہت گھنا' مضبوط درخت بسا
ندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔

س پاس بہت سے گھر آباد ہو گئے تھے۔ جوانوں کے قہقہے...... بچوں کی چوکاریں' عورتوں کی
میں پہنی چوڑیوں کی کھنک......

اور آج طویل ماہ و سال بتا دینے کے بعد رفاقت حسین چودھری کو علم ہوا تھا کہ آنگن میں لگا
درخت بھلے فخر و غرور سے تن کر کھڑا ہے...... لیکن اس کی برہنہ شاخوں میں چڑیوں کے
کی خواہش تو ازلوں سے گڑی ہے۔



پلٹ کر دیکھنا چاہو تو نفرتوں سے ادھر
دنوں کی راکھ پہ' راتوں کی یخ ہتھیلی پہ
ہوا کے ناچتے گرداب کی تہوں میں کہیں
بجھا ہوا کوئی لمحہ کسی چراغ کا داغ
نظر پڑے تو سمجھنا کہ میں بھی زندہ ہوں
کہ میں بھی زندہ ہوں اپنے اجاڑ دل کی طرح

اجاڑ دل کہ جہاں آج بھی تمہارے بغیر
ہر ایک شام دھڑکتے ہیں خواہشوں کے کواڑ
ہر ایک رات بکھرتی ہے آرزو کی دھنک
ہر ایک صبح دہکتے ہیں زخم زخم گلاب
اجاڑ دل کہ جہاں آج بھی تمہارے بغیر!
ہر ایک پل میری آنکھوں میں ڈھل کے ڈھلتا ہے
تپتی رت کی تپش سے بدن پگھلتا ہے

کئی برس پہلے یہ خط اس نے کھولا تو اس کی تہہ میں گلاب کی کچھ پتیاں بھی قید تھیں۔ تب ا
نے بھیجنے والی کا نام پڑھ کر اسے ایک غیر ضروری کاغذ سمجھ کر بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ لک
کے اس صندوق میں ڈال دیا اور آج اس صندوق کی چھانٹی کرتے ہوئے اس نے یہ تحریر ایک ن
کئی بار پڑھی تھی۔

اسے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا...... وہ سب جو اس تمام عرصے میں کبھی یاد آیا نہ اس نے یاد کر
خواہش کی تھی۔

اس خط کو تہہ کرتے ہوئے کوئی کسک آمیز بے قراری اس کے آس پاس منڈلانے لگی تھی
اس نے ایک اور پرزے کی تلاش میں جلدی جلدی بہت سے کاغذ پلٹے...... وہ پرزہ بھی ایک کو
میں پڑا مل گیا تھا۔

یہ تحریر پانچ سال پرانی تھی...... سیاہی میں ڈوبے لفظ موتیوں کی طرح سفید کاغذ پر بکھر
ہوئے تھے اور ان کی آب و تاب پہلے دن کی طرح قائم تھی۔ اس نے یہ چٹ اپنے سا
پھیلائی...... اپنی پچکی ہوئی پوروں سے گدلی آنکھوں کو مسلا اور پھر موٹے عدسوں والا چشمہ لگ
سیدھا ہو بیٹھا۔ ادھ کھلے روشن دان سے پیلی زرد روشنی براہ راست اس کی میز پر پڑ رہی تھی او
اس کے سامنے عیاں تھے۔

"آنا چاہو تو چلے آؤ رفاقت حسین چودھری!
میں تمہارے بیٹے سے یہ تو نہیں کہہ سکی کہ تمہارا باپ مر چکا ہے' لیکن کھوئے ہوئے مساف
واپسی کا منتظر وہ اتنی دیر سے تھا کہ اب اس کا انتظار لاغر ہو کر دم توڑ چکا ہے۔
سو آنا چاہو تو اپنا تعارف بدل دینا کہ ہو سکتا ہے اب کے پذیرائی کا اندازہ نہ ہو۔"

اور آج سے پانچ سال قبل اس نے یہ ہی الفاظ بہت سرسری نگاہ سے پڑھے تھے اور یہ

والے بہت سے سالوں کیلئے لکڑی کے اس صندوق میں قید کر دی تھی اور آج...... آج
کے ہاتھوں میں کیسے موجود تھی...... اسے خود بھی خبر نہ ہو سکی تھی اور اس کا ہر عضو...... اب
ر میں تھا ہی کب......؟ وہ سب اپنی مرضی کے آپ مالک تھے...... دماغ اپنی مرضی سے
دل اپنی مرضی سے دھڑکتا تھا۔
ں اپنی خوشی سے حرکت کرتی تھیں۔
م اپنے لفظ خود لکھتا تھا۔
یں وہی دکھاتی تھیں...... جو وہ خود دیکھنا چاہتی تھیں۔
بھی تو اپنی ہی چال چل رہا تھا اور اس کے بوڑھے' بدصورت پیر چمڑے کے کھلے بوسیدہ
مقید اپنی راہیں خود ڈھونڈتے تھے...... اسے اپنی مرضی سے چلاتے تھے' جب ہی تو اسے
تے ہوئے وہ اسے انجانے راستوں کی طرف لئے جا رہے تھے۔
اس کی ہتھیلی...... جو کاغذ کے معمولی پرزے کو یوں سمیٹے ہوئے تھی جیسے ایک ماں بچے کو
خوف سے اپنے سینے سے چمٹائے رکھتی ہے۔
اب وہ اس خوبصورت بنگلے کے سفید گیٹ پہ کھڑا تھا۔
لانکہ اس نے یہ سب نہیں چاہا تھا لیکن وہ یہ کر رہا تھا کیونکہ اس کے اعضاء اس کی حاکمیت
ہو چکے تھے۔
میں ان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" چوکیدار کو بتاتے ہوئے اس کا اشارہ نیم پلیٹ کی
ا۔
'کیا کام ہے بزرگو!" سونف سپاری پھانکتے ہوئے چوکیدار نے اسے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔
"تمہیں بتانے کا نہیں ہے کام...... اسی سے ملوں گا۔" اسے اپنی آواز ایک ایسے خبطی بوڑھے
تھی جو انسانوں سے بات کرتے ہوئے انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔
ھر پر کسی سے نہیں ملتے وہ......"
تو پھر......؟ کہاں ملا جائے......؟"
دفتر چلے جاؤ' ملاقات کا ٹائم دیں گے تو مل لینا۔"
اثبات میں سر ہلاتا پلٹا...... لیکن قدم آگے نہ بڑھا سکا...... کسی کی بھوری آنکھیں کا سنی
ں چھپی کھڑکیوں سے جھانکتی محسوس ہو رہی تھیں۔
سنو!" وہ واپس پلٹا۔

"گھر میں اور کوئی......؟"

"صاحب اکیلے رہتے ہیں یہاں۔"

اور اس شخص سے زبانی کلامی دفتر کا پتا سمجھ کر وہ واپس گھر آ گیا تھا...... جانے کیوں خیال آیا تھا کہ اس حلیے میں اسے وہاں نہیں جانا چاہئے۔

کھونٹی سے دوسرا جوڑا اتار کر پہنا تو اسی دوران سانس اتھل پتھل ہوگئی۔ وہ ذرا دم پہ بیٹھا تو ساتھ ہی سگریٹ سلگا لی۔

کوئی سایہ سا سامنے کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے سٹپٹا کر نیم وا آنکھیں کر لیں۔

"صاحب اکیلے رہتے ہیں یہاں۔" چوکیدار کی آواز گونجی تھی۔

سانس لینے میں کچھ مشکل ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے سینے کو ذرا سا مسلا اور سگریٹ ایک بار پھر باہر نکل آیا...... فاصلہ بہت تھا لیکن اس نے پیدل طے کرنا تھا...... اٹھتے بڑھتے قدموں کے سامنے کولتار کی سیاہ سڑک اور طویل ہوتی جا رہی تھی...... سورج آہستہ آہستہ بلند رہا تھا...... راہ میں جتنی بار بھی وہ دم لینے کو رکا' آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا رہا۔

"صاحب اکیلے رہتے ہیں یہاں۔" چوکیدار کی بھدی آواز بہت کرخت تھی۔ وہ اس لفظ کو پیروں تلے روند کر آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔

اب وہ ایک ایسی سڑک پر تھا جہاں ٹریفک کا اژدھام اور آسمان کو گدلا کرتا سیاہ دھواں رنگ برنگے ہارن بج رہے تھے۔ شور تھا' بے سکونی تھی۔ وہ بہت بچ بچا کر سڑک پار کرتا ف آ گیا...... یہاں سے اسے دائیں ہاتھ مڑنا تھا۔ جہاں سب سے اونچی بلڈنگ کی دوسری موجود دفتر میں اسے پہنچنا تھا۔ لفٹ موجود تھی لیکن اس نے سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ اس کی ٹا ہو چکی تھیں لیکن اس طریقے سے وہ خود کو کچھ وقت دینا چاہتا تھا۔

"کدھر جا رہے ہو بابا جی؟" دفتر کے سامنے کھڑا چوکیدار جو اہل لوگوں کیلئے یہ دروا مؤدب ہو کر کھولا کرتا تھا۔ اس وقت اس کا بازو کڑے شکنجے میں جکڑے' کٹھور لہجے میں اس کر رہا تھا۔

"میں تمہارے صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آپ اندر نہیں جا سکتے...... وہ صرف کاروباری لوگوں سے ملتے ہیں۔ دینے دلا گھر پہ ہوتا ہے۔" اس نے اپنے سامنے کھڑے کھچڑی بالوں والے بوڑھے کو ٹالا' جس کی کم

نہ تھا۔

کیا تمہارے صاحب نے تمہیں یہ اختیار بھی دے رکھا ہے کہ تم کسی کے اندر جانے یا نہ فیصلہ کرو۔" اس کا لہجہ غصیلا اور دبنگ تھا۔

تم یہاں چوکیداری پر مامور ہو...... میری تلاشی لینا چاہتے ہو لے لو...... روکنے کا حق تم نہیں

چوکیدار نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔

س کا نوجوان افسر ایک دیالو شخص تھا۔ کیا خبر اس سنکی بوڑھے کو یہاں بلا رکھا ہو۔ دفتر کے کھلے پرسکون ماحول میں خوبصورت لباس پہنے' پڑھے لکھے افراد نے اس بوڑھے شخص کو ازحد سے دیکھا' جس کے لباس پر اتنی سلوٹیں نہ تھیں جتنی اس کے چہرے پر۔

"کیا بات ہے بابا جی؟" پہلی میز پہ بیٹھے شخص نے پوچھا۔

"میں یہاں پر کوئی صاحب......"

"وہ سامنے شیرازی بیٹھا ہے...... نیلی شرٹ والا...... آپ اس کے پاس چلے جائیں۔" اس اس غالباً پوری بات سننے کا وقت نہ تھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس نوجوان کے پاس چلا آیا جو فائل سامنے رکھے رنگ برنگی ں میں الجھا ہوا تھا۔

"میں صاحب جی سے......" وہ ہولے سے کھنکارا...... شیرازی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دفتر میں غالباً وہ پہلا شخص تھا جس کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر تحیر نہ جاگا تھا۔

"وہ آج بہت مصروف ہیں...... کسی سے نہیں ملیں گے۔" وہ سر جھکا کر دوبارہ کام کرنے لگا۔

"میں انتظار کر لیتا ہوں۔"

"ان کے ایک دیرینہ دوست آئے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے ہر میٹنگ کینسل کر دی ہے...... پھر کسی روز آ جائیں۔" اس کا لہجہ نرمی لئے ہوئے تھا۔

"میں نے کہا نا...... میں انتظار کر لیتا ہوں۔"

اب کے شیرازی نے عجیب نظروں سے اس کی ڈھٹائی کو جانچا۔ اتنے میں وہ کرسی گھسیٹ کر چکا تھا۔ شیرازی نے طویل سانس لے کر سر جھکا لیا۔

اس نے تسلی سے بیٹھتے ہوئے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی...... دائیں طرف شیشے کی ایک دیوار تھی جو کیبن کو باقی دفتر سے الگ کر رہی تھی۔ شیشے کے اس پار بلائنڈز اٹھا دی گئی تھیں۔ اس نے بغور

جانچا۔ کسی نوجوان کی ایک ہلکی سی جھلک سی دکھائی دی تھی کہ اس نے نگاہ پھیر لی اور پھر بے اختیار
سینے پہ ہاتھ رکھ کر اپنے دل کو تھپتھپایا جو اپنی رفتار کبھی سست اور کبھی تیز کر رہا تھا۔

"پانی...... پانی مل سکتا ہے۔"

شیرازی نے مدھم آواز پر سر اٹھایا۔ اس ٹھنڈے ماحول میں بھی اس کی زرد پیشانی پر پسینے
ننھے منے قطرے ابھر رہے تھے' اس نے فوراً ہی پانی منگوایا۔

دو گھونٹ پی کر اس نے گلاس واپس میز پہ رکھا۔

"اسے یہیں رہنے دو۔" اس نے ملازم کو گلاس اٹھانے سے منع کر دیا تھا۔

پھر معلوم نہیں کتنا وقت اور بیتا...... جب ایک دم سے وہ بند دروازہ کھلا۔ دو ہم عمر جوان
ہوئے باہر نکلے۔ ایک عمر کی ناآشنائی تھی' مگر رفاقت حسین کی نگاہ کسی لاغر پرندے کی طرح
نقوش میں رچی جاذبیت کو چھو کر اس کے قدموں میں جا گری تھی جو اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر
بڑھ گیا تھا۔

اس کی سماعتوں نے ان قدموں کو بیرونی دروازے کی طرف جاتے سنا تو وہ تیزی سے
کھڑا ہوا۔ کرسی دھکیل کر وہ اس کے پیچھے لپکنے ہی والا تھا جب شیرازی نے آگے بڑھ کر اسے
لیا۔

"وہ جا رہا ہے' میرا اس سے ملنا۔"

"وہ واپس نہیں آئیں گے۔ آپ بیٹھ جائیں۔" شیرازی نے بات کاٹ کر اسے تسلی دی

"اور اگر وہ چلا گیا۔" اس کے خدشے پر وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"وہ اپنے سٹاف سے پہلے کبھی نہیں جاتے...... دوست کو رخصت کر کے لوٹ آئیں گے

اسے یقین نہیں تھا' مگر وہ سچ مچ آ گیا تھا اور اس کی کرسی کے عقب میں کھڑا شیرازی
کہہ رہا تھا...... مگر کیا؟ رفاقت حسین کچھ بھی سن نہ پایا...... وہ اس مانوس خوشبو میں گھرا تھا
عنکبوت کی طرح اسے اپنے شکنجے میں جکڑ رہی تھی...... وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تب شیرازی
انٹر کام پر اس سے رفاقت حسین کے متعلق بات کی۔

"آپ جا سکتے ہیں' یہ سامنے دروازہ ہے۔"

اس نے اٹھنے سے قبل پانی کا پورا گلاس پیا تھا' پھر بھی لڑکھڑا گیا...... شیرازی نے اسے
دینا چاہا مگر وہ منع کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔



یع وعریض میز کے دوسری جانب وہ اپنی کرسی کو دائیں بائیں جھلاتے ہوئے بڑی فرصت
آدمی کا منتظر تھا جو بقول شیرازی پچھلے اڑھائی گھنٹوں سے اس کا منتظر تھا۔ کمرے میں داخل
ت حسین جان نہیں سکا تھا کہ کمرے میں خنکی زیادہ ہے یا خود اس کے وجود میں کپکپاہٹ اتر
ہے۔

"تشریف رکھیے جناب!" بہت نارمل انداز تھا اس کا' اس نے اپنا وجود قریب رکھی ہوئی کرسی
کر دیا۔

"جی فرمائیے۔" اس کا لہجہ بہت شائستہ اور نرم تھا۔

رفاقت حسین کچھ بول نہیں سکا۔ وہ اس وقت صرف اسے دیکھنا چاہ رہا تھا۔

وہ لمبی قد و قامت کا مالک تھا۔ آنکھیں اور بال سیاہ تھے۔ رنگت گوری' نقوش میں حد درجہ
ت' آنکھوں میں دل کو کھینچ لینے والی کشش تھی۔

اس کا دل بپھرنے لگا' اٹھ اور اٹھ کر اسے اپنے سینے میں بھینچ لے۔"

لیکن اس کا تن مردہ تھا...... بس آنکھیں زندہ تھیں' جو کہہ رہی تھیں کہ اس سے پیارا چہرہ اس
ات پر انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔

شادہ پیشانی' کھڑی ناک' عنابی ہونٹ' چوڑا سینہ' سیاہ روئیں والے مضبوط ہاتھ' گلابی پوریں
وں میں دوڑتا ہوا سرخ گرم لہو جو رفاقت حسین کے خون کو بھی گرمائے دے رہا تھا۔ اس
جائزے سے بے نیاز اس نے قدرے اکتا کر پہلو بدلا' تب وہ چونکا۔

تمہارا نام...... تمہارا نام کیا ہے......؟" اس کا سوال سن کر سیاہ آنکھوں میں از حد حیرت

'یہ آدمی میرا نام تک نہیں جانتا اور پھر بھی اڑھائی گھنٹوں سے۔" اس نے اپنی سوچ کو ادھورا
یا۔

"میرا نام سعدون میراث چودھری ہے...... آپ یہاں کس سلسلے میں......"

"میں۔" اس نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا۔

"اب کے آنا چاہو تو تعارف بدل کر آنا۔" اس نے سر جھٹک کر اس آواز سے اپنا پیچھا
ا۔

"میں ایک کہانی کار ہوں۔"

تب ہی میز پہ پڑے فون کی گھنٹی بجی۔ سعدون نے ریسیور اٹھا کر اس پہ نگاہ ٹکاتے ہوئے

دوسری طرف کی بات سنی اور "پندرہ منٹ بعد" کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"دیکھو...... میں، میں ایک کہانی کار ہوں۔"

"جی میں سن چکا ہوں۔" اب کے اس کا انداز عجلت بھرا تھا۔

"صرف پندرہ منٹ ہیں تمہارے پاس رفاقت حسین!" وہ خود سے مخاطب ہوا' پھر اس

"میں کامیاب لوگوں کی زندگی کی کہانیاں ترتیب دے رہا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنی کامیابی
بتاؤ گے۔" اسے بات بنانے میں کچھ وقت لگا تھا۔

"ساڑھے تیرہ منٹ۔" اس نے نگاہ اٹھا کر دیوار پہ لگے اس کلاک کو دیکھا جو بڑی بے
سے ایک ایک مردہ سیکنڈ کو وقت کے سمندر سے اچھال کر باہر پھینک رہا تھا۔

"کامیابی کا راز......؟ کیا آپ ہر اس فرد کو کامیاب تصور کر رہے ہیں جو کسی بڑی سی بل
کے فرنشڈ آفس میں ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا ہو......" سعدون میراث کو اس کی بچکانہ با
قدرے حیرت ہوئی تھی۔

"تمہاری کشادہ پیشانی پر مجھے روشنیاں بوسہ دیتے ہوئے دکھائی دے رہی ہیں' جوان
ہی میں نے تم سے یہ سوال کیا ہے۔" وہ بات سے بات نکال رہا تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی
آنکھوں کو سیراب کرنا چاہتا تھا اور پیاس تھی کہ مٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

"میری ساری زندگی ایک ہی اصول پر گزری ہے...... حق لٹاؤ تو یوں کہ کوئی انگلی تم
طرف نہ اٹھے اور فرض نبھاؤ تو اس طرح کہ کبھی سر نہ جھکانا پڑے۔"

"یہ سبق......؟" اس کے گلے میں کوئی پھندا سا پڑ گیا تھا۔

"میری ماں نے پڑھایا تھا۔"

"تمہاری ماں......؟"

"اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

گھڑی کی ٹک ٹک اس کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اس نے طویل سانس لیا
اور سر جھکا لیا۔

"تم نے اس کے حقوق پورے کیے؟"

"ماں کے حقوق ادا کیے جا سکتے ہیں؟" سعدون نے جوابی سوال داغا۔ "پھر بھی وہ آخری دم
تک مجھ سے بہت خوش تھیں۔"

"اور باپ......؟" اس کی زبان سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

باپ راہ گم گشتہ کا مسافر ہے۔ کبھی لوٹ کر آیا تو میں یقیناً کوتاہی نہیں کروں گا۔"

ے سینے میں کوئی کیڑا سا کلبلایا تھا۔ درد کی لہر بہت دور تک گئی تھی۔ وہ لب بھینچے بیٹھا تھا۔

وشی میں ٹیلیفون دوبارہ گنگنا اٹھا تھا۔

ہو دو۔" اس نے ریسیور رکھا۔

ہکیوزمی۔ میرے کچھ مہمان آرہے ہیں۔" وہ درپردہ اسے جانے کیلئے کہہ رہا تھا......

ن نے بے چین ہو کر کلاک کی سمت دیکھا۔

ی چار منٹ باقی ہیں۔"

ں......؟" سعدون سمجھ نہیں پایا تھا۔

بھی پندرہ منٹ پورے نہیں ہوئے تم نے مجھے۔" عقب میں دروازہ کھلا تھا...... خوشبوؤں
ونکے سعدون کی ساری توجہ سمیٹ لے گئے تھے...... اس نے ان تین حضرات سے ملتے
عدون کو دیکھا اور پھر اپنے ہاتھوں پر پورا زور دے کر اٹھا۔

سعدون میراث! کیا تم مجھے دروازے تک چھوڑنے جا سکتے ہو......؟" اسے ان لوگوں کے
ری طرح مصروف ہونے سے پہلے ہی اس نے ٹوکا۔

واٹ؟" سعدون کو اس بوڑھے کی ذہنی حالت پر شک ہوا...... قدرے تعجب سے مسکراتے
اس نے ایک نظر صوفے پہ بیٹھے افراد کو اور پھر اس بوڑھے کو دیکھا جو آنکھوں میں لجاجت
" دیکھ رہا تھا۔

ئی آئم جسٹ کمنگ۔" وہ صوفے پہ بیٹھے افراد سے کہتا تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے ساتھ

نے دانستہ قدموں کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے اپنے برابر چلتے سعدون میراث چودھری کو
کا قد رفاقت حسین سے بھی چند انچ لمبا تھا اور وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت دکھائی
کبھی رفاقت حسین اپنی جوانی میں ہوا کرتا تھا۔ چوکیدار نے سعدون کو آتے دیکھ کر جھٹ
دروازہ کھولا...... اپنے ورکرز کے چہروں پہ پھیلی حیرانی کو نظرانداز کر کے وہ صرف اور
بوڑھے کے جانے کا منتظر تھا جو دروازے کے قریب جا کر رک گیا تھا۔

یہ چار منٹ میرا حق تھے سعدون میراث چودھری! جو تم مجھے نہ دے رہے تھے' مگر میں نے
سے لے لیے' صرف اس لیے کہ روز قیامت میری انگلی تمہاری طرف نہ اٹھ سکے۔"

عدون ایک پل کیلئے خاموش کھڑا رہ گیا تھا۔

رفاقت حسین سیڑھیاں اتر کر چلا گیا...... سعدون نے کندھے اچکا کر واپسی کیلئے قدم
دیئے۔



کون ہوگا ہم سا تہی داماں لوگو!
جیب میں حرف دعا ہے نہ ہتھیلی پہ ضیاء
نہ تبسم' نہ رفاقت' نہ کوئی لمحہ یاد
آنکھ ویران ہے اور دل خالی
ہونٹ نادم ہیں اور باہم پیوست
ان کہے حرف ہیں رنجور اور
ساعتیں بے فیض

سیاہ دھواں حلق میں کڑواہٹ بھرتا چلا گیا۔ وہ کھانستے کھانستے بے دم ہو کر سانس لینے
مگر ہارن کی تیز آوازیں کانوں کو چھید رہی تھیں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا فٹ پاتھ پر
آنکھوں میں کڑوا پانی تھا نہ بہنے کو تیار تھا' نہ خشک ہونے کو۔ وہ بہت دیر سے راستہ بھولا ہوا تھا
چنگھاڑتی وسیع وعریض سڑکیں ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔

انگلیاں خشک چٹانوں کی طرح تڑخی ہیں
کسی آنسو کی نمی ان کی زباں پر
کبھی اتری ہی نہیں
آس جکڑی نہ تمنا کسی دوجے کو تھمائی ہم نے

بھاگتے دوڑتے قدم بے جان ہوئے تو وہ فٹ پاتھ پر لگے درخت کے چوڑے تنے
کر بیٹھ گیا۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ اداس فضا' مضمحل پرندے' دم سادھے شکستہ درخت
بازوؤں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ آنکھ سے پانی بہہ نکلا تھا۔ وہ دبی دبی آواز میں رو رہا تھا۔
زندگی میں پہلی مرتبہ۔

"یہ کیا کیا تم نے رفاقت حسین! کس زعم میں تھے کہ اتنا سب کچھ کھو دیا......؟ اس کی
کسی پھندے میں جکڑی تھیں اور پیروں تلے تیز دھار تلوار۔
کوئی خاردار تاروں سے اس کا بدن چھلنی کر رہا تھا۔ بہت دیر رو چکنے کے بعد وہ در

ا جانب بھاگا...... بھاگتے بھاگتے تھک گیا تو تھکی ہاری چال چلنے لگا۔ جوتے اس کے
نہیں تھے۔ خدا جانے کہاں چھوڑ آیا...... اسے خود بھی یاد نہ تھا۔ زخم زخم پیر بڑی مشقت
و پیچھے دھکیلنے لگے۔

ھر تنہا رہے' تنہا جیے
نے کو تو کچھ لوگ تھے بہت اپنے
ری کے زعم میں داؤ پہ لگایا جن کو
ج ہوتا ہے گماں ان کے کہیں ہونے کا
لن یہ گماں!
ں مگر صرف گماں!

ھ گھر پہنچ کر بے دم ہو کر چارپائی پہ جا گرا تھا۔



آسمان بالکل سیاہ تھا نہ چاند نہ تارے گھنے' بادل تھے جو تاریکی میں کہیں دکھائی نہ دے رہے
ہ بہت دیر سے اپنی چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ نگاہیں اوپر بہت اوپر کچھ کھوج رہی تھیں۔ ہوا
، لیکن سبک خرام' جامن کے پتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر مدھم مدھم سرگوشیاں کر رہے تھے۔
لیاں دھیمی کروٹیں شکلیں اور آوازیں بدل رہی تھیں۔ اس نے کروٹ لی اور پہلو کے
لیا۔

میری ساری زندگی ایک ہی اصول پر گزری ہے۔" وہ آواز بھولتی ہی نہ تھی۔
و ایک بار پھر سیدھا ہو لیٹا۔
ندی پر کچھ شکلیں دکھائی دینے لگی تھیں۔
'اپنے لئے وکھری راہیں تلاش نہ کر رفاقت حسین...... کڑی سے کڑی ملی رہے تو اچھا ہے۔"
راماں نے کہا تھا۔
"آنا چاہو تو چلے آؤ رفاقت حسین چودھری!"
اور حسنہ محمود۔
"اس نے ہر بار موقع دیا تھا...... شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ روز قیامت میری طرف انگلیاں
ار میرا سر جھکے۔" کنپٹی میں درد کی تیز لہر ابھری تو وہ درد کی شدت سے بے حال ہو گیا۔
"آہ! کتنی تکلیف ہے۔" خالی ڈھنڈار گھر میں اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔ وہ خود کو نڈھال

ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

"کس برتے پر تھے تم رفاقت حسین! کیا جوانی پر مان تھا کہ وہ کبھی ڈھلنے نہ پائے
دل پر یقین تھا کہ کبھی نہ ڈگمگائے گا...... تمہیں نہ سہارے کی ضرورت تھی نہ آسرے کی۔ اپ
ناخدا بن بیٹھے' یہ سوچے بغیر کہ پتوار نہ ہو تو کشتی بیچ سمندر میں ڈولتی ہی رہ جاتی ہے۔"

دیوار پار آنگن میں تھالی گری تھی...... ساتھ ہی نسوانی چیخ و پکار۔ اس نے گردن گھ
چوبارے کی سفیدی تیز روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ بگھار کی خوشبو بچے کے رونے کی آواز مر

"آہ ہنستے بستے گھروں کی نشانیاں۔" ہوا کا تیز جھونکا آیا تھا۔ وہ ہلکی سی جھرجھر
گیا۔ اکتوبر شروع ہونے کو تھا اور اس پر وقفے وقفے سے ہوتی بارشیں۔ ٹھنڈ تو ہوگی ہی۔
ٹانگیں سمیٹ کر گھٹنے کھڑے کر لئے۔

اسے بھوک لگ رہی تھی اور چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔

"کوئی نہیں رفاقت حسین! کوئی بھی نہیں...... جو تمہارے لئے کھانے کا اہتمام
چاول' روٹی تھالیوں میں سجا کر تمہارے سامنے رکھے۔" اس پر غنودگی سی چھانے لگی......
تلے روشنی سی اتر آئی...... باورچی خانے میں کھٹ پٹ ہو رہی تھی...... لیلیٰ چڑیوں کو باج
تھی۔ کبوتروں کی غٹرغوں نے شور مچا رکھا تھا اور ادھ کھلے دروازے کے پیچھے سے جھانکتا

"کیسے انسان ہو تم؟ کس مٹی سے بنے ہو؟ تم پہ کسی چیز کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔" و
پہ آ کر چیخی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اٹھا اور ننگے پیر
کمرے میں آ گیا۔ ساٹھ پاور کا بلب جلا کر اس نے وہ صندوق کھولا...... سب سے نچلی
اینڈ وائٹ تصویریں پڑی تھیں...... اماں کی' لیلیٰ کی اور خود اس کی...... بھرے ہوئے د
چوڑا چکلا سینہ پھلائے' اپنی ہی ذات کے فخر و غرور میں مبتلا شاداں و فرحاں...... ا
تصویریں واپس رکھ دیں۔

اور ان سب تصویروں میں وہ ایک تصویر نہیں تھی...... لیکن اس کے نقوش سب
تھے۔

"بہت اکیلی ہوں...... مجھے تمہاری ضرورت ہے رفاقت حسین!" گئے وقتوں میں
سے کی گئی تھی۔

"حقوق و فرائض کی جنگ چھڑی تو تم سا کنگال اور کون ہوگا...... وقت لوٹ کر آ

الے۔ جو کھو چکے ہو اسے واپس کیوں کر لاؤ گے رفاقت حسین! ہاں مگر جو ہے۔"

وہ ایک پل کیلئے چونک سا گیا تھا۔



"حسن رضا! سارا قصہ ان آتی جاتی سانسوں کا ہے۔ سانسیں جڑی رہیں تو زندگی ہے ورنہ
ہارا کیا بھروسہ۔"

نوجوان حسن رضا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اب زندگی پر ایمان نہیں رہا۔ ایک سانس جاتی ہے تو دوسری کے آنے کا رتی بھر یقین نہیں
یہ ایک خط ہے۔" اس نے زرد رنگ کا لفافہ اس کے سامنے کیا۔

"نہیں کہیں سنبھال کر رکھ دوں گا۔ مرگیا تو اس پتے پر پہنچا دینا جو اس پر لکھا ہے اور قبر پر
مٹی ڈالنے سے کچھ وقت' پہلے تک اس ایک شخص کا انتظار ضرور کرنا۔"

رات کے سناٹے میں زرد روشنی تلے سپید چہرہ لئے رفاقت حسین سے حسن رضا کو اچھا خاصا
ں ہوا تھا۔ سو جلدی سے اثبات میں سر ہلا کر اپنے گھر میں گھس گیا۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھا
ں اذان کی آواز کانوں میں پڑی...... مسجد بہت قریب تھی۔ وہ خط میز پر ڈال کر ننگے پاؤں
مسجد خوب روشن تھی اور بارونق بھی۔ وہ وہیں کچھ فاصلے پہ کھڑا دیکھنے لگا۔ مسجد کا صحن قطار
زیوں کے وجود سے بھرا ہوا تھا۔

مر بھر اس کے وجود سے منکر رہے۔ اب کس منہ سے اس کے در پہ حاضری دینے
وہ مسجد کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا...... نہ جانے کیوں دل بھر آیا تھا۔

تو یہ تھی وہ منزل جو تم اپنے بل بوتے پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ زیرو' آر ایچ چودھری۔
ہے تمہارے پاس؟ کچھ بھی نہیں' دل خالی' آنکھ خالی' ہاتھ خالی' نہ کچھ کمایا' نہ لٹایا۔" بے
ڈھنے لگی تھی اور سردی بھی۔ سارا وجود کانپ رہا تھا۔ واپسی کیلئے اٹھا تو ننگے پیروں نے سڑک
ں خنکی جذب کر لی تھی۔ واپس آ کر کمرے میں بچھی چارپائی پہ ڈھے گیا۔

ساٹھ پاور کا بلب اس کے عین اوپر روشن تھا۔ بادلوں کے گرجنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔
کہیں بارش برس رہی ہوگی...... اس نے سینے میں اٹکا لمبا سانس کھینچ کر کھلی کھڑکی سے باہر نظر
۔ باہر جامن کے پتے تیزی سے ہلکورے لے رہے تھے۔ رک رک کر چلتی ہوا میں روانی
تا۔

"میرا نام سعدون میراث چودھری ہے۔" وہ سوچ کر ذرا سا مسکرایا۔

"اس کی آواز کتنی خوبصورت ہے اور ہونٹوں کے برابر دائیں گال پر اس کے بھی ایک
ہے۔ بالکل میری طرح' اس کی مسکراہٹ حسنہ جیسی تھی......" وہ رک رک کر سوچتا رہا۔
"اور اس کے ماتھے کا لمس جانے کیسا ہوگا؟ میں ایک بار اپنے ہونٹوں سے اس کی پیشانی
لیتا تو...... ایک بار ہی سہی۔ اسے اپنے سینے میں بھینچ تو لیتا۔ دل میں اس کی خوشبو تو بسی رہتی۔"
سے دروازہ کھلا تھا۔ ہوا کا تیز جھونکا اندر آیا۔ وہ کانپ کر رہ گیا۔
"سردی بہت ہے کاش' کوئی ایسا ہو جو مجھے کمبل اوڑھا دے۔" آنکھ کے بیرونی گو
پر پانی کے قطرے ٹھہر سے گئے۔ کہیں درد اٹھا تو تھا جو حد سے سوا ہو رہا تھا۔

ایک دوری ہے جو برزخ میں لئے جاتی ہے
ایک مہا دکھ ہے جو سینے میں گڑا بیٹھا ہے
ایک پشیمانی جو آنکھوں سے لہو روتی ہے
ایک تڑپ روح کو کانٹوں میں پروئے جاتی ہے
ایک زیاں ہے جو میری جان لئے جاتا ہے

اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں۔ آنسوؤں کے قطرے پگھل کر اس کی کنپٹیوں
بہہ نکلے تھے۔



حسن رضا کو رات بھر ڈھنگ سے نیند نہ آئی تھی۔ ایک تو طوفان بادوباراں' اس پر ر
حسین کی باتیں۔ ایک عجیب سا وہم دل میں بیٹھ گیا تھا۔ رات کے کسی پہر بارش تو رک گئی' مگ
کی نیند وقفے وقفے سے ٹوٹتی رہی۔ صبح آنکھ کھلی تو دن خوب چڑھ آیا تھا' سورج کی روشنی آنکھ
خیرہ کئے جا رہی تھی۔ وہ سب کام چھوڑ کر ساتھ کے گھر میں بھاگا۔
اس آنگن میں رات کے طوفان کے پورے پورے آثار موجود تھے...... جامن کا درخت
کر گرا تو اپنے ساتھ واہنی دیوار بھی گرا لے گیا تھا...... آنگن کے نیم پختہ فرش پر سوکھے پتے
بارش کے پانی سے جم کر رہ گئے تھے۔ وہ چوکنا انداز میں قدم اٹھاتا کمرے میں گھسا...... بابا
چارپائی پر لیٹا تھا...... وہ چند لمحے اس کی پلکوں کو دیکھتا رہا' جن میں کوئی جنبش نہ تھی' اس نے آگے
کر ڈرتے ڈرتے ذرا سا چھوا۔
ٹھنڈا ٹھار جسم' سانسیں ندارد' مسافر جا چکا تھا۔
وہ الٹے پاؤں واپس بھاگا۔

بعد اس کا باپ اور محلے کے کچھ لوگ اس کے ساتھ تھے۔ وہ لوگ چارپائی اٹھا کر باہر
لے گئے۔ حسن رضا' اس محلے کا واحد مکین تھا جس کی اس گھر میں آمدورفت تھی اور رفاقت
ری سے علیک سلیک بھی۔ گھر کا بھیدی بھی وہی...... سوجھٹ پٹ کرسی پہ پاؤں رکھ کر
سے چابی نکال کر صندوق کھول لیا۔ کونے میں لفافے کے اندر کچھ روپے رکھے تھے۔
نے کہا تھا۔ کفن دفن میرے ہی پیسوں سے ہوگا......" اس نے وہ رقم باپ کے حوالے

ر...... ایک خط بھی کہیں پہنچانے کو کہا تھا...... وہ زرد لفافہ...... یہیں کہیں رکھا ہوگا......"
عجلت میں چیزیں کھنگالنے لگا...... پہلے صندوق...... پھر کاغذوں بھرا میز......
کمال ہے...... کہاں گیا؟" وہ لفافہ نہ ملنے پر حیران تھا۔ پھر یونہی ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے وہ
چونکا تھا۔
ارے......" وہ عجلت میں آگے بڑھا' جھکا اور کھڑکی کے عین سامنے دیوار کی جڑ میں جمع
پانی میں ڈوبے اس زرد لفافے کو دیکھنے لگا۔
رات کی آندھی و بارش اور کھلی کھڑکی...... حسن رضا کا دل تاسف سے بھر گیا۔
نی میں بری طرح بھیگے لفافے کو اٹھا کر وہ بمشکل اس میں سے خط کی تہہ نکال پایا تھا...... بے
ط برتتے ہوئے بھی کاغذ کہیں نہ کہیں سے پھٹ گیا تھا...... ایک ایک پرت کو الگ کرتے
اس نے خط سامنے میز پہ پھیلایا...... موہوم سی امید تھی کہ شاید کہیں کچھ لکھا ہوا باقی ہو...... جو
حسین کی آخری خواہش کی تکمیل میں معاون ثابت ہو سکے' مگر...... کاغذ کورا تھا...... اس پر اگر
کچھ لکھا ہوا تھا بھی تو اب نہیں تھا...... روشنائی پانی میں گھل کر سارے لفظ گنوا چکی تھی۔
"ہاں بھئی...... ملا کوئی اتا پتا......؟" کسی نے صحن سے پکارا۔
حسن رضا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بھیگے کاغذ مٹھی میں دبائے اور گولہ بنا کر کونے میں
مارے۔
"مزید انتظار نہیں کر سکتے جی...... نماز جنازہ کا اعلان کرائیں......" کسی بزرگ کی رائے......
کچھ ہی دیر میں صحن خالی ہو چکا تھا......
حسن رضا اطمینان سے باقی سب چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے باپ نے کہا تھا ہم اس
ان کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتے' یہ کہہ کر کہ رفاقت حسین چودھری ہمارا مقروض ہے۔
بہت سے کاغذات جو اس کیلئے قطعی غیر ضروری تھے۔

میز کی اوپری دراز میں کاغذوں کا ایک بڑا سا پلندہ موجود تھا۔

"کوئی کہانی لگتی ہے......" وہ دلچسپی سے کرسی پر جا بیٹھا۔

"یہ کہانی میری ہے......" "آغاز اچھا تھا......مگر آگے سے آگے کہانی بور ہوتی گئی۔ح
بددل ہو کر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس ضخیم ناول کو ایک طرف ڈالتے ہوئے اس نے دل ہی دل م
"کل ہی اسے ردی میں دے دوں گا......کافی روپے مل جائیں گے......"

اس نے کھڑے ہو کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

الماری میں رکھے سگریٹ' چائے کے سامان اور چمڑے کے بیگ کے سوا کچھ نہ تھا
چند کپڑے اور بس......

حسن رضا نے مایوسی سے سر جھٹک کر ہاتھ جھاڑے......

"صندوق میں بھی کاغذ ہی کاغذ......اور تالا یوں لگا تھا جیسے خزانے دفن ہوں......چلو
دیکھیں گے ہو سکتا ہے اس میں سے کوئی کام کی چیز نکل آئے......"

وہ ارادہ باندھتا' ٹہلتا ہوا کمرے اور پھر گھر سے بھی نکلتا چلا گیا تھا۔

بارش کی نمی سے بوجھل سوگوار سی ہوا دھیرے دھیرے کمروں اور راہداری میں چکرا رہی



ت آور

آئے ہائے' کیا کروں' خالی برتن کھڑک رہے ہیں' ٹناٹن...... ایک آنہ تک میرے پاس
موت کا فرشتہ بھی آئے تو ہاتھ جوڑ دوں اس کے سامنے کہ میاں اگلے مہینے تک کے لئے اٹھا
ذرا کمیٹی نکل آئے۔ مر مرا گئی بڑھیا' تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہوں گی۔ کہاں سے ہو گا کفن
سر جھاڑ منہ پہاڑ تو قبرستان رخصت کرنے سے رہی۔ یا اللہ تو ہی مددگار ہے۔ دو چار سانسیں
ال دے۔" وہ دادی کی چارپائی کے گرد چکراتی پھر رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے کھانا کھاتے کھاتے اچھو لگ گیا تھا۔ کھانستے کھانستے دادی کی سانس ہی اکھڑ
۔ بختاور کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دو چار دھپ لگائے' پشت سہلائی' سینہ دبایا' پانی کے
ے منہ میں ٹپکائے' سانس تو چل نکلی' لیکن آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔

گلے میں خرخراہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔ اسے موت کا غم تھا نہ خوف...... اٹھائیس سال کی
یں ماں' باپ اور بہن کی موتیں بھگتا چکی تھی۔ دل پتھر ہو گیا تھا۔

پریشانی تھی تو یہ کہ جیب میں دھیلا تک نہ تھا۔ رات گئے کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتی؟ کون
ن دفن کا انتظام کرتا۔ ایسا کوئی سگا نہ بیٹھا تھا ہاں! لعنت ملامت کرنے والے بہت سے اٹھ
کھڑے ہوتے۔

ہاں! ہوں گے کچھ دل والے بھی' سخی...... حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے والے' لیکن دادی کو
ات کا کفن پہناتی' یہ بھی اسے منظور کہاں تھا۔ عزت آن والی تھی' کوئی گیا گزرا خاندان نہ تھا اس
بس وقت چکر دے گیا تھا۔ موت کا ظالم پنجہ محبتوں اور سہاروں کو دبوچ لے گیا۔ گھر کھنڈر بن
یا' دل قبرستان۔ ہر روز کیا کیا دفن نہیں کرتی تھی۔ چھوٹی بڑی ہزاروں قبریں تھیں دل میں۔ رات

گئے ان قبروں پر آنسو نچھاور کرتی' روتی کرلاتی اور پھر صبر کا بھاری پتھر ایک ایک قبر پر رکھتی جاتی۔

آج کی رات بھی بہت ظالم تھی۔ کئی خوف' ڈر ساتھ لے کر آئی تھی۔ وہ بھی ڈٹی رہی۔ بہادری اور دلیری سے دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھے اس نے دادی کے نیم مردہ چہرے سے نظر ہٹائی تھی۔ بڑی جی داری سے اس کی لمبی لمبی سانسیں گنی تھیں۔ بڑی سفاکی سے اس کی ادھ آنکھوں کی سفیدی میں زندگی کی رمق تلاش کی تھی۔ اسے لگتا تھا موت دبے پاؤں آئے گی آہٹ کے۔ ادھر آنکھ جھپکی' ادھر وہ دادی کو دبوچ لے گئی۔

صبح کی سفیدی پھیلنے لگی تھی' جب دادی کراہیں۔

بختاور کی آنکھوں کے ساکت پپوٹوں نے حرکت کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ پشت دروازے کی چوکھٹ کھب سی گئی تھی۔ پیر سُن اور بے جان۔

دادی نے کراہ کر اسے پکارا' تب اس کے منجمد وجود میں حرکت ہوئی۔ دونوں پیروں پر جسم کا بوجھ ڈالتے ہوئے وہ تفاخر سے دادی کی طرف بڑھی تھی۔ گویا موت کو شکست خود اسی نے ہو۔

''دادی پانی پی لو۔'' دادی کو سہارے سے پانی پلاتے ہوئے اس کے لہجے میں تھکاوٹ شائبہ تک نہ تھا۔



''کمال کرتی ہو خالہ تم بھی' لڑکا خوبصورت ہو...... لڑکا خوبصورت ہو۔ ارے اپنی لڑکی کو بھی دیکھو' آنکھیں چھوٹی' ناک موٹی' ٹھگنا سا قد اور دبتا ہوا رنگ۔ کہاں سے ڈھونڈ لاؤں میں اس لئے خوبصورت سا لڑکا اور لڑکے بھی تو حور پری مانگتے ہیں۔'' ایک ہفتے میں پانچواں چکر لگا تھا مگر رضیہ کی اماں نے لڑکے کی تصویر دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھائی تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''حد کر دی تم نے بھی بختاور! ہزاروں میں ایک ہے میری رضیہ' تیری ہی آنکھوں میں ٹیڑ ہے جو اس کی ناک موٹی اور آنکھیں چھوٹی لگتی ہیں۔ ہونہہ! آ گئی کہیں سے بڑی آنکھوں والی۔ ہمیں نہیں پسند یہ بھینس جیسے دیدے۔ جیسے اللہ نے دیئے' ہمیں منظور...... بڑی آنکھیں ہوں یا چھوٹی' بس نظر آنا چاہیے۔''

رضیہ کی اماں کے تو پتنگے ہی لگ گئے تھے۔ بختاور کہہ کر پچھتائی۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں ٹالا۔ بکل ماری اور گھر سے نکل آئی۔ راستے میں آئے ہر پتھر کو ٹھوکر سے اڑایا۔ چپل میں پھنسے پیر دھول مٹی میں اٹ گئے۔ پتا نہیں کس پر غصہ آ رہا تھا۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی درختوں کی چھاؤں

چلی گئی۔

اللہ جانے کیوں مرنے لگے ہیں لوگ گوری چٹی چمڑی پر۔ اچھا خاصا کماؤ لڑکا بھی انہیں کہاں سے لاؤں ان کے من چاہے کنوارے' اکلوتے' نندوں کا سرے سے وجود نہ ہو۔ مرحومہ ہونا ضروری' دیور' جیٹھ کی بھی کوئی بخ نہ ہو۔ گویا لڑکا آسمان سے گرا ہو یا زمین سے قسم کے رشتے سے پاک۔'' شیشم کے درختوں کی لمبی قطار سے پرے نہر بہتی تھی۔ وہ سڑک سے ہٹ کر درختوں کا سہارا لیتی نہر کنارے آ بیٹھی۔

چلو بھر پانی کے چھپاکے منہ پر مارے' کلی کی اور چپل اتار کر گندے سندے پیر کانوں کان نہر میں اتار دیئے۔ نجانے کتنی دیر یونہی خالی الذہن بیٹھی نہر کے پانی پر اترتے درختوں کے تکتی رہی۔ کبھی کبھار آہ سی لبوں سے نکل جاتی۔

''کیسی تھکن سی اترنے لگی ہے بدن میں۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ جوانی میں بڑھاپا دیکھ لیا ہم سارا جسم ٹھنڈا ٹھار' نہ جذبوں کی گرمائش باقی' نہ خواہش کی چنگاری جی کو جلاتی ہے۔ بس نے نکیل ڈال رکھی ہے۔ سدھائے جانور کی طرح گھسیٹتی جا رہی ہے۔ کھینچتی جا رہی ہے۔ اپنی مرضی' نہ چاہت۔ جدھر موڑ دیا مڑ گئے۔ جدھر روک دیا' کھڑے ہو گئے۔ واہ رے مالک! کیسی ہے ہماری' کیا کیا لکھ دیا نصیبوں میں۔ لڑکیاں اس عمر میں اپنی شادی کے سپنے دیکھتی ہیں۔ روں کے سنجوگ کی فکر میں ہلکان ہوئے پھرتے ہیں۔ فلاں لڑکا' فلاں لڑکی...... اس کی جوڑی کے ساتھ...... لنڈوروں کے گھر بس گئے' بیوہ سہاگنیں ہو گئیں' کوری ہتھیلیوں پر مہندی اتر آئی' آنکھوں میں سپنے سج گئے۔ ہمارے ہاتھ کیا آیا؟

چند سو روپے' کریپ کا دوپٹہ' سلک کا سوٹ...... کچھ بکسوں میں دھرے رہ گئے' کچھ اونے کہ بڑھیا کا دوا دارو ہو گیا۔

ارے......'' بڑھیا کا خیال آتے ہی وہ چونکی۔

کتنا وقت بتا دیا میں نے۔'' ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے وہ پچھتائی۔

کس کے آسرے پر چھوڑ کر بیٹھی ہوں اس بے چاری کو' نہ کوئی پانی پلانے والا' نہ حال پوچھنے دن بھی اللہ جانے وقت نکال پائی ہو گی یا نہیں۔ ہا...... ہائے...... اللہ کی مار تجھ پر بختاور! اسی کی آہ لگے گی' روز قیامت کان کھینچے جائیں گے۔ اللہ توبہ...... لیکن میں بھی کیا کروں' نکلنا ہے۔ دو وقت کی روٹی بھی تو کھانی ہے۔'' وہ پھر سے افسردہ ہو گئی۔

پاؤں پانی سے واپس کھینچے۔ دھل دھلا کر نکھر سے گئے تھے۔ ململ کے دوپٹے سے خوب رگڑ

رگڑ کر صاف کیے۔ چپل پہنی اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی سڑک پر آ گئی۔



بھوک سے پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی دادی کو آواز لگائی۔ آواز ابھری، سکون کا سانس لیا۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو نیم تاریکی میں دادی کی آنکھیں اسے د ہی جگمگانے لگیں۔

"کچھ کھایا ہے؟" وہ دادی پر جھک گئی۔ اس نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اثبات م سر ہلایا۔

پڑوسن کھانے پینے کو کچھ دے گئی تھی۔ اس نے چارپائی کے ساتھ رکھے میز پر پڑے برتن د کر اندازہ لگایا۔ دل ہی دل میں ممنون ہوئی۔ دادی کی طرف سے دل کو تسلی ہوئی تو اپنی پیٹ پوجا فکر ہوئی۔ بے تاب قدموں سے باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ بتی جلائی، چنگیر ڈھونڈی، خالی چڑاتی ہوئی ہانڈی، دیگچی دھلی دھلائی، جیسے صبح چھوڑ گئی تھی۔

"ہائے۔" وہ تھک کر پیڑھی پر گر گئی۔ کون سا جنم دینے والی بیٹھی تھی یہاں جو پکا کر رکھتی، پھر امید تھی کیونکہ پڑوسن کبھی کبھار دال ہانڈی چڑھا جایا کرتی تھی۔ جن دنوں زیادہ فارغ ہوتی بختاور پر تر کھا لیتی تھی۔ ان دنوں وہ خود امید سے تھی، کہاں اس کے لئے اتنا تردد کرتی۔ وہ کتنی ہی دیر گھٹنوں منہ چھپا کر روتی رہی۔

آٹا گوندھو، ہانڈی پکاؤ پھر لقمہ منہ میں ڈالو۔ پکی پکائی کبھی نصیب نہ ہوئی مجھ جنم جلی کو۔ سپا سپاٹ زندگی میں کبھی کبھی اتنے روڑے، پتھر آ جاتے ہیں جن پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ تب یونہی کیا کرتی تھی۔ جی بھر کے روتی، گالیاں کوسنے دیتی۔ کبھی زمانے کو، کبھی اپنے جنم دے کر جانے والوں کو، کبھی پیدا کرنے والے کو، کبھی کراہتی، سسکتی دادی کو، کبھی پڑوسن کو...... مہینوں بعد بھر کر دل کا غبار نکالتی۔

آج بھی یونہی کیا، روئی، خوب روئی پھر تھک ہار کر خود ہی چپ ہو رہی۔ دو گھونٹ پانی آگ جلائی، مٹھی بھر دال پکنے کے لئے رکھی، چار روٹیوں کا آٹا گوندھا۔ جب تک دال پکتی دا میں جھاڑو لگانے لگی تھی۔ گھر میں پھیلا سناٹا جھاڑو کی شڑاپ شڑاپ کے ساتھ سمٹتا چلا گیا تھا۔

"ٹھک...... ٹھک......" کسی نے عجلت میں دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اپنے خیالوں میں الجھی طرح چونکی اور پھر جھاڑو چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازہ کھولتے ہی سولہ سالہ بلو نے جس بدمعاشی سے اسے آنکھ ماری، وہ کھول اٹھی تھی۔

ے! تم تو پورے مسٹنڈے بن گئے ہو بے غیرت۔" کان سے پکڑ کر اندر کھینچتے ہوئے اس دار چپت اس کی کھوپڑی پر رسید کی تھی۔

د...... ہو...... ہو مر گئے...... لوہے کا پنجہ لگوا لیا ہے کیا، سر توڑ کر رکھ دیا۔" سر سہلاتے نے دودھ والا برتن بختاور کی طرف بڑھایا۔

ر کر منہ نہیں توڑ دیا، آنکھ نہیں پھوڑ دی۔" دودھ کا برتن ہاتھ میں لے کر وہ باورچی خانے ڑھی۔

ے واہ! شرم نہیں آئے گی توڑ پھوڑ کرتے۔ اتنی دور سے آتا ہوں میں۔"

کھ مارنے؟" اس کے بھرپور طنز پر وہ کھسیانا ہو گیا۔

ودھ پہنچانے ورنہ تو بیسیوں گاہک ہیں آس پاس۔ ابا تو راضی ہی نہیں ہوتا تھا، وہ تو میرا ڈ پاؤ بھر دودھ کے لئے اپنی جان پر ظلم کرتا ہوں۔ پیدل آتا ہوں، پیدل جاتا ہوں۔ تیری م آتا ہے ورنہ......" چارپائی پر آڑا ترچھا لیٹا وہ ایک بار پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔

رچی خانے سے باہر آتی بختاور کی ہنسی چھوٹ گئی۔

بڑا ڈھیٹ ہے تو، ایک سے ایک پھنے خان کو تیر کی طرح سیدھا کر دیا لیکن تیری زبان قابو میں

"میں تو پورے کا پورا قابو میں آ سکتا ہوں، مٹھی میں سما سکتا ہوں، تجھے گر ہی نہیں آتے۔"

"دفع دور...... لے پکڑ اپنا برتن اور دو منٹ میں نظروں سے دور ہو جا۔ سچ مچ کا غصہ آ گیا اپنا نشان بھی نہ ملے گا یہاں۔" بلو کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے دودھ کا خالی برتن اس کے ہاتھ تھمایا اور پھر باہر کی طرف دھکیل دیا۔

"ہا...... ہا...... قدر نہ جانی بے قدرا۔" وہ بڑی افسردگی سے گنگناتا ہوا دہلیز پار کر گیا تھا۔



"کیا نام ہے آپ کا؟"

"بختاور۔"

"کس کے ساتھ آئی ہیں؟"

"نہیں، دادی بیمار ہے، رات بھر کھانسی نہیں رکتی، اسی کے لئے دوا لکھوانے آئی ہوں۔" ساتھ خاتون کے ہر سوال کا جواب بڑے تحمل سے دیتے ہوئے وہ اس کی اور اپنی وقت گزاری کا سامان تھی۔

"کیا کرتی ہو؟"

"کپڑے سیتی ہوں اور رشتے کرواتی ہوں۔" اس کی آخری بات پر سوال کرتی خاتو
تعجب سے اسے دیکھا۔

"سنہری آنکھوں والا سادہ' صاف ستھرا چہرہ' کوئی چالاکی' مکاری یا عیاری نظر نہ آ رہ
عموماً رشتہ کروانے والی مائیوں کے چہرے پر ثبت ہو چکی ہوتی ہے۔ بختاور نے برابر بیٹھی خا
بولتی بند ہونے پر گردن گھما کر دیکھا تو اس پر نظریں جمائے بیٹھی خاتون خجل سی ہو کر ہنس دیں

"میں دیکھ رہی تھی کہ اتنی کم عمری میں بھی رشتے کروائے جا سکتے ہیں۔"

"مجبوری ہو تو انسان کیا نہیں کر سکتا۔" اس کا لہجہ پختہ اور انداز میں لاپروائی تھی۔

"کب سے کر رہی ہو یہ کام؟"

"دو چار سال ہو گئے۔ کپڑے سی کر گھر گھر دینے جایا کرتی تھی۔ ہر گھر کے مسئلے، مس
آ گاہ' ہر پریشانی سے واقفیت۔ محلے کی ایک خاتون بیٹی کے رشتے کے لئے پریشان تھیں' دو
کے رشتے کے لئے' ذرا کوشش کی' لڑکے کی ماں کو لڑکی کے گھر کا راستہ دکھا دیا' بات بن گئی'
ہی چل نکلا۔" وہ دادی کے نسخے کی تہہ کو دباتے ہوئے بتاتی چلی گئی۔

"ہوں' سنو! کبھی میری طرف بھی چکر لگاؤ نا! یہ میرا کارڈ ہے اس پر گھر کا پتہ درج ہ
بختاور کی نظریں کارڈ پر پھسلتی چلی گئیں۔ سر اٹھایا تو آنکھوں میں حیرانی تھی۔ "پوش عل
خاتون اس معمولی کلینک میں۔"

"میری ملازمہ ایڈمٹ ہے یہاں' بس اسی کو دیکھنے چلی آئی تھی۔ تم آنا ضرور میں ا
کے لئے سخت پریشان ہوں۔ تفصیل تو گھر آنے پر ہی بتاؤں گی' لیکن اتنا کہہ دوں' اس کا گھر
تمہیں منہ مانگا انعام دوں گی۔" وہ پرس سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ بختاور ہاتھ میں پکڑ
درج پتا دہراتی رہی۔

کوئی ایک' ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ دوائیوں کا شاپر تھامے گھر میں داخل ہوئی تو پڑوسن آ
اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"شکر ہے کہ تم آ گئیں۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو رہا تھا' مجھے گھر جا کر
پکانا ہے۔"

"بہت شکریہ آپا!" خدا جانتا ہے تمہاری وجہ سے مجھے دادی کی طرف سے کوئی فکر نہیں
وہ ان کے ساتھ ہی دروازے تک چلی آئی۔

تو ٹھیک ہے' لیکن میں کہتی ہوں کہ کچھ اپنے لئے بھی سوچو' دادی کی طبیعت ان دنوں کچھ
لتی۔ اللہ بھلی کرے لیکن بات سوچنے کی ہے' دادی کے بعد تمہارا کیا بنے گا؟" آپا فرخندہ
اس کا کلیجہ ہی نوچ ڈالا تھا۔

یسی باتیں مت کرو آپا! میرا دماغ پہلے ہی گھوم رہا ہے۔" اس نے الجھ کر قدرے تلخی سے آپا
ہ بس طویل سانس لے کر سر جھٹکتی دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔

کیا سوچوں اپنے بارے میں اور پھر میرے سوچنے سے ہوگا کیا؟" وہ تھکی ماندی کمرے میں

ل جائے کوئی آنکھوں کا اندھا' لولا لنگڑا' دو بول نکاح کے پڑھ لوں۔ آدھی عمر دادی کی سیوا
ئی' آدھی اس کی خدمت میں کاٹ لوں گی اور بھلا کس کی نظر پڑے گی مجھ پر۔" وہ بڑبڑاتے
ادی کو سہارا دے کر اٹھانے لگی۔ دادی نے خمار آلود آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر اشارتاً

'کیا ہوا......؟"

"کچھ نہیں دادی! سب ٹھیک ہے اور جو نہیں ٹھیک' وہ بھی ہو جائے گا۔ بس تو دھوکا مت دینا'
بعد تیرا ہی آسرا ہے۔" اس نے دادی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔
ساعت سے محروم دادی اس کے ہلتے لبوں سے مفہوم اخذ کرتی رہی۔ کچھ سمجھی' کچھ نہ سمجھی۔ بس
ئف و ناتواں بازو اٹھا کر اسے سمیٹ لینے کی کمزور سی کوشش کرنے لگی تھی۔ اس نے بھی جیسے
کر دادی کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔



ن بلو! ایک کام کرے گا؟"

کون سا کام؟"

'یہ سوٹ لیتا جا' راستے میں عارفہ کے گھر دے دینا۔"

'نہ میرے پاس ٹیم نہیں۔ آج ذرا جلدی جانا ہے۔" پھولا پھولا سا چہرہ' خفا خفا سا لہجہ۔
ہاتھ پشت پر باندھے وہ ذرا سا رخ موڑے کھڑا تھا۔

"کیا ہوا ہے تجھے؟" بختاور نے اس کے سامنے آتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں' برتن خالی کر کے مجھے جلدی دو۔" وہ ایک بار پھر رخ موڑ گیا' بختاور کو غصہ آ گیا۔

"لے پکڑ۔" چار پائی سے خالی برتن اٹھا کر اس نے بلو کو کھینچ مارا تھا۔

"ارے......ارے......آ......آ......" بچاتے بچاتے بھی وہ خود کو تو نہ بچا سکا البتہ برتن
سے بچا لیا تھا۔

اپنے کاندھے کو مسلتے ہوئے اس نے تیز نظروں سے بختاور کو گھورا۔ جواباً اس کے
تیوریوں کا جال پھیلے دیکھا تو دانت نکوسنے لگا۔

"توبہ......توبہ......اتنا غصہ......"

"دیکھ بلو! مجھے تنگ کیا تو تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔" اس کا مزاج بہت چڑچڑا
تھا۔ بلو کی فضول حرکتیں خون کھولانے لگتی تھیں۔

"تنگ کہاں کر رہا ہوں، میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری نظر ٹھیک ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا ہے میری نظر کو۔"

"میرا مطلب ہے ٹھیک سے دکھائی تو دیتا ہے نا۔"

وہ اس فضول سے سوال پر غصیلی نظروں سے اسے گھورتی رہی۔

"اچھا بتا ذرا، کتنی انگلیاں......"

اب کے وہ تڑخ گئی تھی۔

"چبا ڈالوں گی تیری یہ سوکھی سڑی تین انگلیاں، بس بھاگ نکل اب، مسخرہ کہیں کا
بینائی سے تجھے کیا لینا دینا۔ بھلے سے دو کے چار اور تین کے چھ نظر آتے ہوں۔" اس کے
کسیلے لہجے پر بلو نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر پاؤں پٹختا ہوا دروازے سے باہر
وہ منہ ہی منہ میں گالیاں بکتی چارپائی پر آ بیٹھی۔

"پتا نہیں کبھی کبھار کیوں اتنا ستانے لگتا ہے، چھٹانک بھر کا لڑکا ہے اور......" دروازہ کھٹا
کھلا تھا۔

"اس نے سر اٹھا کر دیکھا، بلو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔

"نیا سوٹ سلوایا تھا، آج پہلے دن پہن کر سیدھا یہاں آیا تھا، خوشبو لگائی، بالوں میں
یار دوست کہہ رہے تھے بلو! آج تو پہچانا نہیں جا رہا۔ بے بے نے جب تک سات مرچیں
دیں، گھر سے نکلنے نہیں دیا اور تجھے تو اتنا بھی محسوس نہ ہوا کہ بلو آج بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔
بہت کٹھور ہے۔" وہ رنجیدگی سے کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

بختاور چند لمحے دروازے کی خالی چوکھٹ کو گھورتی رہی پھر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پچھتائی۔

"اے ہائے، کیسی غرق ہوتی ہوں اپنی سوچوں میں، ذرا خبر نہ ہوئی۔ بیچارہ بلو......

تھا اور میں نادان...... بچے کی خوشی کو محسوس ہی نہ کر سکی۔" اسے افسوس ہونے لگا۔

چل خیر، کل آئے گا تو منا لوں گی۔" خود کو تسلی دیتے ہوئے وہ چارپائی پر چت لیٹ گئی،
پر اٹھائیں۔
سمان بالکل خالی، نہ کوئی پتنگ ڈولتی نظر آئی، نہ کسی پرندے نے قلابازی کھائی۔ عجیب اجاڑ
منظر تھا۔ اس نے اکتا کر کروٹ بدلی، تب ہی ایکدم دادی کا خیال آیا۔
لین زدہ نیم تاریک سے کمرے میں لیٹی ایک بیمار عورت، بے بس، مجبور، چلنے پھرنے سے
ٹھنے سے محروم......
سو کر اٹھتی تو جاگنے لگتی، جاگتے جاگتے تھک جاتی تو پھر سو جاتی۔ اس حبس زدہ کمرے میں جہاں
سوتے ہوئے بختاور کا دم گھٹتا تھا، بوڑھی دادی نجانے کیسے دن سے رات اور رات سے دن
تی تھی۔

"ہزار بار چھت کی کڑیاں گنتی ہو گی، دروازے سے آتی روشنی کی لکیروں سے حساب رکھتی ہو
نے والے لمحوں کا، جانے والی گھڑیوں کا۔ ہائے ہائے...... کیا کیا سوچ نہ آتی ہو گی دل میں۔
نہ یاد کرتی ہو گی تنہائی میں۔ بڑھاپا عذاب بن کر اترا ہے اس پر اور میں ایسی نادان، کم عقل،
دو وقت کا کھانا کھلا کر سمجھتی ہوں حق ادا ہو گیا۔ لعنت ہو تجھ پر بخت آور۔ اپنی عاقبت
نے کے لئے بھی اس کا احساس نہ کیا۔ مرنے سے پہلے ہی قبر میں ڈال دیا اس کو۔" کوئی
سا لہرایا تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ تیزی سے کمرے کی طرف بھاگی۔ دادی جاگ رہی تھی،
نظروں سے اسے دیکھا۔

"دادی! باہر چل کر بیٹھیں۔"

دادی نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ ہمت کر کے جیسے تیسے دادی کو باہر لے آئی۔ چارپائی پر
دادی نہانے سے ڈرتی تھی۔ اس نے گرم پانی کر کے ہاتھ پاؤں دھو ڈالے۔ تولیہ گیلا کر کے
صاف کیا، بالوں میں کنگھی کی، دادی پوپلے منہ کے ساتھ مسکراتی رہی۔ تب اس نے دادی کے
ش زدہ ہاتھوں کو چومتے ہوئے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"معاف کر دینا دادی! بھول ہو گئی۔"

دادی کی زبان عرصہ ہوا بند ہو چکی تھی۔ اشاروں سے اسے ایسا کرنے سے منع کرنے لگیں۔
نے گاؤ تکیہ کے سہارے دادی کو لٹایا اور خود بھی ساتھ ہی جڑ کر لیٹ گئی۔ دادی کھلی فضا کا لطف
شہتوت پر کھیلتی چڑیوں کو دیکھ کر مسکراتی رہی اور بختاور نجانے دکھ کے زیر اثر اس کے بوڑھے

چہرے کو ترحم آمیز نظروں سے دیکھتی رہی۔
"کاش...... میرے پاس بہت سے روپے ہوتے' دادی کو مرغی کی یخنی پلاتی' پھلوں
دیتی' ایک دم صحت مند کر دیتی اور اب...... اب تو دلیہ اور کھچڑی ہی سب سے بڑی عیاشی ہے
ختم تو کھچڑی شروع' کھچڑی ختم تو دلیہ حاضر۔" اس کی پلکیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔



"دیکھ بلو! اس پوری دنیا میں کتنے لوگ بستے ہیں' اربوں' کھربوں تو ہوں گے نا' لیکن
دنیا میں کون کون ہے؟ ایک دادی' ایک یہ پڑوسن اور ایک تو...... بس تین لوگوں کو کائنات بنا
ہوں' یہی تین لوگ میری جاگیر ہیں' یہی میرا مال ومتاع۔ اب بتا تو کیوں ڈاکہ ڈال رہا ہے
مال پر' میری جاگیر چھین کر کہاں کا راجہ بن بیٹھے گا تو' کیوں اتنے دنوں سے گھر کی دہلیز
کی۔"
آج وہ کھینچ کھانچ کر بلو کو گھر لائی تھی۔ شام کا وقت تھا' سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا
کہ ابھی تک زبان کو تالا لگائے بیٹھا تھا۔
"سن بلو! کیا مجھے جانتا نہیں' کن کن بکھیڑوں میں پھنسی ہوں۔ ایک پیر گھر میں ہے
گھر سے باہر۔ نہ دماغ ٹھکانے رہتا ہے' نہ عقل اور تو نے اتنی چھوٹی سی بات کو دل پہ لے لیا
دنوں سے گھر کی دہلیز پار نہیں کی' خوامخواہ پریشان کیا۔ مجھے اور کیا کم بکھیڑے ہیں جو......"
"ہک ہا...... اتنی لمبی تقریر کرنے سے بہتر تھا کوئی ہلکا پھلکا گیت گا لیتی۔" آجا مور
تیرا انتظار ہے۔" یا پھر وہ......
"روٹھے ہو تم' تم کو کیسے مناؤں پیا......"
بلو بولا تو بختاور کو سر پیٹنے پر مجبور کر گیا۔
"ہوتا کوئی میرے جیسا تو ضرور گاتی' اب کیا کل کے بچوں کو بالما اور پیا بناتی پھر
اس کے سر پر چپت لگاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"نائمہ کی بات پکی ہو گئی ہے۔ آج مٹھائی دے کر گئی تھی۔ صبح سے تیرے لئے سنبھ
ہے۔ آج بھی گھر نہیں آتے تو اٹھا کر کوڑے میں ڈال دیتی۔" برآمدے میں میز پر دھری پلی
کپڑا ہٹا کر اس کی طرف چلی آئی تھی۔
"ہیں! سچ...... اتنا پیار کرتی ہے مجھ سے۔" بلو کی آنکھوں میں شرارت چمکی تو وہ ذرا
دی۔

ھلے وقتوں میں بیاہی جاتی تو آج تیرے جیسا ایک بیٹا ہوتا میرا۔ تو میری حسرتوں کے
لر جوان ہوا ہے۔ نادان! پیار کیوں نہ کروں گی تجھ سے۔"
وں ہوں...... ساری مٹھائی کڑوی کر دی۔ چل برتن میں ڈال دے۔ گھر جا کر کھا لوں گا۔
تیرا خیال ہی اچھا ہو گا ظالم۔" خالص فلمی انداز...... بختاور کا منہ بن گیا۔
ہر وقت کالے کی دکان میں گھسا رہتا ہے اسی لئے دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ کیبل اور وی
کارستانی...... تیرے ابا سے شکایت لگا کر تیری تو درگت بنواتی ہوں میں۔" اس نے دھمکانا
اثر کہاں پر تھا' ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔
ابا سے ڈرے وہ...... جس نے ابا کی مار نہ کھائی ہو۔ اپنا تو روز کا کام ہے یہ...... لیکن اگر تو
پاہتی ہے تو سو بسم اللہ' اکھیاں دروازے پر ٹانگ دوں گا تیرے آنے تک۔ دیدار کے لئے
تی ہیں بے چاریاں۔"
بختاور اس درجہ ڈھٹائی پر حیرت سے کھلی آنکھوں کے ساتھ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔



راستہ کافی طویل تھا مگر بالآخر کٹ ہی گیا۔ جس وقت وہ اس گھر کے گیٹ پر پہنچی سورج کی
کرنیں نارنجی رنگ میں گھل مل کر اپنا وجود کھو چکی تھیں۔ درختوں' پودوں پر سجے نیم مردہ پھول'
تہ رفتہ سر اٹھانے لگے تھے۔ ملازمہ اسے برآمدے میں رکھی کرسی پر بٹھا کر خود اندر چلی گئی۔
بعد وہی ملازمہ اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئی اور خود پھر غائب ہو گئی۔
صاف ستھرا گھر...... پرسکون' خوابناک ماحول' اسے نیند کے جھونکے آنے لگے۔
"آہ...... ہا...... ہوتی میں کوئی ننھی منی سی...... الہڑ...... لاپروا' ابھی کھٹ سے قالین پر گرتی اور
ہتی۔ ایسے گھروں میں نیند بھی کتنے مزے کی آتی ہو گی۔" صوفے پر پاؤں پھیلا کر لیٹ
واہش دل میں مچل سی گئی۔
ن دبیز قالین پر رکھے' چپل میں پھنسے گندے سندے پیروں پر نظر پڑی تو دل چاہا توڑ کر
کے نیچے کھسکا دے۔ دھول' مٹی میں اٹے پیر اسے سخت برے لگتے تھے۔ سنبھل سنبھل کر
ئی' مگر پھر بھی کچی پکی سڑک پر چلنا ہوتا تھا۔ آج بھی پیدل ہی یہاں تک آئی تھی۔ رکشہ
لے جتنے روپے مانگ رہے تھے' اسے آدھا کیا' ایک گھنٹہ بھی چلنا پڑتا تو پیدل ہی آتی۔
سنو......!" دروازے سے اندر آتی ملازمہ کو اس نے پکارا۔
غسل خانہ کس طرف ہے؟"

ملازمہ بغیر کچھ کہے دائیں طرف کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے باہر نکل گئی۔ غس
خانے میں جاتے ہی اس نے چھپاک چھپاک پانی ڈال کر منہ ہاتھ دھویا' پھر پیر رگڑے' دوپٹے
ہاتھ منہ پونچھتی باہر آئی' مگر پھر ٹھٹک کر رک گئی۔

"ہائیں......" یہ تو کوئی نئی ہی دنیا تھی۔ رنگ برنگی...... مہکی مہکی...... روشن سی...... دو چھو
بیڈ...... ان پر رنگ برنگی جھالروں والی آسمانی رنگ کی چادریں بچھی تھیں۔ بے شمار کھلونے...... کو
تکیے کے پاس اوندھا پڑا ہے۔ کوئی دیوار سے لٹک رہا ہے' یہ بڑا سا بھالو ایک کونے میں روٹھا سا بی
تھا اور انواع واقسام کے کھلونے۔ جن پر اس کی نظر ہی نہیں ٹکی۔ اس نے گھومتی گھامتی نظروں کو
کر کے ان دو بچیوں پہ ٹکایا جو اس وقت کمرے میں موجود تھیں۔ ایک چھوٹی سی تھی۔ اپنے سا
کسٹرڈ کا پیالہ رکھے خود سے کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چمچہ بھر کے پیالے میں سے نکلتا اور منہ
جانے سے پہلے خالی...... فراک ساری کی ساری کسٹرڈ میں چھپی جا رہی تھی۔

بختاور بے اختیار ہنس دی۔ تب ہی بڑی بچی نے سر اٹھایا۔ بمشکل سات آٹھ سال عمر تھی
چھوٹی کو اس کی حرکتوں پر روکنے ٹوکنے کے بجائے بس اسے ٹکر ٹکر دیکھتی جا رہی تھی۔

"ارے واہ...... یہ تم لوگوں کا کمرہ ہے...... بڑا پیارا' بہت ہی خوبصورت......" وہ ستا
نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"ارے یوں گم صم اور چپ چاپ کیوں بیٹھی ہو؟ ہنسو' کھیلو' گیت گاؤ......" اس نے قریب
روئی کے گالوں سا نرم بھالو اٹھا کر بڑی بچی کی طرف پھینکا' جو حیران حیران آنکھوں سے اسے
رہی تھی۔

"ارے یہ گڑیا کتنی خوبصورت ہے......" اس نے دروازے کے پیچھے جھولتی گڑیا کو زور
جھولا دیا۔

"مہنگی ہو گی۔ ہاں بھئی! پیسے کے کھیل ہیں۔ سینکڑوں میں آئی ہو گی۔ ایک ہمارا بچپن
گڑیوں' پٹولوں کے کپڑے سیتے سیتے ہلکان ہو جاتے تھے۔ محلے میں گھوم کر رنگ برنگی کترنیں
کرتے۔ کئی دن' کئی راتوں کی محنت' گڑیا بن کر سامنے آتی تو پھٹی پھٹی آنکھیں' پھیلے ہوئے ہو
ایک کالی لکیر' ناک کی جگہ' ہی...... ہی...... کیسی مزے کی صورت بنتی تھی۔ دیکھ دیکھ کر خود ہی
کرتے۔ تم لوگوں نے کہاں دیکھی ہوں گی کپڑوں کی گڑیا! میرے پاس رکھی ہیں دو چار
پیاروں کی نشانیاں...... ایک اماں کے ہاتھوں سے بنی۔ ایک دادی کے ہاتھوں' ایک میں نے
چھوٹی نے مل کر بنائی تھی۔"

میں گھستے ہی جیسے بچپن لوٹ آیا تھا۔ ساری کلفت دور...... الجھنیں' پریشانیاں ختم......
پٹر پٹر بولتے دل پل بھر کے لیے اداس سی کیفیت میں گھرا تو وہ یکلخت ہی خاموش ہو
کر دیکھا۔ چھوٹی کسٹرڈ کی مٹھیاں بھر بھر کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ بڑی ابھی تک حیرت
جھ میں آنے والی کیفیت چہرے پر طاری کیے اسے دیکھ رہی تھی۔

ئے ہائے...... ارے......" وہ ایک دم چھوٹی کی طرف لپکی۔ کسٹرڈ کا پیالہ سامنے سے ہٹایا
دروازہ کھلا...... وہ چونکی۔
مرد اندر داخل ہو رہا تھا۔ شدید حیرت کا تاثر ابھرا...... بالکل ویسا ہی جیسا کچھ لمحے قبل
ے چہرے پر دکھائی دیا تھا۔

نہ ہو...... یہ اسی بچی کا باپ ہے۔" اس نے اندازہ لگایا۔
ارے کپڑے خراب کر لیے ہیں۔ کسی سے کہہ کر بدلوا دیجیے۔" وہ آرام سے کہہ کر جس
ے آئی تھی' اسی دروازے سے باہر نکل آئی۔ پہلے باتھ روم پھر ڈرائنگ روم۔ جہاں بیٹھی
ھ روم کے دروازے پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھیں۔



راز قد' گوری رنگت' گہرے بھورے رنگ کی خوبصورت آنکھیں' چہرے پر مجموعی تاثر نرمی اور
ا تھا۔ اخروٹی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس میمونہ بیگم کے بھائی کا اس نے کوئی تیسری بار
تھا۔

سب توقع دونوں بیٹیاں میمونہ کے بھائی اسفند کی ہی تھیں۔ بڑی اس وقت لاؤنج میں کشن
ہوم ورک کرتے ہوئے بختاور کو صاف نظر آ رہی تھی۔ دوسری ڈیڑھ دو سالہ بچی باپ کی گود
اس کی کلائی سے بندھی گھڑی سے کھیل رہی تھی۔ نہا کر کپڑے بدل چکی تھی اور پہلے سے
گئی تھی۔

مونہ بچیوں کی مرحومہ ماں کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ اس کی بیماری سے
نک کے واقعات......

تنا عرصہ گزرا' انتہائی پیار اور محبت میں...... لوگ دیکھتے تو رشک کرتے تھے دونوں پر...... چاند
کی جوڑی تھی۔ اسفند تو راضی ہی نہیں ہوتا تھا' مگر بچیوں کا معاملہ ہے' آج نہیں تو کل ماں کی
محسوس کرنے لگیں گی۔ قسمت کا چکر ہے سارا...... ورنہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ......" اسفند
چہرے کے ساتھ بہت خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بچی کو کسی ننھی گڑیا کی طرح بانہوں کے

حلقے میں لیے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

بختاور نے ایک نظر اسے باہر جاتے دیکھا اور دوبارہ میمونہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تم نے گھر بار دیکھ لیا ہے۔ اتنا اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ ہمارا تعلق کس طبقے سے ہے۔
گھرانوں سے ملنا ملانا ہے۔ یہاں تو بات کرتے ہی لوگ منہ بنانے لگتے ہیں۔ کھاتے
گھرانوں کی لڑکیوں کو کوئی مجبوری آڑے نہیں آتی' جو ایسے رشتوں کے لئے رضا مند ہوں اس
تمہیں دیکھتے ہی خیال آیا کہ کیوں نہ تم......؟"

"میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ رشتہ ایسا دکھاؤں گی کہ
کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

"ہاں بس...... کام ذرا جلدی ہو جائے اور لڑکی ایسی ہو جو بچیوں کو سینے سے لگا کر رکھے
اپنا گھر سعودیہ میں ہے' چند ماہ کے لئے آئی ہوں۔ میاں کے فون پر فون آرہے ہیں کہ یہاں
نہیں' لیکن میں چاہتی ہوں کہ اب کے یہ کام کر کے ہی جاؤں۔"

ان شاء اللہ' اللہ بہتر کرے گا۔ میں اب چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میمونہ نے بھی
اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"آؤ' میں تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔" انہوں نے جاتے جاتے سائیڈ ٹیبل پر رکھے پرس
ہاتھ ڈالا اور پھر اس کے ساتھ باہر آتے ہوئے ہزار روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لو...... آنے جانے کا کرایہ رکھو...... کام ہو جائے تو......"

"رہنے دیجئے' آپ کی خواہش پوری ہو گئی تو جو دل میں آئے دے دیجئے گا۔" اس
حسب معمول اپنا اصول زبان تک لانے کے لئے منہ کھولا' لیکن ہزار روپے کا کڑکتا سا نوٹ
پر چپ کی گرہ لگا گیا۔

"دلیہ...... کھچڑی...... کھچڑی...... دلیہ۔"

"فروٹ' جوس' یخنی۔"

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے نوٹ تھام لیا۔

"میں بہت جلد دوبارہ آؤں گی۔" اسے اپنی آواز میں تازگی اور کھنک سی محسوس ہوئی تھی
وہ گیٹ کی طرف آتے ہوئے اپنی مٹھی سے جھانکتے سبز نوٹ کو دیکھ کر چپکے چپکے مسکرا رہی



"کون کہتا ہے پیسے سے خوشیاں نہیں خریدی جا سکتیں۔ یہ دیکھو ذرا دادی کو' پوپلے منہ سے

نکڑا رکھتے ہی کیسے مسکرانے لگی ہے۔ جہاں دو وقت بددلی سے کھاتی تھی اب چار وقت
نے لگی ہے' سرہانے رنگ برنگے پھل پڑے ہیں۔ حلق خشک ہونے لگے تو جوس کا گھونٹ بھر
بیٹھے کو دل نہ چاہے تو نمکین بسکٹ حاضر' آج دوپہر میں اتنی گہری نیند سوئی کہ دنیا جہاں کی
تھی ورنہ تو کبھی ادھر کروٹ' کبھی ادھر......"

ل کی بات کہنے کا موقع اسے کبھی کبھار ہی ملتا تھا اور پھر اس کا تھا بھی کون......؟ لے دے کر
اسی سے حال دل کہنے لگی۔ ایسا نہیں کہ اس نے ہزار کا نوٹ پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ بس
اس بات کی تھی کہ آج دادی پر خوب خرج کیا تھا۔

"اپنے لئے کیا لائی ہو؟" بلو سارے ضروری کام بھلائے اس کے پاس بیٹھا تھا۔

"کچھ بھی نہیں...... اس کام میں ہاتھ ڈالا ہی دادی کے لئے ہے۔ بڑے لوگ ہیں' سوچا دادی
یہ پانی چلتا رہے گا ورنہ گھر اتنی دور ہے کہ پچاس روپے آنے اور پچاس جانے میں لگتے ہیں'
ہیں بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ پیدل آئی' پیدل گئی' سو روپیہ بچا لیا۔" وہ اپنی چالاکی پر کھل کر مسکرائی

نے ایک نظر اسے دیکھ کر سر جھکا لیا۔

وہ بس کبھی کبھار ہی اسے مغموم ہوتے دیکھتا تھا ورنہ تو یونہی مطمئن' شاداں و فرحاں نظر آتی
چہرے پہ مسکراہٹ ہمہ وقت نظر آتی۔ زبان یونہی تیز تیز چلتی رہتی تھی' لیکن اندر کتنے غم اس
ں رکھے تھے' وہ بھی ڈھکی چھپی بات تو نہ تھی۔

نجانے کیوں اس کی مشقت بھری زندگی کے بارے میں سوچتا' اداس سا ہو بیٹھا تھا۔

کیا ہوا ہے تجھے؟" بلو کا جھکا ہوا سر بختاور نے اوپر اٹھایا۔

کب تک یونہی زندگی گزرے گی تیری۔"

جب تک تو بڑا نہیں ہو جاتا......" وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی طرف سے
یہ ایسی شرارت کے اظہار پر بلو گڑبڑا گیا تھا۔

کیا...... کیا مطلب ہے تیرا......؟"

اس کے چہرے پہ پھیلتی ہلکی ہلکی سرخی پر وہ بے اختیار ہی قہقہہ لگا کر ہنس دی تھی۔

"ارے تو بڑا ہو گا نا تو کسی اچھی لڑکی کا تجھ سے بیاہ کرا کے تجھے اپنے پاس لے آؤں گی۔
گھر میں رونق ہو جائے گی۔ پھر کمائے گا تو...... گھر سنبھالے گی وہ...... اور میں کروں گی خوب
......"

"لو باتیں سن لو اس کی......" وہ سر جھٹکتا اپنی جگہ سے اٹھا۔

"چلتا ہوں اب......"

"ہاں یہ پیسے بھی لیتا جا...... مہینہ ختم ہوئے بھی آٹھ دس دن ہو گئے اب تو مگر کیا کروں...... مجبور ہوں' پیسے نہ ہوں تب اور بات...... مگر جب ہاتھ میں آئیں تو قرض اتارنے میں دیر نہیں لگاتی۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے گرہ کھول کر پیسے اسے تھمائے۔ تو وہ بغیر کچھ کہے پیسے تھام بالوں میں انگلیاں چلاتا باہر کی طرف چل دیا تھا۔



"بھئی! میں بات کہوں گی صاف' سیدھی' سچی اور کھری...... ہماری بیٹی دونوں بچیوں کو سنبھا تو لے گی' مگر ان کے لئے آپ کو ایک ملازمہ تو ضرور ہی رکھوا کر دینی پڑے گی۔ اور باقی رہی شا منگنی کی بات تو بھئی! ہم تو کریں گے دھوم دھام سے۔ اور جواباً آپ کو بھی ایسا ہی کرنا پڑے ہاں ٹھیک ہے' آپ کا بھائی اپنے ارمان پورے کر چکا ہے مگر بھئی...... ہماری بیٹی کی تو پہلی پہلی خ ہو گی......"

میمونہ کی نگاہوں میں نور النساء کے لئے پسندیدگی کے تاثرات پڑھتے ہی اس کی ماں نے کھٹ کھٹ فرمائشیں شروع کیں' اس پر میمونہ اور بختاور دونوں ہی ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

بختاور نے خفت محسوس کرتے ہوئے پہلو بدلا۔ ساتھ ہی ساتھ میمونہ کو کن انکھیوں سے دیکھا

"یہ نوری کی ماں کو کیا ہو گیا ہے؟" اس نے دانت کچکچائے' لب کاٹے مگر نوری کی ماں نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھی' تب اس نے ٹھک سے بوتل میز پر رکھی اور سیدھی ہو بیٹھی۔

"اے خالہ! کن خیالوں میں کھوئی ہو تم...... بیگم صاحبہ کے ہاں پورے وقت کی نوکرانی ہاتھ باندھے بچیوں کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔"

"ہو گی...... اللہ اور دے مگر پہلے سے بات کر لیں تو اچھا ہوتا ہے۔ کل کلاں یہ نہ ہو نوکر غائب...... اور میری بچی بے چاری ہلکان ہوتی پھرے' ان دونوں کے پیچھے۔"

"لاحول ولا...... تو تمہارا کیا خیال ہے خالہ! نور النساء کو ڈیکوریشن پیس بنا کر رکھیں گے ہاتھ ہلائے گی نہ پیر...... نہ بھئی! پہلے سے بتا چکی ہوں کہ شادی کرنی ہی بچیوں کے لیے ہے۔ نہیں منظور تو نہ سہی......" وہ لمحوں میں اٹھی اور میمونہ کو اشارہ کرتے ہوئے باہر کی جانب چل دی۔

"ارے...... ارے...... رکو تو...... سنو......" نور النساء کی ماں گھبرا اٹھی' مگر بختاور بھی پیچھے دیکھنے والوں میں سے نہ تھی۔ ڈرائنگ روم سے نکلی تو باہر کھڑی گاڑی تک ہی جا کر رکی تھی۔

"بہت جلدی کی تم نے بھاگنے میں......" میمونہ ہانپتی کانپتی اس کے پیچھے لپکیں۔

نے دیں جی...... دوغلے لوگ ہیں۔ میرے سامنے پہلے سے ایسی بات کی ہوتی تو آپ کو کی زحمت ہی نہ کرتی۔ شروع سے ہی نیت اچھی نہ ہو تو انجام کا تو بس اللہ ہی حافظ ی گاڑی سے باہر کے مناظر میں کھو گئی' میمونہ تفکرات میں گھری کولتار کی سڑک پر نظریں رہی۔



لہ جانے' لوگوں کے دل پتھر ہو گئے ہیں یا خوف خدا ختم ہو گیا ہے۔ یہ پھول سی دو بچیاں ں کھٹک رہی ہیں۔ بندہ پوچھے کل کو اپنے بچے پیدا کریں گی تو کیا انہیں بھی دادی' پھوپھی' کے حوالے کریں گی کہ ہم سے سنبھالے نہیں جاتے۔" وہ خوب غصے میں بھری بیٹھی تھی۔

ج ایک والدہ محترمہ اس شرط پر اس کے ساتھ اسفند یار کی طرف آئی تھیں کہ پہلے میں لڑکا ں پھر لڑکی ان کو دکھاؤں گی۔

یمونہ نے اس بات پر کوئی اعتراض نہ کیا تو وہ اسے ساتھ لے کر اگلی شام ہی میمونہ کے ہاں ۔ اسفند سے دروازے پر ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ اس نے لڑکی کی ماں کو کہنی ماری۔

فند عجلت میں تھے۔ نہا دھو کر باہر جانے کو تیار' بس سلام دعا کر کے باہر کی طرف بڑھ گئے۔

زر' بلیک ٹی شرٹ میں دراز قامت اسفند کو دیکھ کر لڑکی کی ماں خوش ہو گئیں۔

یمونہ سے نہایت خوشگوار انداز میں ملیں۔ بات چیت کی۔ چائے وائے پی' اپنے ہاں آنے کی ں مگر جاتے جاتے شوشہ چھوڑ گئیں۔

"لڑکا ہمیں پسند ہے۔ بچیاں بھی سلجھی ہوئی' تمیز دار ہیں۔ ہم شوق سے لڑکی دینے کو تیار ہیں' تیلے پن کی دراڑ کبھی نہیں مٹتی۔ کل کو ہماری بچی ماں بن گئی تو نہ ختم ہونے والے فساد اٹھ ے ہوں گے۔ تم بچیوں کی پھوپھی ہو۔ ان کو چاہتی ہو...... وہ بھی تمہارا خیال کرتی ہیں تو انہیں اتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ تمہارے بھی بچے ہیں ان کے ساتھ گھل مل جائیں گی۔" میمونہ ٹکر ٹکر کا منہ دیکھتی رہیں۔ بختاور ایک بار پھر بے لحاظ ہو گئی۔

"خدا سلامت رکھے بچیوں کے باپ کو...... وہ کیوں دوسروں کے در پہ جا پڑیں' بھلے کوئی کتنا کیوں نہ ہو؟ باپ کی آنکھ کا تارہ ہیں' اس کے دل کا چین وسکون' وہ تو گھڑی بھر کے لئے اسے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ آپ کن خیالوں میں ہیں...... سنبھال رکھئے اپنی بچی اپنے ہمیں رشتوں کی کمی نہیں۔" بختاور کے تیور دیکھ کر وہ فوراً پینترا بدل گئیں۔

"میں تو بس یونہی...... ورنہ ہمیں کیا اعتراض...... ہم بھی بچیوں والے......" ان کی تان ہی

بدل گئی......مگر میمونہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بختاور کو اپنی ناپسندیدگی کے بارے میں آ
اور خود کسی کام کا بہانا کر کے وہاں سے اٹھ گئیں۔

چند لمحوں بعد وہ بھی واپس ہولی۔ خاتون کو ان کے گھر کی راہ دکھائی اور خود لوگوں کے
رویوں پر جلتے گھر آ گئی۔



رات بھر تیز آندھی نے سونے نہیں دیا۔ پچھلے برآمدے میں ٹین کی چھت ڈال رکھی ت
نجانے کون کون سی چیزیں اس پر برس برس کر قیامت ڈھاتی رہیں۔ ہوا' بند دروازے کو توڑنے
لئے اپنا سر ٹکراتی رہی۔ پھنکارتے ہوئے گرد درزوں سے گزر کر کمرے میں گھٹن کا سامان کر
رہی۔

وہ سرتاپا چادر اوڑھے' آنکھیں میچے اپنی جگہ ساکت وصامت لیٹی تھی۔

شام کو میلے میلے آسمان پر پھیلی زردی کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ موسم کے تیور در
نہیں۔ دادی کے کھانے پینے کا سامان کمرے میں رکھا اور سرشام کمرے میں گھس گئی۔

دادی نے حیرت سے اسے دیکھا پھر اشارہ کیا۔

"کپڑے کیوں نہیں سی رہی......؟ مشین بند کیوں پڑی ہے؟"

"بس یونہی......دل نہیں چاہ رہا......صبح' جلدی اٹھ جاؤں گی۔"

"سر میں درد تو نہیں...... خیریت تو ہے نا......؟" دادی اپنی جگہ ایک دم پریشان ہو گئی' وہ م
دی۔

"ٹھیک ہوں بالکل......ہٹی کٹی...... کچھ نہیں ہوا......" اس نے خوب ان کی تسلی کرائی۔ دو
ادھر ادھر کی باتیں سنائیں......لطیفے' چٹکلے' بچپن کی بہت سی باتیں' یادیں' دادی کے ساتھ ل
دہرانے لگی۔ پھر بتایا۔

آج کل بڑی اچھی خاتون سے ملاقات ہوئی ہے۔ اس کے بھائی کے لئے رشتہ ڈھونڈ
ہوں۔ کام ہو گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ دل کی سخی بھی ہیں اور اللہ نے بھی کوئی کمی
رکھی۔ بس دادی دعا کرو...... کہ......" تب ہی احساس ہوا اس کی آواز آندھی کے شور تلے دب
ہے۔

بھاگ کر دروازہ بند کیا' دادی کی طرف پلٹی۔ انہوں نے اشارہ کیا۔

"اب نیند آ رہی ہے۔"

چارپائی تک آئی' تب ہی بجلی چلی گئی۔ اندھیرے سے تو جان جاتی تھی۔ چھلانگ مار کر
آئی اور اپنی چادر میں پناہ ڈھونڈی۔ پھنکارتی' ٹھوکریں مارتی ہوا...... در و دیوار کو ہلائے
تھی۔ وہ لرزتی کانپتی دل ہی دل میں آیت' درود پڑھتی رہی۔

کمرے میں حبس اور گھٹن کی فراوانی' نیند کا آنا محال تھا۔ بہت سا وقت بیت گیا۔ کبھی چادر
سر نکالا بھی تو کچھ سجھائی نہ دیا۔

گھپ اندھیرا کہ سب سمتیں گڈمڈ ہو گئیں۔ دروازہ کدھر ہے؟ کھڑکی کہاں ہے؟ الماری
طرف ہے؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا' دوبارہ خیمے میں گھس گئی مزید وقت بیتا......
آندھی کا زور ٹوٹا...... ٹین کی چھت پہ ٹوٹتی قیامت کا شور تھما' گیلی مٹی کی مخصوص خوشبو آس
وس ہونے لگی۔ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی' تب اس کی پلکیں آہستہ آہستہ بند ہوئیں۔



صبح آنکھ کھلی تو کمرہ روشنی سے بھر چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ گردن گھما کر دیکھا۔ دادی
ہی تھی۔ وہ آنکھیں ملتی چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ دروازہ کھولا' صحن کا فرش گرد وغبار سے اٹا
تب ہی احساس ہوا دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ وہ دوپٹہ اوڑھتی بھاگ کر دروازے تک
جانے کون تھا دروازے پر......اور کب سے دستک ہو رہی تھی۔

عجلت میں دروازے کی کنڈی گرائی' سامنے پڑوسن کھڑی تھی۔ وہ قدرے شرمندہ سی ہو کر
ف ہٹ گئی۔

"ارے سوئی ہوئی تھی کیا؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہی بولیں تو بختاور کھسیانی سی ہو کر ہنس

"ہاں بس رات کو دیر سے نیند آئی تھی اس لیے۔ آپ بیٹھیں۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتی کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ بختاور نے جلدی جلدی منہ پہ پانی کے
مارے...... چائے کا پانی رکھنے کے لئے باورچی خانے کی طرف بڑھی جب آپا فرخندہ نے
ے سے آواز دی۔

"آ رہی ہوں......" اس نے جلدی سے چولہا جلایا۔ دیگچی اوپر رکھی۔ پھر عجلت میں باہر نکلی ہی
جب آپا فرخندہ حواس باختہ سی کمرے سے باہر نکلیں۔

"بختاور!"

"کیا ہوا آپا؟" اس نے حیرت سے ان کی اڑی اڑی رنگت کو دیکھا۔

"بختاور......وہ دادی۔"

"دادی...... ہاں وہ سو......" ایک دم سے کوئی الارم سا بجا تھا۔ دل و دماغ میں۔ بات ا
چھوڑ کر اس نے ناسمجھی کے عالم میں آپا فرخندہ کو دیکھا۔

"کیا ہوا......؟" ہزار وسوسے' اندیشے جاگے۔

آپا فرخندہ کچھ کہنے کی کوشش میں صرف ہونٹ ہلا کر رہ گئیں۔

"دادی......" وہ بلند آواز سے پکارتی کمرے کی طرف بھاگی' مگر آپا فرخندہ نے ایک دم
بازو سے تھام کر روک دیا تھا۔

"بختاور کمرے میں کوئی نہیں ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں......؟؟" بختاور نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

وہ کچھ سمجھ نہ پائی...... اور جب سمجھی تو بے یقینی کے عالم میں انہیں ایک طرف دھکیلتی کمر
طرف بھاگی۔ جس کی فضا میں موت' سرد اور بے جان پنجے گاڑ کر وہاں سے جا چکی تھی۔



"بس گھڑی بھر کے لئے آنکھ لگی تھی اور وار ہو گیا۔ ذرا سی بے خبری میں مات کھا گئی۔
کے اندھیرے میں لوٹ لی گئی۔ تسلی' دلاسہ' آسرا سب چھن گیا۔ ایسی کنگال ہوئی میں کہ بیا
باہر' بڑھیا بھی ایک نمبر کی چالاک...... دغا دے گئی...... فریبی' دھوکے باز' میرا کچھ خیال نہ کیا
کے حوالے کر گئی؟ سب دروازے' کھڑکیاں بند تھے۔ کدھر سے موت آئی اور کدھر کو دبوچ۔
کوئی جائے...... ارے بلا کر لائے میرے پاس کیا بچا ہے؟"

اس کا پورا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ بند ہوئی آنکھوں سے آنسو تھے کہ زار و قطا
چلے جا رہے تھے۔ حواس قابو میں نہ تھے۔ ذرا سی دیر کے لئے بے ہوشی طاری ہو جاتی' پھر آ
تو یہ ہی واویلا' یہ ہی آہ وزاری...... نجانے کیا الٹا سیدھا بول رہی تھی۔

آپا فرخندہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے بوکھلائے جا رہی تھیں۔ ہاتھوں میں ک
چہرے پر ہوائیاں......

بختاور کی حالت سنبھلنے میں نہ آ رہی تھی۔

آج تیسرا دن تھا اور بخار کی شدت جوں کی توں۔ ڈاکٹر آتا...... دوائی دیتا...... چلا جا
کسی نے مشورہ دیا۔ "ہسپتال لے جاؤ۔"

مشورے پر عمل درآمد فرخندہ کے لئے مشکل......

وہاں کون رہے گا اس کے پاس۔" خود ان کی گود میں ایک ڈیڑھ ماہ کا بچہ تھا۔ بھاگ دوڑ
بس کی بات نہ تھی۔

تو کیا بے یار و مددگار ہسپتال کے بستر پر چھوڑ آؤں...... نرسوں کے رحم و کرم پر...... نہ بابا!
نے کیسا سلوک کریں؟ اور پھر ہسپتال کا خرچہ' دوا' دارو' ناممکن......" وہ دل و جان سے اس کے
کرتی رہیں۔

جتنا بس میں تھا' خدمت کی۔ رات کو دو بچوں سمیت اسی کے گھر میں آ کر سو رہتیں۔
بلو صبح و شام آتا۔ کئی کئی گھنٹے بیٹھا رہتا۔ آنکھوں میں ہزار وسوسے' لبوں پہ چپ کی مہر' بس
نکھوں سے اسے ادھر سے ادھر سر ٹکراتے' بڑبڑاتے' کرلاتے دیکھتا رہتا۔ پھر آنکھوں میں
موٹے آنسو لئے واپس لوٹ جاتا۔

چوتھے روز اس کا بخار ٹوٹا...... آنکھ کھلی تو سارا جسم پسینے میں شرابور تھا' اٹھ کر بیٹھ گئی۔
دماغ سن تھا...... آنکھیں بالکل خالی اور ویران...... باہم پیوست ہونٹ بالکل خشک تھے۔ چند
پاٹ نگاہوں سے فرخندہ اور بلو کو دیکھتی رہی۔

دفعتاً نگاہ کمرے کے دروازے پر جا پڑی۔

ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بجلی کوندی...... بھولی بسری بات یاد آ گئی۔ بڑی بے چارگی سے بلو کو
پھر مدد طلب نظروں سے آپا فرخندہ کو دیکھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سینے میں بھینچ لیا۔

"فکر کیوں کرتی ہے...... ہم سب ہیں نا......"

وہ بڑی خاموشی سے ان کا بازو دبوچے آنسو بہانے لگی تھی۔



نیم غنودگی کے عالم میں تھی جب کسی نے زور سے اسے ہلایا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں
لیں۔ شام کا وقت تھا' وہ کمرے میں دادی کی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس چارپائی پر دادی نے
برس قبضہ جمائے رکھا تھا اور اب وہی دادی' چارپائی کے برابر کھڑی اشارے کر رہی تھیں۔

"چل اٹھ میری چارپائی سے...... کم بخت' ڈائن...... ورنہ ابھی تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔" سر تا پا
لباس میں لپٹی دادی اس کی طرف جھکی تو وہ چیخ مار کر چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ زور کا چکر آیا۔
کر دروازے سے ٹکرائی' دروازے کا پٹ تھام کر خود کو سہارا دیا۔ پھر ڈرتے ڈرتے دادی کی
دیکھا جو بڑے آرام سے چارپائی پر چت لیٹی تھی اور ہاتھ سینے پہ باندھ کر اسے دیکھ دیکھ کر
رانے لگی تھی۔

مارے خوف کے اس کی گھگھی سی بندھ گئی تھی۔ پیر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔ برا
پار کر کے صحن میں آتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ دادی دروازے میں کھڑی اسے اشارے کر کے
طرف بلا رہی تھی۔ بختاور کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکلنے لگیں۔ لپک کر صحن پار کیا۔ ٹھک
بیرونی دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ سر بے تحاشا گھوم رہا تھا۔ دیوار کا سہارا لے کر وہیں بیٹھ
چاہتی تھی۔ جب راہ چلتے آدمی نے رک کر پوچھ لیا۔

''خیریت تو ہے باجی......!'' اس کی پیلی پڑتی رنگت اور کپکپاتے ہونٹ نظر انداز کیے
کے قابل نہ تھے۔ وہ چند لمحے خوفزدہ نظروں سے گھر کے دروازے کو دیکھتی رہی۔ آدمی کن
اچکاتا' کوئی جواب نہ پا کر اپنی راہ پر چل دیا۔

تب ہی دروازے کی جھریوں میں سے کوئی سفید سی چیز لہرائی۔ وہ کرنٹ کھا کر اٹھی اور
ہوئی گلی سے باہر نکل آئی۔

آگے پکی سڑک شروع ہو جاتی تھی۔ وہ گرتی پڑتی وہاں سے دور چلے جانے کی تگ و
تھی۔ اسے ڈر تھا' دادی کے ہاتھ لگ گئی تو اس کے پتلے' لمبے ہاتھ گردن سے دبوچ کر قبر
تک گھسیٹ لے جائیں گے۔

''مر کے بھی چین نہیں لیا بڑھیا نے...... مجھے مارے بنا قرار کہاں آئے گا؟'' اسے زا
رونا آنے لگا۔

''خدا غارت کرے ایسی زندگی کو۔ کسی کی آئی مجھے آئے۔ زمین کا بوجھ' کٹی پتنگ' را
پتھر......'' نجانے کیا الٹا سیدھا سوچتے ہوئے۔ ناک کی سیدھ میں چلتی رہی' دیوانوں کی طرح
نجانے کس جگہ موڑ کاٹتے ہوئے کسی گاڑی کے بریک زور سے چرچرائے۔

وہ گھبرا کر پلٹنا چاہتی تھی' جب ایک گاڑی رکتے رکتے بھی ہولے سے اس سے ٹکرا گ
بے جان ہوتی ٹانگوں نے مزید سہارا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گری تو حواس باخ
وہیں بیچ سڑک پہ بیٹھ کر چیخ چیخ کر رو دی تھی۔ گاڑی چلانے والا شخص گڑبڑا کر نیچے اتر آیا۔
وقت ایک اور گاڑی نزدیک آ رکی۔ اس میں سے ایک خاتون اتر کر تیزی سے اس کی
بڑھیں۔

''خیریت تو ہے......'' انہوں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''معلوم نہیں' اچانک ہی گاڑی کے سامنے آ گئیں...... میں تو......'' وہ اجنبی خود بھی
تھا۔

یا ہوا......؟ چوٹ تو نہیں آئی......'' وہ خاتون ہمدردانہ انداز میں پوچھتے ہوئے اس پر
پھر اس کا چہرہ دیکھتے ہی دم بخود رہ گئیں۔

ائی کسمپرسی اور غربت کے باوجود جو رکھ رکھاؤ اس کی شخصیت میں دکھائی دیتا تھا وہ آج
انتہائی لاچاری اور بے بسی کے عالم میں اردگرد سے بیگانہ وہ بس روئے چلی جا رہی تھی۔
بمشکل سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور سیدھی گھر لے آئیں۔ راستے میں انہوں نے کچھ
کہنے کی زحمت نہ کی تھی۔ بس گاہے بہ گاہے اس پر نظر ڈالتی رہیں۔ اس نے روتے روتے
یٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا تھا۔ چھوٹے سے گیراج میں گاڑی روکنے کے بعد وہ اسے سہارا
ندر لے آئیں۔

گاڑی لگنے سے چوٹ تو نہیں آئی؟''

نہیں......''

'طبیعت خراب ہے کیا؟''

'پتا نہیں......'' بے زار سا نحیف لہجہ' میمونہ بس اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئیں۔

''بخار ہے شاید......؟'' میمونہ نے پھر خدشہ ظاہر کیا۔

''پتا نہیں' لیکن میرا سر پھٹ جائے گا آج......'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے صوفے پر گر
ا۔

میزاب حیران پریشان سی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

میمونہ نے گولیاں منگوا کر اس کی ہتھیلی پہ رکھیں۔ پانی کا گلاس دیا۔ وہ دو گھونٹ میں گولیاں نگل
وفے پہ آڑھی ترچھی سی لیٹ گئی۔

''خیریت تو ہے...... کیا ہوا ہے تمہیں؟'' میمونہ سامنے صوفے پہ بیٹھی تعجب سے اسے دیکھ رہی
ا مگر اس کے حواس بحال نہ تھے۔ یونہی لمبے لمبے سانس لیتی آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ ڈیڑھ دو
ؤ یونہی بیت گئے۔

ہلے سر درد کم ہوا پھر ہلکی سی غنودگی چھائی۔ آنکھ کھلی تو حرارت بھی کم ہو چکی تھی۔
مونہ اس دوران دونوں بچیوں کو نہلا دھلا کر' کپڑے تبدیل کروا کر وہیں لے آئی تھیں۔ بڑی
ں مصروف تھی۔ چھوٹی یونہی پنسل' ربڑ سے کھیل رہی تھی۔

ہ چند لمحے یونہی ان دونوں پر نظریں گاڑھے بیٹھی رہی پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ آنکھ ہی نہیں'
ا بیدار ہو گیا تھا۔ اطراف میں نگاہ دوڑائی اور شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ کسی غیر کے گھر میں

ایسی بے تکلفی پہلے کبھی نہیں برتی تھی۔ دل ہی دل میں خود کو کوسا...... تب ہی میمونہ آ گئیں۔ نا
اور چائے سمیت......

"میں نے سوچا تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔" ان کے ہمدردانہ لہجے پر دل بھر آیا۔ چا
کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے خشک لبوں کو زبان پھیر کر تر کیا۔

"چند روز پہلے دادی مر گئی۔ دنیا میں اس کے علاوہ اور کوئی میرا نہیں تھا۔ اور...... میں
یہ نہیں سوچا تھا کہ اماں' ابا کے بعد دادی بھی مجھے تنہا چھوڑ کر جا سکتی ہے۔"

"اوہ......" میمونہ کی نگاہوں میں اس کے لئے رحم کے جذبات امڈ آئے تھے۔

"دکھ کی بات یہ...... کہ میں رات بھر برابر چارپائی پر سوتی رہی' مجھے خبر بھی نہ ہوئی...... ا
معلوم نہیں رات کے کس پہر......" ہاتھوں میں لرزش سی اتر آئی تو اس نے کپ میز پر رکھ دیا۔

"میں اتنی کمزور تو نہیں تھی۔ پھر بھی مجھے احساس ہے آپ جس حالت میں مجھے یہاں
آئی ہیں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار......"

"نہیں ایسی بات مت کرو...... میں نے کوئی ایسا بڑا کام نہیں کیا۔"

دروازے سے کوئی اندر آیا تھا' اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اسفند کو سامنے پا کر فوراً ا
کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں اب' کافی دیر ہو گئی۔"

"ایسے کیسے جاؤ گی' چلو میں چھوڑ آتی ہوں......"

بختاور نے انہیں منع کرنا چاہا مگر وہ اس سے قبل ہی اسفند کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

"بچیوں کا خیال رکھنا...... بختاور کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں اسے گھر تک چھوڑ کر آتی ہوں۔" ا

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ میمونہ سمیت گھر میں داخل ہوئی تو آپا فرخندہ کی ہوائیاں اڑی ہوئی
تھیں۔ اسے دیکھ کر جہاں سکون کا سانس لیا' وہیں غصے سے برس پڑیں۔

"کہاں چلی گئی تھیں......؟ ذرا دیر کو میں گھر گئی ہوں۔ واپس آئی تو تم غائب...... میری تو
جان سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔" وہ جواب دیئے بغیر صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ گئی۔ تب فرخندہ نے
میمونہ کو دیکھا۔

"میں بختاور کو چھوڑنے آئی تھی۔" انہوں نے ہلکے سے مسکرا کر وضاحت کی۔

"اچھا...... اچھا...... میں تو بہت فکر مند ہو رہی تھی۔ دادی کی موت کا بہت صدمہ لیا ہے۔
اتنے دن سے بیمار ہے۔ میں اپنا گھر بار' بال بچے چھوڑے تب سے یہیں ہوں' آپ اس کی......؟"

بس یونہی...... جان پہچان ہے۔ کوئی خاص رشتہ نہیں......" میمونہ نے کہا اور پھر فرخندہ کی
دعوت پر شکریہ کہتے ہوئے واپس لوٹ گئیں۔

◆❖◆

"تو نے تو ڈرا کر رکھ دیا تھا۔ قسم سے اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو میں تجھ سے پہلے جان دے دیتا۔"
تندرست ہوتا دیکھ کر پھر سے شوخ ہونے لگا تھا۔ وہ افسردگی سے مسکرا دی۔

"کوئی کسی کے لئے جان نہیں دیتا بلو...... سب کو اپنے لیے جینا پڑتا ہے۔ چاہے کوئی مرے
جئے۔"

"ارے واہ...... نہیں ملا ہو گا کوئی میرے جیسا...... جب ہی ایسی باتیں کر رہی ہے۔ ذرا
تو کر...... ابھی چھت پہ چڑھ کر کود جاؤں یا چلتی گاڑی کے سامنے لیٹ جاؤں۔"

"تیرے منہ میں خاک! بدبخت...... تیرے جیسے عاشق نامراد ہی رہتے ہیں۔" کیا زور کا
اجڑا تھا آپا فرخندہ نے' وہ اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔

"یہ کیا بات ہوئی......؟" اسے سخت برا لگا تھا آپ فرخندہ کا اس معاملے میں بولنا۔

"بات یہ ہوئی کہ اتنے بڑے بڑے کام کرنے سے اچھا ہے' جا کر اپنے ابا کے دودھ دہی
کے برتن دھلوا دے۔ کچھ اس کا بھلا ہو جائے گا۔ داڑھی مونچھ آ جائے تو بھلے عشق بھگارتے
چل اٹھ یہاں سے۔" انہوں نے اچھا خاصا ڈانٹ کر اٹھا دیا تھا۔

"واہ آپا فرخندہ! تو نے تو بے عزتی خراب کر دی ہے۔ اچھا پھر چلتا ہوں۔ دیکھ لے۔ تیرے
پے سے کیسا بدنام ہو کر نکالا گیا ہوں۔" اس نے بختاور سے شکایت کی۔ وہ چپ چاپ مسکراتی

بلو کے جاتے ہی فرخندہ رازدارانہ انداز میں اس کے قریب ہوئیں۔ "بختاور! کل جو عورت
تھی تمہارے ساتھ...... وہ......؟"

بختاور کو معلوم تھا...... کل سے تجسس دبا رہی ہیں اسی لئے تفصیل سے ان کے متعلق بتا دیا۔ آپا
سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

"چھوٹی بہن کے رشتے کی وجہ سے سخت پریشانی ہے۔ شادی کے قابل ہے مگر...... اچھا رشتہ
بہت مشکل ہے' یہ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ تم ادھر بات چلاؤ نا۔"

"ذمہ داری...... ایک اور ذمہ داری...... تیری عمر بیت گئی بختاور! یہ ذمہ داریاں نبھاتے۔ پر
ذمہ لینے والا کوئی نہ آیا۔" بختاور خاموش نگاہوں سے فرخندہ آپا کے چہرے پہ پھیلی پریشانی کو

دیکھنے لگی۔

''کیسی خوش نصیب ہوگی وہ لڑکی...... اس کی ماں' اس کا باپ' بھائی' سب پریشان ہیں کے لئے اور آپا فرخندہ یہاں تفکرات میں گھری بیٹھی ہے۔ اس سے اتنی دور ہونے کے حالانکہ وہ ان سب رشتوں کے ساتھ ایک گھر میں ہے۔ محفوظ و مامون......''

''آپ پریشان مت ہوں آپا...... میں بات کروں گی۔'' اس نے تسلی آمیز لہجے میں فرخندہ ممنونیت سے اسے دیکھتے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔''

رات کافی سے زیادہ بیت چکی تھی اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور......

''کیا کروں......؟ کیا نہ کروں؟ یا اللہ نیند کیوں نہیں آجاتی۔'' وہ اکتا کر اٹھ بیٹھی۔ بڑی چارگی سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ عجیب سی تنہائی' ویرا وحشت' برآمدوں اور کمروں میں کفن پہنے گھومتی پھرتی دادی...... بیرونی دیواروں کے اوپر جھانکتے ہوئے سر' چھت پہ ٹہلتے ہوئے قدموں کی چاپ' چارپائی کے نیچے چھپی نادیدہ بلائیں۔ تو جیسے سینے میں دھڑکنا ہی بھول گیا یا پھر شاید سینے میں تھا ہی نہیں۔ اس نے لمبی سانس لے کر کی گھٹن کو کم کرنا چاہا مگر فضا میں آکسیجن ختم ہونے کے قریب تھی۔

''آیۃ الکرسی پڑھ......'' پیچھے سے دادی نے جھاڑا۔ وہ شدومد سے آیۃ الکرسی کا ورد کر لگی۔

دادی کے بعد آپا فرخندہ کے بغیر آج اس کی پہلی رات تھی۔ آپا فرخندہ کی ساس فوت ہو تھیں گاؤں میں' سارا کا سارا گھر ادھر روانہ ہو گیا۔ جاتے جاتے آپا فرخندہ نے کہا۔

''اماں سیانی کو پیغام بھجوا دیا ہے۔ رات کو تمہارے پاس آکر سو جائے گی۔''

مگر نجانے کیا ہوا؟ اماں سیانی کو پیغام نہیں ملا۔ یا شاید وہ آنا بھول گئی۔ بہت سا انتظار کر کے بعد اس نے دروازے کی کنڈی چڑھا لی۔ پڑوس میں ایک نک چڑھا دکاندار رہتا تھا۔ جس کبھی اپنی بیوی کو اس سے تعلقات بڑھانے کی اجازت نہ دی تھی۔ خود البتہ وہ اس کام کے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس وقت اس سے مدد مانگنا ایک مستقل مصیبت کو گلے لگانا تھا۔ سو چپکی بیٹھی رہ اماں سیانی کی آمد کا انتظار رفتہ رفتہ دم توڑ گیا تھا۔ رات گہری...... اندھیری...... ہو چلی تھی

''کس کس کا در کھٹکھٹاؤں گی۔ یہ تو روز کا رونا ہے۔'' اس نے چارا تار پھینکی' چارپائی سے اتر آئی۔ نلکے کے پاس گئی' بالٹی میں بھرا پانی ٹھنڈا ٹھار تھا۔ اس نے چلو بھر بھر کے منہ پ

پھر یونہی صحن میں ٹہلنے لگی۔

یسے گزرے گی ساری زندگی؟'' اندھیرے میں یہ بڑے بڑے سوال آنکھوں کے سامنے گے تھے۔

وف' ڈر' بے یقینی' مشقت...... کس کس سے دامن چھڑاؤں گی۔ کہاں تک بھاگوں گی' میں تھکنے لگی......'' وہ سوچے چلی گئی۔

کون خاموشی میں ڈوبے' محفوظ' تاریکی میں گھرے ہنستے بستے گھر۔

یہ گھروں میں رہتی عورتیں۔ کیا سکون کی زندگی گزارتی ہوں گی۔ باپ' بھائی' شوہر' بیٹے' ایک وٹا' دوسرا مل گیا۔ آنسو پونچھنے کو ماں...... دکھ درد کہنے کو بہنیں اور میں جنم جلی...... تنہا کی نجانے کس نیکی کے عوض ملتے ہوں گے یہ رشتے ناتے......'' اس نے اداسی سے اپنا سر یہ رکھ دیا اور دور آسمان کو تکنے لگی۔

''ان ہی ستاروں کے پیچھے وہ ایک ذات چھپی بیٹھی ہے۔ جو سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ سن رہی جو بخش سکتی ہے۔ مالا مال کر سکتی ہے۔'' قرب کا گہرا احساس دل میں جاگا۔

''پروردگار...... تیرے خزانے میں کوئی کمی نہیں۔ مجھ غریب کو نواز دے۔ بخش دے' ایک گھر دے۔ ہنستا بستا' خوشیوں بھرا' پرسکون گھر دے دے۔ عزت کی زندگی چاہئے' اور کچھ بھی نہیں۔

......'' زندگی میں پہلی بار وہ شکوہ نہیں کر رہی تھی۔ مانگ رہی تھی۔ دل سے عاجزی سے...... اور......

رات رفتہ رفتہ اس کے آنسوؤں سے بھیگتی جا رہی تھی۔



ایک رشتہ لائی ہوں۔

نام بختاور۔

عمر...... اٹھائیس سال

شکل وصورت' قابل قبول......

زمانے کی بے پناہ سختیوں کے باوجود روح کا گداز قائم ہے۔

حالات کی کرختگی نے دل کی نرمی کو ہڑپ نہیں کیا۔

غربت کے بے رحم پنجوں نے پیار' محبت' خلوص کی دولت پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ رشتوں سے محرو ز دل کی وسعت پر پہرے نہیں بٹھائے۔

ماں کی دوری نے وجود میں مامتا بھر دی ہے۔ باپ سے دوری نے شفقت برتنا سکھا دیا۔
بھائی کا نہ ہونا باہمت اور دلیر بنا گیا۔
بہن کی جدائی نے ضبط اور صبر سے نواز دیا۔
"دنیاوی دھن دولت کے نام پر پھوٹی کوڑی نہیں...... دکھ، درد، مفلسی، یتیمی سے مالا مال ہے۔"
جہیز کے نام پر آرزوؤں، حسرتوں، تمناؤں اور اپنے پن کے سوا کچھ ساتھ نہ لائے گی۔
کوئی مطالبہ، کوئی تقاضا نہیں، کر ہی نہیں سکتی کہ قدرت نے اس قابل چھوڑا ہی نہیں۔
بس...... پناہ چاہئے......
ایک آسرا درکار ہے۔ ایک سائبان کی ضرورت ہے۔
بس...... اور......
اور کچھ بھی نہیں۔"
زبردستی گود میں چڑھ کر بیٹھی مضراب کو کارپٹ پہ بٹھا کر وہ اٹھی اور بغیر نگاہ اٹھائے پیر گھ… دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔
ڈرائنگ روم میں بیٹھے نفوس، ساکت وصامت تھے۔
ان کے پاس بولنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔
بس ایک گمبھیر چپ تھی۔ ایک جامد سناٹا تھا جس نے اگلے کئی روز تک "اسفند ہاؤس" کے دیوار کو اپنے حصار میں لئے رکھا تھا۔



"اسفند ہاؤس" کے چھوٹے سے لان کی کیاریوں میں کھلے سرخ پھولوں کا رنگ ہر روز۔ کچھ زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ موتیا اور کلی کی خوشبو سے بھری مخمور ہوا پودوں کی شاخوں پہ لدے پھولوں یہاں سے وہاں تک بکھیر رہی تھی۔ سامنے کے دروازے سے ایک عورت برآمد ہوئی تھی۔
گہرے رنگ کے لباس میں اس کا متناسب سراپا بہت جچ رہا تھا۔ ڈارک براؤن بالوں کی سی چوٹی میں کلیاں گندھی ہوئی تھیں۔ دمکتی ہوئی شفاف، سنہری رنگت اور سرخ ہونٹوں پہ کھیلتی مطم… سی مسکراہٹ اس کی خوش حالی کی دلیل تھی۔ چھوٹی سی بچی کو گود میں لئے وہ اس کے ساتھ مسلسل شوخیوں اور شرارتوں میں مصروف تھی۔
اس کے پیچھے ایک مرد چلا آ رہا تھا۔ بلیک پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس مرد کی وجاہت دیک…

…بھتی تھی۔ شرٹ کی آستینوں کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ مسلسل مسکرانے کے ساتھ ساتھ …پر فقرے بھی اچھال رہا تھا۔ جس پر اس عورت کا نقرئی قہقہہ بلند ہوتا تو فضا میں …ت مزید بڑھ جاتی تھی۔ تب ہی کہیں سے ایک بچی بھاگتے ہوئے آئی تھی اور پھولوں کا …ورت گلدستہ اس عورت کی طرف بڑھایا تھا۔ جسے مرد نے فوراً آگے بڑھا کر تھامنا چاہا، مگر …ی تھی۔
"یہ ماما کے لئے ہے۔"
"کیا...... اور میرے لئے......؟" مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے اچانک ہی اس مرد کی نگاہ گیٹ …اٹھی تھی اور گیٹ کے اوپر سے جھانکتے سر کو دیکھ کر وہ بے اختیار چونکا تھا۔
"او...... ہو آر یو......؟" پنجوں کے بل کھڑا وہ نوعمر لڑکا ہلکی سی گھبراہٹ کے ساتھ سیدھا ہو گیا …بدستور گیٹ کے سامنے کھڑا رہا تھا۔
"کیا بات ہے؟" گیٹ کھولتے ہوئے اس مرد نے پوچھا تو وہ لڑکا دو قدم آگے بڑھ کر گھر …رجھانکنے لگا۔ تب ہی وہ عورت اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اس لڑکے پر نظر پڑتے ہی وہ …انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔
"ارے بلو! یہ تم ہو نا؟" اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی خوشی تھی۔ اگلے ہی پل وہ اس …ہ اندر چلی آئی۔
"یہ اسفند ہیں، میرے شوہر...... اور اسفند یہ......" بختاور نے تعارف کرانے کے لئے منہ کھولا …کھلکھلا کر ہنس دی۔
"بلو! کیا کہہ کر تعارف کرواؤں تمہارا۔" لہجہ معنی خیز تھا۔ بلو کا چہرہ ایک دم سرخ پڑ گیا۔
"یہ...... اسفند یہ...... میرا میکہ ہے۔" اس نے بڑے مان سے بلو کی طرف دیکھا۔
"اتنے بہت سے دنوں میں ایک یہ ہی مجھ سے ملنے، میری خیر خبر لینے آیا ہے۔ میرا اور اس کا …رہے، اس کا کوئی نام نہیں۔ بس خلوص اور محبت کے جو رشتے ہوا کرتے ہیں وہ سب اسی کے …وابستہ ہیں۔"
"بہت خوشی ہوئی بلو تمہیں دیکھ کر۔ آتے رہا کرو۔ بختاور تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور یہ …لگا۔" اسفند نے قابل قدر نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بختاور کی طرف متوجہ ہوا۔
"تم لوگ بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں ذرا بچیوں کو باہر گھما لاتا ہوں۔" وہ میزاب اور مضراب …کو ساتھ لے کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔



"آپا فرخندہ کے اصرار پر وہ "اسفند ہاؤس" میں آئی تو میمونہ کچھ مہمانوں کے ساتھ ڈرا
روم میں بیٹھی تھیں۔ ملازمہ اسے ٹی وی لاؤنج میں لے آئی تھی۔ جہاں میزاب اور مضراب دو
موجود تھیں۔ وقت گزاری کے لئے وہ میزاب کو پاس بلا کر اس سے یونہی ادھر ادھر کی باتیں کر
لگی۔

"چھوٹی بہن کا خیال رکھتی ہو۔" اس کے پوچھنے پر وہ جھینپ کر مسکرا دی تھی۔

"تم بڑی ہو نا...... تو خیال رکھا کرو اس کے کھانے پینے کا' اس کے کپڑوں کا' یہ دیکھو دود
بوتل یونہی پڑی ہے۔ گرمیوں کے دن ہیں' دودھ جلدی پھٹ جاتا ہے۔ ملازمہ کی نظر نہ پڑ
مضراب یونہی اٹھا کر منہ میں ڈال لے گی۔"

"فریج میں رکھ آؤں۔" اس نے پوچھا تو بختاور نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بوتل
کر دروازے کی طرف بڑھی تھی' مگر پھر پلٹ کر اس کی طرف آ گئی تھی۔

"آنٹی......! پھوپھو بتا رہی تھیں کہ آپ ہمارے لئے ماما ڈھونڈ کر لائیں گی......؟"

"ہاں......"

"تو کیا اب تک ملی نہیں۔" حسرت و اشتیاق میزاب کی سنہری آنکھوں سے یکلخت ہی ا
تھا۔

"ماں بہت مشکل سے ملتی ہے چندا...... اور کبھی تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔" آخر میں
نے خود کلامی کی تھی' مگر میزاب چونک گئی تھی۔

"تو کیا ہمیں بھی نہیں ملے گی۔"

"اللہ نہ کرے......" وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

"کیوں نہیں ملے گی؟ میں خود ڈھونڈ کر لاؤں گی۔"

"جلدی کریں نا آنٹی...... مجھے رات کو بہت ڈر لگتا ہے۔ ماما کے بغیر نیند نہیں آتی۔" میز
بات کرتے کرتے یکدم رو دی تھی۔

بختاور ایک لمحے کے لئے سناٹے میں رہ گئی۔ اسے لگا تھا اس کے سامنے میزاب نہیں بخ
کھڑی ہے۔ تاریک راتوں کی تنہائی سے خوفزدہ بختاور۔

اس نے بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر اسے سینے میں بھینچ لیا تھا۔ وہ مزید زور زور سے رونے
تھی۔

"مت رو...... نہ چندا' روتے نہیں۔" وہ اسے ساتھ لئے صوفے پہ آ بیٹھی تھی۔
اسے چپ کروانے کی بھرپور کوشش کی۔ منہ چوما' بال سنوارے' پشت تھپکی تب ہی کوئی عجلت
ر آیا۔

"میزاب!" اسفند نے از حد حیرت سے بختاور کی گود میں بلکتی میزاب کو دیکھا تھا اور بجلی کی
سے اس کی طرف بڑھے۔

"کیا ہوا ہے؟" میزاب اس کے پاس سے اٹھ کر باپ سے لپٹ گئی تھی۔
مضراب ڈری سہمی...... باپ کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ اسفند نے بمشکل میزاب کو چپ کرا
رے میں بھیجا۔ مضراب کو اٹھا کر پیار کیا' چہرے پہ زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر اسے نارمل کرنا
مگر ذہن بختاور کی طرف متوجہ تھا جو اب دونوں ہاتھوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا تھا میزاب کو......؟" وہ اس کے عین سامنے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے پریشانی سے پوچھ
تھے۔

"اسے ماں کی تلاش ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ماما کے بغیر نیند نہیں آتی۔ وہ کہہ رہی تھی اسے
کو بہت ڈر لگتا ہے۔" اس کی مدھم آواز اسفند بمشکل سن سکا تھا۔

"رات بہت بھیانک ہوتی ہے۔ اندھے بھکاری کے خالی کشکول جیسی اس میں ڈر اور خوف
سکوں کے سوا کچھ نہیں گرتا۔"

آنکھ کے گوشے میں آنسو آ ٹھہرا تھا۔

"یہ میزاب نے کہا ہے؟" اسفند کے لہجے میں تعجب...... آنکھوں میں حیرت تھی۔

"گھر کے کونے کھدروں میں چھپا خوف نکل کر آنگن میں دندنانے لگتا ہے۔" وہ جیسے کچھ بھی
نہیں سکی تھی۔

"چیزیں اپنی شکل بدل لیتی ہیں۔ سناٹے کی لمبی زبان سب آوازوں کو نگل لیتی ہے۔ ہوا لمبی
سانسیں لینے لگتی ہے۔ تب نیند نہیں آتی۔ تب واقعی ڈر لگتا ہے۔ نیند نہیں آتی...... بالکل بھی نہیں
نا۔"

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ آنسو قطرہ قطرہ گرتے ہوئے آنچل کی سلوٹوں میں گم ہوتے
ہے۔ کیسی بے چارگی اور بے بسی چھلک رہی تھی اس کے لہجے سے۔ بے ترتیب لفظ ڈوبتی ابھرتی
آوازیں۔

اسفند کی نگاہ اس کے چہرے سے نہ ہٹ سکی تھی۔

سرخ، ویران آنکھیں، زرد رنگت، کپکپاتے ہوئے ہونٹ، اذیت کا ایک پورا باب رقم تھا اُس کے چہرے پر، تب ہی میمونہ کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ اندرونی صورتحال سے بے خبر...... بشاش بشاش انداز میں انہوں نے آتے ہی دریافت کیا تھا۔

"ہاں بھئی! بختاور...... کیسے آنا ہوا؟"

بختاور نے غبار آلو نگاہوں سے سامنے بیٹھے اسفند اور میمونہ کو دیکھا۔ پھر مضراب کو جو اس کے ہاتھ میں پکڑی گھر کے تالے کی چابیاں چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ تب اس نے نجانے کیسے کہہ ڈالا تھا۔

"ایک رشتہ لائی ہوں۔"

"مجھے نہیں معلوم بلو! میں نے وہ سب کیسے کہہ ڈالا۔ شاید وہ ایک رات مجھ پہ ایسی بھاری گزری تھی کہ میں سب مصلحتیں بھلا بیٹھی۔ یا شاید رات کے اس پہر کاتب تقدیر کو مجھ پہ رحم آیا اور اس نے یہ سب جوں کا توں میری قسمت میں لکھ دیا۔

یا شاید...... میزاب کے آنسو ہی بھاگوان ثابت ہوئے۔ میرے اور اس کے سارے دکھ درد دور ہو گئے۔"

"یا شاید یہ سب یونہی ہونا تھا۔"

بلو نے لقمہ دیا تو وہ ہنس دی۔

"ہاں...... ٹھیک کہہ رہے ہو تم......" اس نے سر اٹھا کر آسمان کے کناروں پر اترتے اندھیرے کو دیکھا۔

"یہ سب اس طرح اور اتنی اچانک ہوا کہ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا اور تمہیں پتا ہے آپا فرخندہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر میرا خیال رکھنے والی یہاں خود غرضی دکھا گئیں۔ ان کا خیال تھا میں نے سارے احسان بھلا دیے اور ان کی بہن کے بجائے اپنا گھر بسا لیا۔"

"نہیں، اب وہ اکثر تمہیں یاد کرتی ہیں۔"

"اور تم......؟"

بختاور نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں تجھے بھولا ہی کب ہوں۔" بلو نے پوری سچائی سے اعتراف کیا۔

"تو تو میری سہیلی تھی نا، ہر بات تجھ سے کہہ لیا کرتا ہوں...... وہ باتیں بھی جو...... اماں سے نہیں کہہ سکتا تھا......" بلو افسردہ ہو رہا تھا۔

"نہیں، کیوں کہہ رہے ہو۔ میں اب بھی تمہاری سہیلی ہوں۔ تمہارا جب دل چاہے...... تم......"

"نہیں...... اب وہ بات نہیں رہی۔ زیادہ آنے جانے لگا تو وہ تمہارا صاحب خوامخواہ مجھ سے ...ے گا۔" بلو نے بال سنوارے، کالر جھاڑے۔

"موڈ بدلنے کی ایک اختیاری کوشش......" بختاور نے طویل سانس کھینچتے ہوئے اس کی شوخ ...اہٹ کو دیکھ کر سوچا۔

"ویسے بھی اب کم کم آیا کروں گا۔ آخر تمہارا میکہ ہوں...... قدر تو نہیں گنوانی نا......" وہ خود کو ...ابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بختاور چپ چاپ مسکراتی رہی۔ تب وہ جانے کے لئے اٹھ ...ہوا۔ بختاور اسے چھوڑنے گیٹ تک آئی۔

"اسفند صاحب اچھے تو ہیں نا......؟"

گیٹ سے باہر قدم نکالتے ہوئے وہ ایکدم پلٹا۔

"اچھے......؟ وہ شخص میرے لئے "دیوتا" ہے بلو! اس نے سارے خاندان کی مخالفت مول ...ف میرے لئے اور کبھی جتایا بھی نہیں۔ میں نے تو صرف خواب دیکھے تھے اور وہ...... وہ ہر ...کو حقیقت بنا رہا ہے۔ میری ہر آرزو میں رنگ بھر دیے۔ اس نے سچ مچ بخت آور بنا دیا ہے

...میں تمہیں کیا بتاؤں بلو! کیسا محبت بھرا دل ہے اس کا۔ مجھے تو اس زمین کا لگتا ہی نہیں۔ نہ ہی ...لوگوں جیسا ہے پتا ہے۔"

وہ بلو کی طرف ذرا سا جھکی۔

"وہ رب کی طرف سے میرے لئے خاص تحفہ ہے...... بہت ہی خاص......" اس کی جگر جگر ...آنکھوں میں ایسی روشنی بھری تھی کہ بلو دل ہی دل میں اسے نظر بد سے محفوظ رکھنے کی دعائیں ...نے لگا تھا۔

"میں دعا کروں گا تو ہمیشہ خوش رہے۔"

بلو نے پرخلوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور پھر باہر نکل گیا۔

وہ چند لمحے اسے اندھیرے میں گم ہوتے دیکھتی رہی پھر پلٹ کر اندر کی طرف آ گئی۔ اندھیرا ...پھیل چکا تھا اور ملازمہ سارے گھر کی روشنیاں جلا رہی تھی۔

سفید دودھیا روشنی میں چمکتے در و دیوار...... پھولوں کی خوشبو سے مہکا آنگن...... وہ سرشار ہو کر ...اری۔

ٹی وی سکرین پر رنگ برنگی تصویریں تھرک رہی تھیں، جن کا سایہ سامنے کی دیوار پر پڑ رہا
وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو کچن سے برتنوں کی کھنک سنائی دے رہی تھی۔ ملازمہ ڈائننگ ٹیبل پر
لگا رہی تھی۔

"سنو! میزاب کے لئے فرنی بنا کر فریج میں رکھی تھی۔ وہ ضرور نکال لینا اور کباب صا
کے آنے پر تلنا۔ ٹھنڈے کباب انہیں سخت برے لگتے ہیں۔ مضراب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں
کے لئے میں خود کچھ بنا لوں گی۔" ملازمہ کو ہدایت دے کر وہ وضو کرنے کے لئے واش روم کی طر
بڑھ گئی۔ جب تک بچے اور اسفند نہیں آتے وہ شکرانے کے کچھ نفل پڑھ سکتی تھی۔

"اور سجدہ شکر تو مجھ پر تمام عمر کے لئے واجب ہو چکا ہے۔" جاء نماز پر کھڑے ہوتے ہو
خلوص دل سے نیت باندھتے اس نے بس ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر خدا کے سامنے سر بہ سجو
گئی تھی۔



ے سات سمندر

"اری کچھ سنا تم نے۔ شام روپ واپس آ گئی۔"
"کیا؟ شام روپ واپس آ گئی......؟"
"ہاں تو اور کیا؟ میں خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ کر آ رہی ہوں۔"
"مگر وہ واپس کیسے آ گئی......؟"
"اسے یہاں آنے کس نے دیا......؟"
"اسے جرأت کیسے ہوئی دوبارہ اس گاؤں میں قدم رکھنے کی۔"
"کیا چودھری بختیار اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دے گا۔"
"اللہ جانے......اس کا فیصلہ تو پنچایت کرے گی۔"
"ارے فیصلہ کیا کرنا ہے نکال باہر کریں اس مردودنی کو......آخر ہم بھی بہو، بیٹیوں والے
......کل کلاں اس کی شہ پر کوئی اور شام روپ گل کھلانے نکل کھڑی ہو گی۔ ہم کہاں تک اپنی
کو اس کے منحوس سائے سے بچائیں گے۔"

یہ سب گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی رائے تھی جو رشیدہ کے گھر کے پچھواڑے بنے چھپر تلے
یں۔ آج شام سے پہلے تک گاؤں میں امن ہی امن تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا
مویشیوں کو گھروں کی جانب ہانک رہے تھے۔ عورتیں گھروں میں چولہے گرم کر رہی تھیں۔
لڑکے تھڑوں پہ بیٹھے گاؤں کی آتی جاتی الہڑ مٹیاروں کو تاک رہے تھے اور چھوٹے بچے اپنی
وں میں مکئی اور چنے بھر بھر کے مائی بھاگاں کی بھٹی کی طرف بھاگے جا رہے تھے، جس کی درانتی
ں میں جھلستی ریت کو تیزی سے کاٹنے لگتی تھی۔

گاؤں کی چوپال بڑے بوڑھوں سے آباد ہو چکی تھی اور "سائیں!" جس کی بڑی بڑی زلفیں

لٹوں کی صورت گردن میں جھول رہی تھیں۔ اس کی آواز کا درد ہر روز کی طرح آج بھی بڑھتا ہ
رہا تھا۔ فضاء میں ''ہیر'' کے بولوں کی آواز کے ساتھ ایک غیر معمولی اداسی بھی رچ بس گئی تھی ا
ہی وہ وقت تھا' جب شام روپ نے گاؤں کے کچے پکے ٹیڑے میڑھے راستے پر قدم رکھا تھا۔
میں کچے کھیلتے، اودھم مچاتے لڑکوں نے اس کے لئے راستہ چھوڑتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ ا
ڈالی تھی اور پھر سے کھیل میں مصروف ہو گئے تھے' لیکن جب گاؤں کے واحد تانگہ بان اشرف
شام روپ کو گلی کا موڑ مڑتے دیکھا تو وہ اپنی گھوڑی کو تانگے سے جدا کرنا بھول گیا تھا اور
بھاگ گاؤں کے چوپال تک پہنچا تھا۔ جہاں اس کے ہونٹوں سے نکلی خبر نے لمحہ بر کی خاموشی چار
طرف پھیلا دی تھی۔

سائیں کے ہونٹوں پر چپ کی مہر ثبت ہو گئی تھی اور چار پائیوں پہ چھنے بیٹھے افراد کی نظ
بے ساختہ ہی چودھری بختیار کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ چودھری بختیار نے ان نظروں کا مفہوم سم
آنکھیں چرالی تھیں اور حقے کی گڑگڑاہٹ کو تیز کرتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا
اسی لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فیکا کمہار دبے پاؤں چار پائی سے اترا تھا اور چوپال سے ذرا د
کر اس نے اپنے دونوں جوتے اتار کر بغل میں دبائے تھے اور نہایت پھرتی سے اپنے دو کمرو
کچے مکان تک پہنچا تھا، جہاں اس کی بیوی صحن میں بنے تنور کی لپائی میں مصروف تھی۔

''کچھ سنا تم نے...... وہ شام روپ واپس آ گئی ہے۔''

فیکے کمہار نے اپنی ڈھیلی پڑتی تہبند کے دونوں پلو کو کھول کر انہیں سختی سے گرہ دیتے ہو
دوبارہ اپنے پہلو میں اڑس لئے تھے۔

''کیا......؟'' اس کی بیوی نے بھر پور حیرت سے اس کی بات سنی تھی اور فیکے کی دوبارہ تصد
پر ہاتھ دھوئے بغیر دیوار کی طرف لپکی تھی۔

''آپا صغریٰ...... اے آپا...... کچھ سنا تم نے...... شام روپ واپس آ گئی......'' شام کی خا
میں اس کی پاٹ دار آواز کئی گھروں میں سنی گئی تھی اور یوں راوی جو صبح تک چین ہی چین لکھ رہا
اس میں ہلچل مچ گئی تھی۔ شام روپ کی آمد سے...... اور اب گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اپنی فراغ
بھر پور فائدہ اٹھاتے ہوئے اور کچھ اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کی انگلی تھامے رشیدہ ک
کے پچھواڑے بنے چھپر تلے جمع تھیں۔ جہاں سے شام روپ کے گھر کے دروازے پر ٹوٹ کر
ہوا تالا انہیں بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔

''تالا کس نے توڑا......؟'' کسی نئی آنے والی نے سرگوشی کی تھی۔

خود اسی نے توڑا ہوگا'' رشیدہ نے بھوری بھینس کے تھنوں پر پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

'اندر جاتے ہوئے دیکھا کسی نے......؟''

'دیکھا تو نہیں پر سنا ضرور ہے۔''

'ارے تو دیکھنا بھی کیا ہے اس منحوس کا...... یہیں گلیوں میں رلتی پھرتی تھی۔'' بولنے والی کے
حقارت ہی حقارت تھی۔

'لیکن پتا بھی تو چلے...... کون ہے یہ شام روپ...... کہاں سے آئی ہے؟'' رشیدہ کی نئی نویلی
نے سرخ پراندہ پشت پر گراتے ہوئے پوچھا تو پراندے کے آخری سروں پر لگے گھنگرو
یوں میں پہنی سبز و سرخ چوڑیاں ایک ساتھ بج اٹھی تھیں۔

''اری دفعان کر...... کیا کرے گی جان کر......''

رشیدہ نے ناک بھوں چڑھائی۔ اس کی نگاہیں پیتل کی بالٹی پر جمی ہوئی تھیں۔ جس میں دودھ
دھار کے ساتھ سفید جھاگ اوپر ہی اوپر بھاگی چلی آ رہی تھی۔

''پیشہ کرتی تھی اس کی ماں...... ناچنے گانے والیوں میں سے تھی......'' ایک بوڑھی عورت
کی بہو کے کان میں گھس آئی تھی۔

''گاؤں کی رہنے والی تھی......؟'' کسی اور لڑکی نے تجسس ظاہر کیا۔

''اے کہاں......؟''

شہر سے آئی تھی...... فردوس نام تھا پر سانولی کے نام سے مشہور تھی۔ ہمارے گاؤں کا لڑکا تھا
...... بڑا خوبصورت...... گھبرو جوان...... کام کے سلسلے میں شہر آنا جانا تھا اس کا...... وہاں اللہ
نے کیسے سانولی سے اس کی ملاقات ہوئی' پھر ایسا اس کے چکر میں آیا کہ کچھ نہ پوچھو۔ اس سے
کے لئے ماں سے بات کی افتخار نے' مگر وہ ایک شریف عورت تھی۔ کیسے چکلے کی عورت کو بہو بنا
گھر میں بٹھا لیتی۔ سو ماں بیٹے کا آپس میں جھگڑا رہنے لگا۔ کچھ روز اسی تو تو...... میں میں،
ر گئے اور اگلی بار جب افتخار شہر سے واپس آیا تو سانولی اس کی گھر والی بنی اس کے ساتھ ساتھ
مار کلائیاں بھر بھر چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ پیروں میں جھانجھریں...... ہونٹوں پہ لال سرخ
...... مرغی کے پنجوں ایسے بڑے بڑے ناخن...... بس جس روز وہ لٹک مٹک کرتی گھر کی دہلیز
آئی اسی روز افتخار کی ماں چار پائی سے جا لگی...... شکل صورت، رنگ روپ کی تو خیر اچھی تھی' پر
طریقے شریف لڑکیوں ایسے ہرگز نہیں تھے۔ حلق پھاڑ کر ہنستی تھی۔ اونچی اونچی آواز میں باتیں
تے تھکتی نہ تھی...... جو سبزی فروٹ بیچنے والا آتا، جو منیاری والا آوازیں دیتا جھٹ دروازے کے

سامنے اسے روک لیتی ...... ننگے سر دروازے سے باہر نکلتی اور کتنی کتنی دیر ان سے ہنسنے باتیں کر
میں مصروف رہتی ...... پھر کچھ روز گزرے کہ گھر سے ٹیپ بجنے کی آواز آنے لگی۔ کئی بار خود
گنگنانے لگتی۔ گاؤں کے لڑکے بالے بہانے بہانے سے گھر کے سامنے سے گزرتے۔ عورتوں
یہ راستہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ تب ہی ایک روز افتخار کی ماں بھی چل بسی۔

سو افتخار کی غیر موجودگی میں جو تھوڑی جھجک اس بوڑھی عورت کی تھی وہ بھی نہ رہی۔ ان دنوں شام روپ پیدا ہوئی باپ نے تو کوئی بھلا سا نام رکھا پر سانولی نے اسے اپنے جیسا ہی دے چھوڑا...... گلی...... محلے میں وہ اسی نام سے جانی جانے لگی تھی۔ پھر سانولی کے الٹے سید کرتوتوں کی خبر افتخار تک بھی جا پہنچی۔ وہ بے چارہ گھر کی گاڑی کھینچنے کو محنت مزدوری کرتا تھا اس پیچھے سانولی کیا کرتی ہے کیا نہیں وہ بالکل بے خبر تھا۔ اب اڑتی اڑتی اس کے کان میں پڑ دونوں میاں بیوی میں تو تکار شروع ہو گئی۔ ایک روز بیچ سڑک میں دونوں کا جھگڑا ہو گیا۔ افتخار کا تھا کہ وہ اسے اسی شرط پر بیاہ کر لایا تھا کہ وہ شریف عورتوں کی طرح گھر سنبھالے گی اور سانولی کا تھا کہ اس کا جی اس بند گھر میں نہیں لگتا۔ بس پھر ہونا کیا تھا۔ افتخار تو اس کی بات پر آگ بگولہ اور وہیں کھڑے کھڑے تین طلاقیں اسے دے ڈالیں۔ وہ بھی اللہ جانے کس مٹی کی بنی عورت تھ شام روپ کو پھینکا باپ کی گود میں اور اپنا زیور لتا سنبھالے یہ جا وہ جا...... اور تو اور اپنی ساس کا گہنا بھی نہ چھوڑا۔"

"اور شام روپ...... یہ کہاں چلی گئی تھی......؟"

کسی لڑکی نے بڑی بے صبری سے پوچھا تھا۔

"اری اس نے کہاں جانا تھا۔ یہ اس وقت تو بڑی بھولی...... بڑی معصوم ہوا کرتی تھی پرزے تو بعد میں نکالے اس بدبخت چھوکری نے...... سانولی کے جانے کے بعد افتخار ایسا چار سے لگا کہ جینے کی کوئی آس، امید نظر نہ آتی تھی۔ گاؤں والوں نے رحم کھاتے ہوئے بڑا علاج اس کا مگر وہ تو دن بہ دن ختم ہوتا چلا گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر چودھری بختیار کے دل میں خدا آئی تو سوچا افتخار کے بعد جوان جہان لڑکی بے آسرا ہو جائے گی۔ باپ کے جیتے جی اپنے گھر ک جائے تو اچھا ہے۔ یہ ہی سوچ کر اس نے شام روپ کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔

"اپنے چودھری بختیار نے......"

"ہاں...... ہاں تو اور کیا۔"

"چودھری بختیار اس وقت کنوارا تھا کیا......؟"

"اے لو...... اور سنو......" رشیدہ کی بہو کی بات سن کر کئی عورتیں خوامخواہ ہی ہنسنے لگیں۔

"یہ کوئی پانچ...... چھ برس کی تو بات ہے۔ چودھری بختیار شادی شدہ بھی تھا اور بچوں والا بھی کا بڑا بیٹا تو ان دنوں شہر پڑھنے جایا کرتا تھا۔ غالباً نویں یا دسویں جماعت میں تھا۔"

"تو پھر...... کیا ان دونوں کی شادی ہو گئی؟"

"کہاں بھئی...... جس روز شام روپ کا نکاح تھا چودھری سے۔ اس سے دو دن پہلے ہی وہ گھر بھاگ گئی تھی۔"

"ہا۔ ہائے...... پھر......؟"

"پھر کیا۔ دوسرے تیسرے دن ہی افتخار نے بھی دم توڑ دیا۔ کچھ لوگ شام روپ کی تلاش میں کہ چلو باپ کا منہ ہی دیکھ لے' مگر اس کا کچھ اتا پتا نہیں لگا تھا اور آج پانچ چھ سال بعد ہی معلوم ہے کہ وہ زندہ ہے اور گاؤں میں لوٹ آئی ہے۔"

"پر بے بے! کیا وہ اکیلی ہی بھاگ گئی تھی۔"

"یہ تو معلوم نہیں ہو سکا...... ہاں اتنا ضرور ہے کہ مولوی صاحب کے مکان کے پچھواڑے ب چھڑا چھانٹ ماسٹر رہا کرتا تھا۔ وہ اس گاؤں کا نہیں تھا، وہ بھی اس دن اپنے گھر سے غائب تھا ں دن شام روپ اپنا گھر چھوڑ گئی تھی۔ گاؤں کے سب لوگوں کو اسی پر شک تھا' مگر مولوی صاحب نے بتایا کہ ماسٹر کی بدلی ہو گئی ہے، وہ اس لئے گاؤں چھوڑ گیا ہے بعد میں چند ایک بار مولوی احب سے ملنے بھی آتا رہا جس کی وجہ سے اس پر شک بھی ختم ہو گیا۔"

"لیکن پتا بھی تو چلے...... یہ اتنا عرصہ رہی کہاں......؟"

رشیدہ کی بہو کو بھی کھوج لگ گئی تھی۔

"خدا جانے کہاں کہاں منہ کالا کرتی رہی ہوگی...... ارے کوئی پوچھے چودھری بختیار میں کیا ائی تھی...... رہنے کو ٹھکانا مل جاتا۔ اچھا پہننے کو ملتا...... پیٹ بھر کے کھانا کھاتی...... مگر جس ماں کا دھ پیا تھا اس کا کچھ اثر تو ہونا ہی تھا نا...... عزت کی زندگی راس کیسے آتی اس حرام خور کو۔"

"لیکن بے بے......! چودھری بختیار کے بیوی بچے تھے...... اچھی خاصی عمر تھی اس کی...... اور یہ شام روپ یہ تو آج بھی دیکھنے میں اس کی بیٹی جیسی لگتی ہے۔ کیسے کر لیتی چودھری بختیار سے شادی۔"

رحمت موچی کی اکلوتی بیٹی شادو شروع ہی سے کم عقل گردانی جاتی تھی۔ سو اب بھی تمام عورتو نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا تھا۔ شادو کی ماں نے اس کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ماتم

کرتے ہوئے اسے گھر کا اور سب سے چھپ کر یہ بڑی سی چٹکی اس کے پہلو میں کاٹی تھی۔

"اری بے وقوف! بیوی بچوں والا ہونے میں کیا برائی تھی...... اور چودھری بختیار نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ شام روپ کے لئے الگ مکان بنواؤں گا۔ رانی بنا کر رکھوں گا اسے...... اور پھر عمر کیا ہے۔ مرد بھی کبھی بوڑھا ہوا ہے۔"

بڑی بوڑھیاں شادو پر چڑھ دوڑی تھیں۔ اس پر ماں کی آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ اور شادو کو مزید کچھ بول کر اپنی شامت تو بلوانی نہ تھی نہ ہی گھر جا کر ماں سے مار کھانے کا ارادہ تھا سو سب کی سن کر بھی چپکی بیٹھی رہی۔

اور پھر کتنی ہی دیر تک ان سب کی نگاہیں شام روپ کے گھر کے بند دروازے پر ٹکی رہیں۔ گھر سے آنے والی آہٹ کو سننے کے لئے کان چوکس رہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شام کی لالی میں رات کی سیاہی گھلنے لگی۔ سب عورتیں ایک ایک کر کے اٹھتی چلی گئیں، لیکن رشیدہ بہو سے چوری کتنی ہی بار چھپرے کی طرف آئی تھی یہ دیکھنے کہ چھ سال قبل گاؤں سے بھاگ جانے والی شام روپ گاؤں واپس آئی تھی تو کس روپ میں۔ اس کے چہرے پر آج بھی وہی معصومیت اور بھولپن ہے جو پہلے تھا یا پھر اس کا چہرہ اس کے سیاہ کرتوتوں کی طرح سیاہ پڑ چکا ہے۔

اس کی آنکھیں آج بھی بے ریا مسکراہٹ سے چمکتی ہیں یا عیاری و مکاری ان میں ڈیرہ جما چکی ہے۔ وہ آج بھی کسی غیر مرد کی نگاہ پر اپنا چہرہ شرم سے پلو میں چھپانے لگتی ہے یا پھر وہ چہرہ اس کی ماں کی طرح تماش بینوں کی غلیظ نظروں کا عادی ہو چکا ہے۔

اور رشیدہ کی بہو رات گئے تک اپنی ساس سے چوری دیوار پار جھانکتی رہی تھی۔ اسے تجسس تھا اس شام روپ کو دیکھنے کے جو رات کے اندھیرے میں اس گاؤں کو چھوڑ کر گئی تھی اور آج دن کی روشنی میں اپنے گھر تک واپس آ گئی تھی۔ کیا وہ اتنی ہی نڈر اور بہادر بن گئی تھی کہ اسے چودھری بختیار سے بھی خوف نہیں آ رہا تھا جس کی حکومت آج بھی گاؤں کی گلیوں، چوباروں اور یہاں کے ہاریوں کسانوں پر اتنی ہی مستحکم تھی جتنی آج سے کئی سال پہلے۔ مگر ان دونوں کی تمام تر کوششیں رائیگاں ہی گئی تھیں۔ کیونکہ شام روپ کے گھر کا دروازہ جوں کا توں بند ہی رہا تھا اور گھر کے ہولناک سناٹے میں آواز کی کوئی لہر ابھری تھی اور نہ اس گھر کے مہیب اندھیرے میں روشنی کی کوئی کرن پھوٹی تھی۔

یہاں تک کہ تاریک، سیاہ رات گاؤں پر پوری طرح قابض ہو گئی تھی اور رشیدہ کے ساتھ ساتھ اس کی بہو بھی تھک ہار کر سو گئی تھی۔

♦❖♦

یہ اس سے اگلی شام تھی، جب رشیدہ چولہے میں آگ اگلتے اپلوں کو پھونکیں مار مار کر بے حال ہو رہی تھی۔ سرمئی دھواں پچھلی دیوار سے رگڑ کھاتا ہوا اوپر ہی اوپر فضاء میں مدغم ہوتا جا رہا تھا اور شام کو مزید دھندلاتا جا رہا تھا۔ تب ہی شام روپ رشیدہ کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ پہلے کی طرح آج بھی اپنی اوڑھنی میں سمٹی سمٹائی شام روپ کو دیکھ کر رشیدہ چولہے میں آگ جلانا بھول گئی۔

"کوئی کام ہے......؟" اس کا انداز آج بھی وہی تھا۔ رشیدہ کو درمیان میں گزرے چھ سال محسوس ہوئے تھے۔

"ہاں...... اپلے تھاپنے ہیں۔" رشیدہ نے بے ساختہ ہی کہا تھا اور شام روپ کچھ کہے بغیر دہلیز پار کر گئی تھی۔ سارے دن کا گوبر اپلوں کی صورت میں کھپا کر وہ چپ چاپ گھر آئی تھی اور کونے میں رکھے مٹکے میں ہاتھ دھونے کے بعد رشیدہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی تھی۔ رشیدہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر چنگیز سے روٹی اٹھا کر اس پر سالن ڈالا اور پھر دوسری چنگیز میں رکھتے ہوئے پاس بیٹھی بہو کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ بھی کر دیا تھا۔ بہو اٹھی تھی اور چنگیز اٹھا کر چولہے سے کافی فاصلے پر لے جا کر زمین پہ رکھ دی تھی۔ گویا شام روپ کوئی اچھوت ہوئی۔ شام روپ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی چنگیز کے پاس جا بیٹھی تھی۔

"اری شام روپ...... کہاں رہی اتنا عرصہ......؟" رشیدہ نے توے پر روٹی پلٹتے ہوئے پوچھا اور شام روپ نے کچھ کہے بغیر چنگیز سے روٹی اٹھا کر اپنی اوڑھنی میں چھپائی تھی اور کسی کی طرف دیکھے بغیر گھر سے باہر نکل گئی تھی۔

"ارے...... بڑا نخرا ہو گیا ہے اس جنم جلی کا...... منہ سے کچھ پھوٹی ہی نہیں...... ہونہہ شکل دیکھو اس کی اور انداز دیکھو۔ جہنم میں جائے کم بخت...... میری بلاتی ہے جوتی اسے...... آئندہ سے منہ نہ لگانا اس ڈائن کو......" رشیدہ کی بڑبڑاہٹ تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی تھی۔

اور اسی شام پنچایت میں گاؤں کے تمام بڑے یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ آیا شام روپ اس گاؤں میں رہنے کے قابل ہے بھی کہ نہیں...... گاؤں کے ہاری سارے چودھری بختیار کی بیٹھک میں جمع تھے اور نورا کمی ہر آنے والے کو گڑ کی بنی چائے کی پیالی پیش کر رہا تھا۔ دینو ہر گھنٹے بعد حقے کی چلم تازہ کرنے کو اٹھ جاتا تھا، مگر راکھ کرید کرید کر سلگتے کوئلے نکالتے ہوئے بھی اس کے کان بیٹھک سے آتی آوازوں پر لگے رہتے تھے، جہاں ہر فرد بڑھ چڑھ کر شام روپ پر فتوئی لگا رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ چودھری بختیار شام روپ کو گاؤں سے باہر نکالنے کا فیصلہ سنا کر اپنی برسوں پرانی بے

عزتی کا بدلہ چکاتا۔ مولوی صاحب نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے سر اٹھایا تھا اور جب بولے تھے تو ان کی بات نے سب ہی لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔

"چودھری بختیار! ماضی میں جو کچھ ہو چکا بہتر ہوگا کہ ہم سب اسے بھول جائیں۔ شام روپ اس گاؤں کی بیٹی ہے۔ ہم سب کی بیٹی...... کیونکہ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ وہ کئی برس بعد لوٹ کر آئی ہے اپنے گھر کی طرف...... اس کے پیروں تلے سے زمین مت کھینچو۔ آسمان کو اس کے سر پہ سایہ فگن رہنے دو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ مولوی جی...... وہ بے غیرت لڑکی گاؤں میں دندناتی پھرے گی تو ہماری بہو، بیٹیوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔"

"کس نے کہا کہ وہ بے غیرت ہے......؟ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے اس کی بے غیرتی کا......؟"

"کمال ہے جی...... وہ چودھری بختیار سے نکاح ہونے سے پہلے گاؤں سے بھاگ گئی تھی کیا یہ بے غیرتی نہیں......" نیاز علی نے نتھنے پھیلائے۔ یہ چودھری بختیار کا دایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔

"بے غیرتی تو تب ہوتی نیاز علی۔ جب وہ کسی دوست آشنا کے ساتھ فرار ہوتی۔ جب وہ اپنے باپ کو دھوکا دے کر اس گاؤں سے بھاگ جاتی۔"

"تو کیا وہ اپنے باپ کی مرضی سے گئی تھی......؟"

"ظاہر ہے...... ورنہ کیا اس کا باپ اس کی غیر موجودگی پر واویلا نہیں مچاتا......؟" اس کے گاؤں چھوڑنے کی اطلاع گاؤں والوں کو دو دن بعد کیوں ملی......؟ اور پھر افتخار نے بڑے سکون سے دم کیوں توڑ دیا......؟ آخری وقت میں شام روپ کو بددعائیں کیوں نہ دیں......؟ یہ سب باتیں سوچنے کی ہیں نیاز علی! ہم اور تم شام روپ کا جرم ثابت کیے بغیر اسے سزا نہیں سنا سکتے۔"

مولوی صاحب کی بات میں وزن تھا اور اس شام پہلی مرتبہ چودھری بختیار کو اپنی مرضی کے خلاف فیصلہ سنانا پڑا تھا کہ مولوی صاحب حیثیت و مرتبے میں اس کے برابر نہ سہی، گاؤں والوں کے لئے اتنے محترم ضرور تھے کہ لمحوں میں لوگوں کی کثیر تعداد اس شخص کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوتی جو ان تک اللہ اور اس کے رسول کا پیغام پہنچاتا تھا۔

اور اگلی صبح جب شام روپ نے کچھ گھروں کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا تو تھوڑے رد و کد کے بعد کواڑ اس کے لئے کھول دیئے گئے تھے اور وہ آنکھوں پر بے نیازی اور بے حسی کی پٹی باندھے، لوگوں کی طنزیہ اور تمسخرانہ نگاہوں سے نظریں بچائے سارا دن کولہو کے بیل کی طرح اپنی ضروریات کے گرد

بتی رہی تھی۔ کسی کے اپلے تھاپے تھے، کسی کی رضائیوں میں ڈورے ڈالے تھے، کسی کی چھت پر لیپی تھی۔ کسی کے ٹوٹے پھوٹے تنور کی لپائی کی تھی اور شام ڈھلتے جب وہ گھر لوٹی تھی تو اس کی بوسیدہ اوڑھنی میں روٹیاں تھیں، گڑ تھا، تھوڑے سے کچے چاول اور گندم تھی۔ شام روپ نے اس ن کو بہت اہتمام اور احتیاط سے اوڑھنی میں سمیٹا ہوا تھا اور اس روز پہلی مرتبہ شام روپ کے گھر دھواں اٹھتا ہوا دیکھا گیا تھا۔

♦❖♦

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ آج کھیتوں کو پانی دینے کی باری دارا پہلوان کی تھی۔ سو وہ اپنے ت کے مطابق اٹھ کر ضروری تیاری کے بعد کھیتوں کی طرف چل دیا تھا۔ گلی کے اختتام پر موڑ ڑتے ہوئے وہ دھیمے دھیمے گنگنانا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اچانک ہی اس کی چھٹی حس اسے کسی عجیب و غریب احساس سے دوچار کر گئی تھی۔ اس کی گنگناہٹ دم توڑ گئی تھی اور وہ چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے پر اس کی انگلیاں مضبوطی سے پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ دو چار قدم آگے بڑھ آیا تھا۔ کہیں نزدیک سے آتی باتوں کی بھنبھناہٹ نے اس کی چھٹی حس کی تائید کر دی تھی۔ گلی کے خاتمے پر شام روپ کا مکان تھا۔

سو دارا پہلوان دبے پاؤں لیکن چوکس انداز میں شام روپ کے مکان کی دیوار کے پاس پہنچ تھا۔ پہلے کان دیوار کے ساتھ لگا کر اس نے باتیں سننے کی کوشش کی تھی پھر ذرا اچک کر دیوار پار جھانکا تھا، مگر کچے صحن میں ایک سنسان سی اداسی اندھیرے کے ساتھ گھات لگائے بیٹھی تھی۔ دارا پہلوان کے ہاتھ پاؤں میں ہلکی سی کپکپاہٹ اتر آئی تھی۔ اس گھر میں تو کسی ایک ذی روح کی موجودگی بھی مشکوک لگ رہی تھی کجا کہ دو انسان......

باتوں کی آواز ایک بار پھر سنائی دی تھی۔ بلکہ پہلے قدرے واضح دارا پہلوان کو سمت کا تعین کرنے میں مدد ملی تھی۔ وہ جھکے جھکے انداز میں آگے بڑھا تھا اور شام روپ کے مکان کی پچھلی دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ شام روپ کے گھر کے پچھواڑے کائی زدہ پانی کا گدلا تالاب تھا اس کے اردگرد جھاڑیاں اور لمبی لمبی گھاس کی بہتات تھی۔ رات کے وقت بڑے بڑے مینڈکوں کی ٹرانے، جھینگروں کے بولنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار سانپ کی پھنکار بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ادھر کا رخ عام طور پر گاؤں کا کوئی فرد بھی نہیں کرتا تھا، مگر دارا پہلوان کو اپنے اندازے اور سماعت پر یقین تھا اسی لئے وہ بڑے صبر سے چند منٹ تک وہیں ٹکا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی اچھی طرح عادی ہو چکی تھیں اور تب ہی اس نے آدھے چاند کی ملگجی روشنی

میں دو سایوں کو ایک ہوتے دیکھا تھا۔

مردانہ سرگوشیاں اور نسوانی ہنسی کی دبی دبی آواز دارا پہلوان کے کانوں نے بخوبی سنی تھی پر چوڑیوں کی کھنک ...... دارا پہلوان کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔ وہ بنا چاپ پیدا کیے تیزی سے پلٹا تھا اور بھاگتا ہوا صابر علی کے دروازے تک پہنچا تھا کہ فی الحال نزدیک ترین گھر یہ ہی تھا۔ دروازے کی کنڈی کی بے ترتیب اور تیز آواز کے نتیجے میں بوکھلایا ہوا صابر فوراً ہی باہر نکل آیا تھا۔

''صابر بھائی! ٹارچ لے کر جلدی میرے ساتھ آؤ۔ وہاں تالاب کے پاس کوئی گڑبڑ ہے۔'' دارا پہلوان کے گھبرائے ہوئے لہجے پر صابر علی نے بھی چند منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

''خیریت تو ہے نا......؟'' صابر علی کو سخت تشویش لاحق تھی۔

''بھائی صاحب! میں نے تالاب پر کسی مرد اور عورت کی آواز سنی ہے۔''

''کیا......؟'' صابر علی اس کی سرگوشی پر ٹھٹک گیا تھا۔

''ارے رک کیوں گئے۔ جلدی کرو، رنگے ہاتھوں پکڑو ان مردودوں کو......'' وہ دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے تالاب کی طرف گئے تھے۔

''دارا! چوکیدار کو ساتھ نہ لے لیں۔'' صابر علی نے چوکیدار کی تیز سیٹی کی آواز سن کر کہا تو وہ جھلا گیا۔

''او اسے بھی بلا لیں گے پہلے انہیں تو پکڑو۔'' دارا پہلوان نے انہیں بازو سے پکڑ کر آگے کی طرف گھسیٹا تھا۔ تالاب کے پاس پہنچتے ہی صابر علی نے ٹارچ جلا کر سرعت سے روشنی کا ایک گولہ سا سب جھاڑیوں پر پھینکا تھا۔

''اوئے کون ہے ادھر؟'' دارا پہلوان نے لاٹھی زمین پر مارتے ہوئے للکارا تھا، جواباً ایک طویل خاموشی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

صابر علی نے ٹارچ کی روشنی سے یہاں وہاں سب جھاڑیوں کو کھنگال ڈالا تھا، مگر یہاں اگر کوئی تھا بھی تو اب جا چکا تھا۔

''بس ...... انہیں بھنک پڑ گئی ہماری آمد کی ...... یا پھر چوکیدار کی سیٹی نے ہوشیار کر دیا ہوگا انہیں......'' صابر علی نے کہا تو دارا پہلوان تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

''میں نے بھی بے وقوفی کی ...... مجھے اسی وقت چھاپہ مار دینا چاہئے تھا پر میں نے سوچا......'' دارا پہلوان کو قلق تھا کہ وہ ایک ڈرامائی سچویشن کا ''ہیرو'' بننے سے محروم رہ گیا۔

''ارے ...... وہ دیکھو'' صابر علی نے اچانک ہی ٹارچ ایک جگہ پر فوکس کرتے ہوئے چونک کر کہا تو دارا پہلوان بھی آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ وہاں جھاڑیوں کے عقب میں گھاس کافی مسلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اس جگہ سے ذرا نزدیک آ گئے تھے اور یہاں کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے اور بجھی ہوئی سگریٹ کے ٹکڑے بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔

''دیکھا ...... میں نے کہا تھا نا ...... یہاں کوئی تھا ضرور؟'' دارا پہلوان کو خوشی تھی کہ وہ صابر علی کے سامنے جھوٹا نہیں پڑا۔

''اوئے ...... خبردار ...... کون لوگ آں تسیں ......'' چوکیدار کی کرخت آواز پر وہ دونوں چونک گئے۔

''آؤ رحمت! بھئی میں دارا پہلوان ...... صابر بھائی بھی ساتھ ہے۔'' دارا نے آواز لگائی۔

''اوتم لوگ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو......؟''

چوکیدار بھی ان کے پاس چلا آیا۔

''میں تو پانی لگانے جا رہا تھا ...... مگر یہاں ...... تم بھی دیکھو ذرا ......'' دارا پہلوان نے اپنی بات بمعہ ثبوت اسے سنائی تھی۔

''کیا تم نے پہچانا نہیں۔ وہ تھے کون کون......؟''

''ارے کون ہوگا......؟'' یہ سالی بیٹھی نہیں گاؤں میں ...... چکلہ بنا کر چھوڑے گی۔'' دارا پہلوان کا اشارہ شام روپ کے گھر کی طرف تھا۔

''کیا تم نے دیکھا تھا اسے۔'' صابر علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے دیکھا نہیں صابر بھائی پر عقل تو کام کرتی ہے نا ...... کتنی دیر لگی ہوگی مجھے آپ کے گھر تک جانے اور پھر واپس آنے میں ...... کوئی چھلاوا تو تھا نہیں جو گھڑی بھر میں غائب ہو گیا ہوگا ...... اس کے گھر کی پچھواڑ ہے یہ ...... ذرا آہٹ سنی ہوگی اور دیوار پھلانگ کر گھر کے اندر'' دارا پہلوان کے پریقین لہجے پر صابر علی گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔

''یہ تو تمہارا اندازہ ہے نا ...... خدا جانے حقیقت کیا ہے؟ بہر حال تم فی الحال گاؤں میں کسی سے اس بات کا تذکرہ مت کرنا ...... اور ہاں رحمت! تم بھی ذرا محتاط رہا کرو ...... میرا خیال ہے اب چلتے ہیں ...... اور دعا کرتے ہیں کہ وہ جو کوئی بھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اللہ انہیں نیک راہ دکھائے۔''

''آمین جی آمین ...... میں تو کھیتوں کی طرف جا رہا ہوں۔ رحمت تم ذرا صابر بھائی کو گھر تک

پہنچا دینا۔"

دارا پہلوان چوکیدار سے کہتا ہوا اپنے راستے پر چل دیا تھا اور جب سرگی ویلے دارا پہلوان کھیتوں سے لوٹ رہا تھا تو تالاب کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے تھکے ماندے جسم میں چستی بھر گئی تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ گھر پہنچا تھا۔ جہاں اس کی بیوی نے اسے دیکھتے ہی ساری کھوری بھٹی میں جھونکی تھی اور جھٹ پٹ پیڑا بنا کر روٹی بیلنے لگی تھی۔

"اے بلو کی اماں...... رات پتا ہے کیا ہوا......؟" وہ منہ ہاتھ دھو کر سیدھا اسی طرف چلا

"مجھے کیا پتا کیا ہوا؟ سارا دن اس کام دھندے میں جان کھپاتی ہوں رات کو چارپائی پہ ہوں تو مجھے تو اپنا ہوش نہیں رہتا۔" بلو کی اماں نے لسی سے بھرا جگ اور مکھن سے بھری گڑوی کے سامنے رکھتے ہوئے بڑی بے زاری سے کہا۔

"اوہو...... تو ہر بات میں اپنا سیاپا نہ ڈال لیا کر...... میری بات سن ذرا...... ہوا یوں کہ...

دارا پہلوان بڑی رازداری سے اسے ساری بات بتانے لگا۔

"ہائے...... ہائے...... ابھی تو مہینہ بھی نہیں ہوا اسے گاؤں میں آئے اور اس نے ابھی اپنے کرتوت دکھانے شروع کر دیئے۔" بلو کی اماں بات سننے میں اس قدر محو ہوئی کہ توے پر روٹی دھواں دینے لگی تھی۔

"او بے کرتوت عورت...... ذرا ادھر بھی دھیان کر...... روٹی جل گئی ساری۔" دارا پہلوان چلانے پر اس نے اپنا سر پیٹ لیا تھا پھر جلی ہوئی روٹی اتار کر ایک طرف رکھنے کے بعد وہ تیزی دوسرا پیڑا بنانے لگی تھی۔

"اور ہاں...... ابھی اس بات کا ذکر ادھر ادھر مت کرنا...... اچھا......" دارا پہلوان کی تلقین بلو کی اماں نے جھٹ سر ہلا دیا تھا۔ لیکن جب صغریٰ دن چڑھے اس سے پاؤ بھر دیسی گھی ادھ مانگنے آئی تھی تو وہ اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا رسوئی میں لے آئی۔ تھوڑی دیر گھسر پھسر کرنے بعد وہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتی رسوئی سے باہر آ گئی تھیں اور جب صغریٰ اپنے گھر واپس جا وقت اماں رحمتے کے پاس اس کے پوتے کی آمد پر مبارکباد دینے کے لئے گھڑی بھر کے لئے رکی تو گلی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے بڑی احتیاط سے اماں رحمتے سے شام روپ کا ذکر کیا تھا۔

"صبح سے دیکھا نہیں شام روپ کو......"

"ہاں...... سنا ہے چودھرائن نے بلوایا تھا اسے...... امداد کے طور پر اناج، دالیں دے ر تھی۔ مگر شام روپ نے انکار کر دیا کہ کھاؤں گی تو بس اپنی محنت کی روزی کھاؤں گی۔"

"لو اور سنو...... اسے ایسی امداد کا کیا کرنا ہے اماں...... بہت سے بیٹھے ہیں اس کا خیال رکھنے......؟" اس کی معنی خیز بات پر اماں رحمتے نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے اس کا چہرہ ٹٹولا۔

"کیا بات کر رہی ہو صغریٰ......؟" اماں رحمتے نے تعجب سے پوچھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں! وہ تو رات کو دارا پہلوان سے چوک ہو گئی ورنہ موقع پر دھر لی جاتی ہی اور وہ مسٹنڈا بھی جو اس کے ساتھ تھا۔"

"اللہ...... توبہ......" اماں رحمتے کان پکڑے گھر کی طرف بھاگی تھی اور پھر یہ بات جنگل میں لگی آگ سے بھی زیادہ تیزی سے پورے گاؤں میں پھیلی تھی اور جب گاؤں کی کسی منچلی چھوکری نے بڑی شرارت کے طور پر مسکراتے ہوئے شام روپ سے پوچھا۔

"ری شام روپ......! اتنا تو بتا دے...... رات تیرے ساتھ کون تھا؟"

تو شام روپ کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹ گیا تھا اور وہ نہایت عجیب انداز سے اس کو دیکھنے لگی تھی۔

"مجھے کیوں گھور رہی ہے ایسے...... میں کوئی تیری نگرانی پر تھوڑا کھڑی تھی۔ مجھے بھی ادھر ادھر سے ہی خبریں ملی ہیں...... یونہی پوچھ لیا......" وہ کندھے اچکا کر چلتی بنی تھی اور شام روپ کی آنکھوں میں جیسے جلتا ہوا سورج اتر آیا تھا۔

اور یہ اس سے چند روز بعد کی بات تھی، جب چوکیدار کی سیٹیوں کی آواز سے پورا گاؤں گونج اٹھا تھا۔ اور بے ہنگم سے شور نے سوئے ہوئے افراد کو ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نیند سے جاگ جانے والے لاٹھیاں سنبھالے، پکارتے للکارتے اس سمت بھاگے تھے جہاں چوکیدار کی سیٹیوں کے ساتھ اب بہت سے لوگوں کی آوازیں بھی گونجنے لگی تھیں۔

"خدا کی قسم...... میں نے اپنی آنکھوں سے یہاں ایک مرد اور ایک عورت کو دیکھا تھا۔ میرے پکارنے پر وہ لوگ بھاگ گئے۔"

"اوئے تو نے پیچھا کیوں نہیں کیا؟" تالاب کے اردگرد ایک جمگھٹا سا بن گیا تھا۔

"لو جناب...... میں کہاں تک پیچھا کرتا...... یہ گھور اندھیری رات...... آسمان بادلوں سے ڈھکا...... چاند کا نام و نشان نہیں...... ایک دو گلیوں تک پیچھے بھاگا پھر آگے کسی کا کچھ پتا ہی نہیں چلا......" چوکیدار نے اپنی مجبوری کا رونا رو دیا۔

"اور جو ٹارچ تمہیں دلوائی تھی چندہ جمع کر کے وہ......"

"او بھائی! جب میں ان کے پیچھے بھاگنے لگا تو تالاب کے پاس میرا پاؤں پھسل گیا۔ ٹارچ تو

تالاب میں گری ہی تھی باؤ...... میں تو اپنی جوتی بھی گنوا بیٹھا......''

''حد کرتے ہو بھئی...... پہلے لالٹین گنوائی...... اور اب ٹارچ...... اور کہیں ایسا نہ ہو
اٹھیں تو پتا چلے رحمت چوکیدار گم ہوگیا ہے۔''

''کون سا وقت ہے بھئی مذاق کرنے کا...... اور رحمت اگر تم ٹھیک طرح سے چوکیداری
کر سکتے تو سیدھے سیدھے بتاؤ، ہم کسی اور بندے کا بندوبست کرلیں۔ یہ کوئی بات تو نہ ہوئی نا
کل کلاں اگر کوئی چور ڈاکو تمہیں یوں چکمہ دے کر نکل جائے تو......'' نیاز علی غصے کا کچھ زیادہ ہی

''اور بھائی زیادہ طیش میں نہ آؤ رحمت کو ہم نے پولیس میں بھرتی نہیں کیا، چوکیداری یہ
ہے اور چوکیدار کا کام بس اتنا ہے کہ کوئی گڑبڑ دیکھے خطرہ محسوس کرے تو سب لوگوں کو خبردار
دے...... چوکنا کردے...... اور یہ کام رحمت نے کیا ہے۔'' صابر نے تحمل سے کہا۔

''ہاں...... بڑا کمال کیا ہے اس نے سیٹیوں پہ سیٹیاں بجاکے...... اپنے گھروں کی رکھوالی خ
ہم نے ہی کرنی ہے تو یہ ہر مہینے پیسے کس چیز کے وصول کرتا ہے......'' نیاز علی ہتھے سے اکھڑنے لگا

''کسی چیز کے پیسے وصول نہیں کرتا...... میں تو مفت کا کھاتا ہوں نیاز علی......'' رحمت کو ک
پہنچا تھا اس کی بات سے۔

''صابر بھائی! میں ایک غریب بندہ...... گاؤں والے جو کچھ دیتے ہیں بغیر کچھ کہے قبول کرلیتا
ہوں...... میرا تو گھر کا خرچا پورا نہیں پڑتا...... پھر نیند، آرام، چین سکون...... سب ختم...... جان ہتھیلی
پہ رکھے گلی گلی گھومتا ہوں۔ پھر بھی آپ لوگ مجھ سے خوش نہیں تو میں آج سے یہ کام چھوڑ دیتا ہوں۔
جس کا دل چاہے چوکیداری سنبھال لے۔''

''ارے...... ارے...... ناراض مت ہو...... نیاز علی نے تو یونہی کہہ دیا...... ورنہ تمہارے
آسرے پہ تو ہم راتوں کو چین سے پڑے رہتے ہیں۔'' صابر نے رحمت چوکیدار کو تسلی دی تھی۔

''یہ نیا مسئلہ کیوں کھڑا ہوگیا۔ صابر بھائی......؟ اب دونوں کا بھی تو سوچو جو شرم وحیا اتار کے
ہر روز یہاں آجاتے ہیں۔'' دارا پہلوان نے اصل موضوع کی طرف توجہ دلائی۔

''سوچنا کیا ہے دارا پہلوان! وہ دونوں جو کوئی بھی ہیں اسی گاؤں کے ہیں اور اس گاؤں میں
کون بستا ہے۔ ہمارے اور آپ کے سوا...... ہماری بہنیں بھی ہیں اور بیٹیاں بھی...... اپنے مال کی
آپ حفاظت کی جائے تو کون ہے جو لوٹ کرلے جائے۔ چلیئے...... اپنے گھروں کو چلتے ہیں رات
بہت بیت گئی ہے...... اور رحمت تم دل چھوٹا کیئے بغیر اپنا کام جاری رکھو۔ ہمیں تم سے کوئی شکایت
نہیں......''

صابر علی نے بہت پتے کی بات اپنے عام سے لہجے میں کہی تھی اور گھر کی طرف چل دیا تھا۔
لوگوں نے اس کی تقلید کی تھی، لیکن رحمت چوکیدار کتنی ہی دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا تھا۔ اس کے
ہیں نیاز علی کی باتوں سے جو پھانس چبھی تھی وہ مسلسل اسے کچوکے لگا رہی تھی اور اگلی ہی صبح جب
کے چیدہ چیدہ لوگ چودھری کی بیٹھک میں جمع تھے اور اسے رات کی ساری رام کہانی سنا
تھے تو چودھری حیرت سے سوچ رہا تھا کہ رات کو اتنا ہنگامہ ہوا اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ شاید
لئے کہ حویلی کی بلند دیواروں نے اسے کسی لٹیرے کے حملے کے خوف سے بالکل آزاد کر رکھا
یہ چودھری کی سوچ سے بے نیاز بیٹھا نیاز علی رحمت چوکیدار کی شکایت کے لئے پر تول رہا تھا۔ عین
رات دھاڑ سے بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا اور رحمت چوکیدار اپنی اتھل پتھل، بے ترتیب سانسوں
ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

''رب خیر کرے...... کوئی پاگل بھینس تو نہیں لگ گئی تیرے پیچھے۔'' چودھری بختیار نے حیرت
رحمت کو دیکھا جو اپنے سرخ چہرے کے ساتھ بے حال ہوا جا رہا تھا۔

''چودھری جی...... نشانی مل گئی ہے...... ثبوت مل گیا ہے جی...... اب ہم ڈھونڈ نکالیں گے
''

''کس کی نشانی...... کس کا ثبوت...... ادئے بات تو ٹھیک سے بتا......'' چودھری جھنجلا گیا تھا
رحمت نے اپنے صافے میں لپیٹا ہوا ست رنگا دوپٹہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''یہ دیکھیں جی...... یہ دوپٹہ تالاب کے پاس جھاڑیوں میں پھنسا ہوا تھا...... اب پتا کرائیں
ھری کہ یہ دوپٹہ کس کا ہے؟''

''یہ ہوئی ناں بات رحمت...... ان دونوں کو پکڑ کے بیچ چوپال میں ایک بار چھترول ہوگئی نا تو
رہ کسی کی جرأت نہ ہوگی ایسی بے حیائی دکھانے کی......'' نیاز علی نے اٹھ کر رحمت کی پیٹھ ٹھونکی تھی
اس دوران وہ چودھری کی زرد ہوتی رنگت اور ہاتھوں میں اترتے رعشے کو نوٹ نہ کرسکا تھا۔

''او چپ کر جا نیاز علی......'' دوپٹے کو دونوں ہاتھوں میں بھینچتے ہوئے چودھری بختیار دھاڑا

''کیا ہوا چودھری......؟'' نیاز علی چودھری کی بدلتی حالت پر حیران رہ گیا تھا۔

''تیری مت ماری گئی ہے نیاز علی...... ایسی باتیں بیچ چوراہوں میں کرنے والی نہیں ہوتیں۔
ئے اس گاؤں سے باہر بھی ہماری کوئی عزت ہے۔ بات دوسرے پنڈ میں پہنچ گئی تو وہاں کے لوگ
رے منہ پہ جوتیاں ماریں گے...... سر پہ خاک ڈالیں گے...... ہر بات کو اتنا اچھالا نہیں کرتے۔

آئی سمجھ...... اندر ہی اندر یہ معاملہ بھی نمٹا لیں گے۔ اب جاؤ تم لوگ میں خود پتا کرا لوں گا۔ یہ د
کس کا ہے؟"

چودھری کی آنکھوں میں وحشت اور نمی ایک ساتھ اتر آئی تھی...... اور اس کی آواز
کپکپاہٹ تھی اور وہ سب لوگوں کو ہکا بکا چھوڑ کر حویلی کے اندرونی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس کا
سیدھا اپنی لاڈلی بیٹی ثریا کے کمرے کی طرف تھا' مگر برآمدے میں رنگین چارپائی پہ بیٹھی چودھ
نے اسے روک لیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو چودھری......؟"

اور چودھری آنکھوں میں خون لئے اس کی طرف پلٹا تھا۔

"کہاں ہے وہ تیری لاڈو......؟"

"کون ......؟ ثریا...... سو رہی ہے اپنے کمرے میں کیوں؟" اس نے سوالیہ نظروں
چودھری کو دیکھا تو وہ تلملا گیا۔

"کیوں کی کچھ لگتی ...... یہ دیکھ...... یہ وہی دوپٹہ ہے ناں جو پچھلی عید پر اس نے شہر سے
تھا۔" چودھری نے دانت پیستے ہوئے دوپٹہ چودھرائن کے منہ پر اچھال دیا تھا۔

"ہاں...... ہاں...... وہی ہے پر تیرے پاس کہاں سے آیا؟"

"چوکیدار دے کر گیا ہے مجھے...... یہ تالاب کے پاس جھاڑیوں سے ملا ہے جہاں سے
مرد اور ایک عورت رات گاؤں والوں کو چکمہ دے کر بھاگ گئے تھے۔"

"کیا......؟" چودھرائن کا رنگ آناً فاناً اڑ گیا تھا۔

"اب بلا اسے...... اور پوچھ کہ یہ دوپٹہ وہاں کیسے پہنچا۔ اگر وہی سچ ہے جو نظر آ رہا ہے
لے میں اسے یہیں حویلی کے صحن میں زندہ گاڑ دوں گا۔ بلا اسے ...... ثریا...... ثریا......" چ
آپے سے باہر ہوتے ہوئے دھاڑا تھا۔

"آہستہ چودھری آہستہ خوامخواہ تماشا نہ بنا...... وہ کیا بتائے گی کہ دوپٹا وہاں کیسے پہنچا
اس کے پاس تھا ہی کب۔"

"تو پھر کس کے پاس تھا۔"

"یہ تو میں نے کل ہی اس کلموہی شام روپ کو دیا تھا۔ حویلی کی صفائی ستھرائی کے لئے
اسے۔ واپس جانے لگی تو کچھ اناج اور دالیں اس دوپٹے میں باندھ کر اسے دی تھیں۔ ثریا
کے قابل کہاں رہا تھا۔ سو میں نے کہہ دیا تھا اپنے پاس ہی رکھ چھوڑے۔" چودھرائن نے اصل

پ بی بی! اس کے ساتھ کا سوٹ تو اب بھی ثریا باجی نے پہن رکھا ہے۔" یہ شادو تھی ہمیشہ
...... باورچی خانے سے نکل کر خوامخواہ ہی کہہ ڈالا تھا اور چودھرائن نے خونخوار نظروں سے
ورا تھا' جیسے گولی سے اڑا دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔

یں نے یہ تو نہیں کہا کہ سوٹ بھی اسے دے دیا تھا۔ ثریا نے کہہ دیا تھا جس روز اتاروں
کر لے جانا...... اور چودھری تم کیوں حال سے بے حال ہو رہے ہو......؟ اپنے خون پر اعتبار
ہیں......؟ اور ہماری دھی تو کبھی حویلی کے دروازے تک نہیں گئی۔ تم نے کیسے سوچ لیا کہ
...... اللہ معاف فرمائے...... بے چاری ثریا کو پتا چل جاتا تو رو رو کر جان ہی نہ دے
ے جاؤ اور پوچھو اس بدبخت شام روپ سے کہ کون سا گل کھلانے جا رہی ہے۔" چودھرائن
میں شام روپ کے لئے حقارت ہی حقارت تھی۔

اس سے پہلے تمہیں نہ پوچھ لوں کہ جب میں نے اس کا حویلی میں داخلہ بند کر رکھا ہے تو تم
کس خوشی میں یہاں بلوایا تھا۔" حقیقت جان کر چودھری کے دل میں اطمینان تو بھر گیا تھا'
ے کا اظہار کئے بغیر رہ بھی نہ سکا تھا۔

"آئے ہائے...... میں کس خوشی میں بلواؤں گی اس کم ذات کو...... چودھری! میری خوشی میں
ہونے والے بہتیرے ہیں۔ وہ تو حویلی میں کام کچھ زیادہ تھا سو اس کو کہلوا دیا۔" چودھرائن
ھری کی بات کا برا مناتے ہوئے وضاحت کی۔

"نہ تو وہ ایک ہی رہ گئی ہے کام کاج کرنے والی۔ حویلی کی ساری نوکرانیاں کہاں مر کھپ گئی

"ارے مرنا کہاں ہے۔ انہوں نے ...... ادھر ہی تھیں مگر یہ مریل جانیں کام کہاں کرتی ہیں۔
وتی ہیں میرا اور بس...... مجال ہے کہ کوئی کام بھی میری پسند کا کریں اور وہ شام روپ......
ب باتیں اپنی جگہ پر وہ کام کرتی ہے بجلی کی طرح...... کل پانچ، چھ من گندم چھان پھٹک کر
میں بھر گئی تھی۔ چار بڑی چارپائیاں دھو کر گئی تھی۔ کسی اور کو یہ کہتی تو اللہ جانے کتنے دن
...... اور ویسے بھی چودھری ...... اب ماشاء اللہ میری اولاد جوان ہو گئی ہے۔ شام روپ صبح
...... شام آئے ...... مجھے اب کوئی فکر نہیں۔"

چودھرائن چارپائی پہ نیم دراز ہو کر پنکھا جھلنے لگی تھی۔ اسے وہ دن بھولے نہیں تھے جب
ری بختیار چار بچوں کا باپ ہونے کے باوجود سولہ سترہ سالہ شام روپ پر مرمٹا تھا اور اگر شام

روپ ہی اس گاؤں سے فرار نہ ہوگئی ہوتی تو آج چودھرائن کے سر پہ سوکن بنی بیٹھی ہوتی۔

''اوہو......ایک تو یہ تیری زبان......'' چودھری خوامخواہ ہی تلملا گیا۔

''او بے وقوف...... اتنا تو سوچ کہ اگر یہ دوپٹہ گاؤں کی کسی عورت کے ہاتھ لگ جاتا اور وہ پہچان جاتی کہ یہ ثریا کا ہے تو......؟ یا اگر وہ شام روپ ہی مکر گئی کہ یہ دوپٹہ اس نے نہیں لیا تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری......؟''

''واہ چودھری! تیرا ابھی جواب نہیں...... میں پوچھتی ہوں پورے گاؤں میں ہے کوئی ایسا جو ہماری ثریا پر اتنا رکیک الزام لگائے اور کون ہے جو اس شام روپ کے مقابلے میں ہمیں غلط سمجھے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کس ماں کی بیٹی ہے اور خود اس کے اپنے کیا کرتوت ہیں......'' چودھرائن زہر خند لہجے میں کہہ رہی تھی اور چودھری بختیار اسے کسی طرح قائل نہ ہوتے دیکھ کر سر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

''اچھا...... اچھا...... زیادہ بولا نہ کر...... اور آئندہ خبردار رہنا کوئی ضرورت نہیں اسے یہاں بلانے کی اور کام کروانے کی......''

چودھری نے قدرے ناراضی سے کہا اور باہر کی طرف چل دیا وہ ذہن میں اس کہانی کو دوبارہ ترتیب دے رہا تھا جو اس دوپٹے کی بابت گاؤں والوں کو سنائی تھی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ رحمت اپنی اعلیٰ کارکردگی کی داد وصول کرنے کے لئے دوپٹہ ملنے کی خبر گاؤں میں عام کر چکا ہوگا۔



مائی بھاگاں روٹیوں کی چنگیر سر پہ رکھے ہاتھ میں لسی کا ڈول تھامے اپنے بیٹے اشرف کے لئے کھانا لے کر کھیتوں کی طرف جا رہی تھی جہاں گندم کی کٹائی زوروں پر تھی۔ پگڈنڈی پر اس کے بوڑھے قدم بڑی روانی سے فاصلہ طے کرتے جا رہے تھے۔ گرمی اپنے عروج پر تھی اور پسینہ اس کے سر سے لے کر ایڑیوں تک بہہ رہا تھا۔ چھدرے درختوں کے سائے تلے سے گزرتے ہوئے اس نے دائیں طرف بہتے کھالے کے پرسکون اور ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا تھا اور جب وہ کھیت میں پہنچی تو اشرف اسے دیکھتے ہی درانتی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جب تک مائی بھاگاں شیشم کے درخت کی گھنی چھاؤں تلے بچھی چارپائی تک پہنچی تھی۔ اشرف کھالے کے پانی سے ہاتھ منہ دھو چکا تھا۔ چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے اس نے چنگیر اپنی طرف کھسکائی۔

''بے بے! کھالے تو بھی۔''

''نہ پتر تو کھا...... میں تو اب گھر جا کر ہی کھاؤں گی۔''

بڑے سبھاؤ سے انکار کرتے ہوئے مائی بھاگاں نے چارپائی سے سرخ جھالر والا پنکھا اٹھا کر ...ع کر دیا تھا۔ مکھن سے چپڑی ہوئی تندوری روٹی لسوڑھے اور آم کا اچار اور ٹینڈوں کا سرخ ...والا سالن۔ اشرف کو رغبت سے کھاتے دیکھ کر مائی بھاگاں نے ٹھنڈی ٹھار لسی کا بڑا سا ...کر اشرف کی طرف بڑھایا اور خود گندم کے خالی ہوتے کھیتوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔ گاؤں ...کی تھے اور کمیاں جن میں سے ایک شام روپ بھی تھی۔ تیز چبھتی ہوئی دھوپ سے بے ...ململ کا بڑا سا دوپٹہ اپنے وجود کے گرد لپیٹے وہ اپنے کام میں بری طرح مصروف تھی۔ پسینے ...سانولی رنگت دھوپ کی وجہ سے کچھ اور بھی گہری ہوگئی تھی۔ مائی بھاگاں یونہی بے دھیانی ...اس پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ تب ہی شام روپ اٹھی تھی اور کٹی ہوئی گندم کی چھوٹی چھوٹی ...اٹھا کر بڑے ڈھیر پہ رکھنے لگی تھی اسی دوران اس کا دوپٹہ اس کے جسم سے سرکا تھا اور مائی ...کی آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپک گیا تھا۔

''ہائے میں مرگئی......'' اس نے دہل کر اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا تو کھانے میں مشغول اشرف ...ح چونک گیا۔

''کیا ہوا بے بے......؟'' اشرف نے پوچھا مگر بے بے تو جیسے سکتہ ہی ہوگیا تھا۔

''بے بے! بتاتی کیوں نہیں کیا ہوا ہے......؟ او کوئی پھنئیر تو نہیں دیکھ لیا......؟'' اشرف نے ...سے ماں کی اڑی اڑی رنگت دیکھی اور پھر اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''ہاں پتر! پھنئیر ہی سمجھ لے...... بے غیرتی اور بے حیائی کا پھنئیر...... جانے کس کس کو ...''

''نہیں...... بے بے! کیا بول رہی ہے......؟'' اشرف ہونق بنا ہوا تھا۔

''یہ...... یہ شام روپ کیا کر رہی ہے ادھر......؟'' بے بے کی بات سن کر اشرف کی چونکتی ہوئی ...روپ تک گئی اور پھر پلٹ کر ماں کے چہرے پہ جم گئی تھی۔

''گندم کی کٹائی کے لئے کمیوں کو بلایا تھا...... یہ بھی آ گئی تھی سو کام پر لگا دیا...... کیوں......؟ ...ہے......؟''

بے بے نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس اس پھرتی سے چارپائی سے اتری تھی گویا موت کا ...س کے سر پہ کھڑا ہے اور اگر لمحے کی دیر بھی اس نے کی تو وہ فوراً اسے دبوچ لے گا۔ جلتی بھنتی، ...میں بڑبڑاتی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی شام روپ کے سر پہ جا پہنچی تھی۔

''اٹھ کڑیئے......'' اس نے بڑی بے رحمی سے درانتی اس کے ہاتھ سے کھینچی تو شام روپ کے

لبوں سے آہ نکل گئی تھی۔ درانتی کے تیز دندانے اس کی ہتھیلی کو چیر کے رکھ گئے تھے۔
ہاتھ لہو سے بھر گیا تھا۔

''سنا نہیں...... اٹھ ادھر سے...... ہمیں ضرورت نہیں تیری...... اٹھ جا...... حساب کتاب
میں ہو جائے گا۔''

مائی بھاگاں کو اس کے ہاتھ کا بہتا لہو ناپاک محسوس ہو رہا تھا۔ شام روپ نے کچھ کہنے کے لئے
لب کھولے پر مائی بھاگاں نے کچھ سن کر ہی نہ دیا۔ بازو سے پکڑا اور کھینچتی ہوئی کھیت سے باہر
آئی۔

''اری گناہوں کی پوٹ ہو گئی تو تو...... بے غیرتی کا بوجھ اٹھاتے پھرتی ہے ڈائن...... جا کہیں
چلو بھر پانی میں ڈوب مر......''

مائی بھاگاں نے اسے کراہت آمیز نفرت کے ساتھ دھکا دیا۔ حواس باختہ سی شام روپ بھی
طرح لڑکھڑائی اور بچتے بچتے بھی کھالے کے کنارے کی گیلی چکنی مٹی سے پاؤں پھسل گیا۔ بے
اختیار ہی ٹاہلی کو تھام کر گرنے سے تو بچ گئی تھی مگر پیروں میں پہنی چپل ٹوٹ کر کھالے کے پانی میں
غائب ہو گئی تھی۔ اس نے چپل ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ یونہی کھالے کے پاٹ کو پھلانگ گئی۔
پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک کی جھلستی ہوئی دھول اس کے ننگے پیروں سے لپٹنے لگی تھی۔
دہکتا ہوا سورج اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھرے پانی میں تیرنے لگا تھا۔ اس نے
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں میں تیزی بھر دی تھی۔

آگ اگلتی زبانیں...... خوب لمبی ہو کر اس کے تعاقب میں آنے لگی تھیں۔ وہ جلد از جلد
یہاں سے دور چلے جانا چاہتی تھی۔

◆◆◆

مائی بھاگاں کی بات سن کر لمحہ بھر کی خاموشی نے تمام عورتوں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

''بے بے! سچ کہہ رہی ہے تو......؟'' کسی ایک نے یقین دہانی چاہی تو مائی بھاگاں برا مان
گئی۔ ''چھ نواسے، نواسیاں ہیں میرے...... گھر میں چار بہوئیں ہیں۔ ماشاء اللہ سے، کل ملاؤ تو
پوتے، پوتیاں ہیں میرے...... خود میں نے نو بچے جنے ہیں...... ارے میں تو چہرے کی رنگت دیکھ کر
بتا دوں کہ فلاں عورت دوسرے جی سے ہے...... اور وہ شام روپ...... توبہ...... توبہ...... جو میں
اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ جھوٹ نہیں۔'' مائی بھاگاں نے قطعی لہجے میں کہا تھا اور ہر گزرتے دن
ساتھ شام روپ کے پھیلتے بڑھتے وجود نے گویا مائی بھاگاں کی ہر بات کی تائید و تصدیق کر دی تھی۔

آنِ واحد میں ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ وقت گزاری اور دلچسپی کے لئے ایک بار پھر موضوع
بن گیا تھا۔

کھیتوں میں کام کرتی عورتیں......
چوپال میں بیٹھے مرد......
تھڑوں پہ مسخریاں کرتے بانکے چھبیلے......
اور کڑھائیاں کرتی رنگین دھاگوں میں الجھی ناریاں......

کون تھا کہ جس کی سرگوشیوں میں شام روپ کا نام نہیں آتا تھا...... اور ایسی ہی ایک شام
چودھری بختیار کی حویلی کے سامنے گاؤں کے مرد چارپائیوں پر پھنسے بیٹھے، حقے کے کش لگانے
کے ساتھ ساتھ دودھ کی میٹھی لسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور کچی مٹی پر پانی کے چھڑکاؤ سے ایک
اور باس شام کی لالی میں گھلی جا رہی تھی تو تمام مرد ''سائیں'' کی ہیر کو بھول بھال کر شام روپ کا
قصہ لئے بیٹھے تھے اور تب چودھری بختیار نے مولوی صاحب کو پکار کر اپنے ساتھ بٹھایا تھا اور حقے
کی نے نیاز علی کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی طنزیہ نگاہوں سے مولوی صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں مولوی صاحب...... اب کیا کہتے ہیں......؟''

''کس بارے میں......؟'' مولوی صاحب نے محتاط سا لہجہ اپنا کر پوچھا تھا۔

''کیوں انجان بنتے ہو جی......؟ اسی بے حیا عورت کی بات کر رہا ہوں...... بات اڑتے
اڑتے آپ تک بھی پہنچی ہو گی نا......؟'' چودھری بختیار کی بات پر مولوی صاحب بہت دیر تک چپ
چاپ اپنی رعشہ زدہ انگلیاں سفید داڑھی میں پھیرتے رہے تھے۔

''پنچایت اکٹھی کرو...... اسے بھی بلاؤ...... پوچھو وہ کیا کہتی ہے اور جب جان لو کہ تم حق پر ہو
تو اسے وہی سزا دو جس کی وہ حقدار ہے......'' انہوں نے کافی دیر بعد کہا۔

''گاؤں سے نکال دیں جی......'' کوئی جوشیلا نوجوان چلایا تھا، مگر اب کی بار اکثریت خاموش
رہی۔ گاؤں سے نکال دیتے تو قصہ ہی نہ تمام ہو جاتا...... ہر روز نئی تازی کہاں سے سننے کو ملتی۔
یہ تماشا...... وقت گزاری کا موضوع کوئی کیونکر اسے گاؤں سے نکالنے کی حمایت کرتا۔ بس یہ
کہ مردوں نے اپنی عورتوں کو اس کے سائے سے بھی بچنے کی تلقین کر دی اور ایک بار پھر گاؤں
کے ہر گھر کا دروازہ شام روپ کے لئے بند ہو گیا۔ کبھی راہ چلتے اس سے سامنا ہونے لگتا تو بیاہی
عورتیں نفرت سے منہ پھیر لیتیں...... کنواری لڑکیاں دوپٹوں میں منہ دے کر کھی...... کھی کرتیں ایک

دوسرے کو ٹہوکے دینے لگتیں۔ مرد کن اکھیوں سے اسے دیکھتے اور حد درجہ بے نیازی کا مظاہرہ
کرتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس کے قریب قریب سے گزر جاتے...... لڑکے جان بوجھ کر راستہ
روکتے بڑھ چڑھ کر قہقہے لگاتے، سیٹیاں بجاتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے نجانے کیا کیا
اشارے کرتے، یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنا راستہ بدل لیتی اور پھر یوں کہ رفتہ رفتہ وہ سب کی نگاہوں
سے اوجھل ہونے لگی...... اور وہ سب جو اس کی صورت کو دیکھنے تک کے روادار نہ تھے اب کھوج میں
لگ گئے۔ بہانے بہانے سے استفسار کیا جانے لگا اور جب کئی روز تک وہ گاؤں کے کسی راستے
...... کسی ٹھیلے...... کسی دکان پر دکھائی نہ دی تو تمام عورتیں ایک بار پھر رشیدہ کے گھر کے پچھواڑے جمع
ہونے لگیں، جہاں شام روپ کے گھر کا دروازہ صاف دکھائی دیتا تھا اور جہاں رشیدہ کی بہو نے گرم
گرم بوبلی کی پیالیاں سب کے ہاتھوں میں تھمائیں اور پھر ان سب کی باتیں سننے میں محو ہوگئی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہیں چلی گئی ہے۔" ایک کہتی تو دوسری فوراً اعتراض کرتی۔

"پر اس نے جانا کہاں تھا......؟"

"جہاں پہلے گئی تھی اور کہاں......"

"جتنی ذلت اٹھا رہی تھی اس سے تو بہتر تھا کسی کھوہ میں چھلانگ لگا کر مرگئی ہوتی۔"

"نہ گاؤں چھوڑ کر گئی ہے...... نہ کھوہ میں چھلانگ لگا کر مری ہے...... یہیں ہے اسی کوٹھڑی
میں...... اب اپنے دن بھی پورے کرنے ہیں اس نے کہ نہیں......" رشیدہ نے اچانک ہی انکشاف
کیا۔

"ہائیں...... تمہیں کس نے بتایا......؟"

"بتانا کس نے تھا...... خود آنکھوں سے دیکھتی ہوں...... کبھی صبح...... کبھی شام کے وقت گھر میں
دھواں اٹھتا ہے...... ایک رات پیر سائیں کی درگاہ کی طرف چراغ لے جاتے بھی دیکھا ہے
اسے......"

"تو کیا اپنے ہی گھر میں بند ہے......" "مگر کھاتی پیتی کہاں سے ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا......؟ اسے کھلانے پلانے والے کوئی کم ہوں گے
جس کا گناہ پیٹ میں لئے پھرتی ہے وہ کیا اس کے لئے اتنا بھی نہیں کرتا ہوگا......" رشیدہ کی صاف
کھری بات پر کئی بوڑھیوں نے اسے گھورا تھا کہ کئی کنواری لڑکیاں بھی پاس بیٹھی تھیں۔ رشیدہ نے
ایک نظر ان پر ڈالی اور پھر لب سی لئے۔

"خیر، دفعان کرو اس کو...... کوئی اور بات کرو......" صغریٰ نے اکتائے ہوئے انداز میں ناک

سے مکھی اڑائی۔

"یہ چودھری کی بیٹی ثریا کافی دنوں سے حویلی میں نظر نہیں آ رہی......؟"

"ہاں چودھرائن بتا رہی تھی۔ اپنی خالہ کے ہاں رہنے گئی ہے...... دو چار مہینے گزار کر ہی آئے
گی۔" شادو نے فٹ اطلاع دی۔

"اچھا...... اچھا...... حویلی تو سنسان ہوگئی اس کے بغیر...... ایک اکلوتی دھی تو ہے اپنے ماں
باپ کی......"

"ہاں تو اور کیا...... پھر ایسی نیک، شریف اور سگھڑ...... ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ کبھی جو ماتھے پر
بل پڑا ہو...... میں تو شادو سے بھی کہتی ہوں کہ تو دن رات اسی کے آس پاس رہتی ہے۔ کچھ تو بھی
عقل مت لیا کر اس سے...... مگر یہ ایسی بدبخت ہے کسی اچھی بات کا تو اثر ہی نہیں لیتی......" شادو
کی ماں نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ منہ بناتی اپنے آپ میں سمٹنے لگی تھی۔

"ارے رہنے دو شادو کی ماں! جیسی ہے اچھی ہے...... نیک ہے...... گلیوں سڑکوں میں تمہاری
عزت نہیں رولتی پھرتی...... اگر ہوتی شام روپ جیسی تو......"

"آئے ہائے...... اللہ نہ کرے مائی بھاگاں......! میری شادو ایسی معصوم...... ایسی پاکباز شام
روپ تو اس کے پیروں کی مٹی بھی نہیں......" شادو کی ماں کو آگ لگ گئی تھی۔

"ارے یہ ہی تو میں کہتی ہوں۔ بس دعا کیا کرو کہ اللہ ہر ایک کی بیٹیوں کو ایسا ہی نیک اور
عزت دار بنائے۔" مائی بھاگاں نے کہا تو سب عورتیں "آمین" کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔



رات کو نجانے کون سا پہر تھا جب نیم غنودگی میں پڑے صابر علی کو دستک کی مدھم سی آواز سنائی
دی تھی۔ اس کی تمام حسیات ایک دم ہی بیدار ہوگئی تھیں۔ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد جب وہ
اس دستک کو محض اپنا خیال سمجھتے ہوئے دوبارہ لیٹ گیا تھا تب ایک بار پھر دستک ہوئی تھی۔ پہلے سے
قدرے واضح...... وہ ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" اس نے پریشانی سے سوچا اور پھر آنکھیں ملتا ہوا دروازے تک
آ گیا۔

"کون ہے بھئی......؟" اس نے ایک ہاتھ دروازے کی بند کنڈی پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
جواباً کوئی کچھ نہیں بولا تھا۔ بس ہلکی سی سسکی کی آواز ابھری تھی۔ نسوانی آواز سنتے ہی وہ بری طرح
گھبرا گیا تھا۔

"کون......کون ہے باہر......؟"

"صابر چاچا......صابر چاچا......" کراہتی ہوئی آواز دروازے کی جھریوں سے بمشکل اس تک پہنچی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے کنڈی چھوٹ گئی تھی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتے ہوئے اس نے باہر جھانکا۔ دروازے کی سیڑھیوں پر ڈھیر پڑی وہ عورت شام روپ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پر جما ہوا تھا اور اگر صابر نے اسے دیکھ نہ لیا ہوتا تو شاید اگلا قدم اس کے ہاتھ کو کچل کے رکھ دیتا۔

"شام روپ......تم ...... اس وقت یہاں......؟" صابر علی نے بری طرح گھبراتے ہوئے اطراف میں دیکھا رات کے اس پہر شام روپ کو ان کے دروازے پر اگر کوئی دیکھ لیتا تو اگلی صبح یقیناً روز قیامت بن کر نمودار ہوتی۔

"کیا بات ہے صابر علی......؟ کون ہے......؟ بشیراں اپنے شوہر کے عقب میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"چاچا......! بشیراں چاچی سے کہہ میری مدد کرے۔" وہ بمشکل کہہ پائی تھی۔

"بشیراں چاچی......! تجھے اللہ اور رسول کا واسطہ میرے ساتھ چل۔" وہ روتی کرلاتی ان کے پیروں کو چھو رہی تھی۔ بشیراں نے سوالیہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر اس کا اشارہ پاتے ہی باہر نکل گئی۔

"ذرا محتاط ہو کر جانا۔ کسی کی نظر پڑ گئی تو ہماری کم بختی آ جائے گی۔" صابر علی نے بشیراں کے کان میں سرگوشی کی اور پھر اس وقت تک دروازے کے ساتھ لگا اطراف کا جائزہ لیتا رہا جب تک بشیراں شام روپ کو سہارا دیتی اس کی کوٹھڑی میں داخل نہ ہو گئی۔ ان کے جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں شکر کرتا دروازہ بند کر کے صحن میں آ گیا کہ گھر میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس کا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ سسرال میں گیا ہوا تھا۔

"اور اگر وہ یہاں ہوتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ بھلا میرے اور بشیراں کے علاوہ کون ہے گاؤں میں جو اس کڑے وقت میں شام روپ کی مدد کرتا۔"

وہ دل ہی دل میں شام روپ کی ہر مشکل کے آسان ہونے کی دعا کرتا صحن میں ٹہلنے لگا تھا اور اسے وہ لمحے یاد آنے لگے تھے جب ایسی ہی گھور اندھیری رات میں شام روپ نے ان کے گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ وہ سب گھر والے ہڑبڑا کر بیدار ہوئے تھے۔

"چاچا! ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے" وہ ڈری سہمی روئے چلی جا رہی

... وہ اسے وہیں بشیراں کے پاس بٹھا کر اپنے جگری یار افتخار کے پاس دوڑا چلا آیا تھا اور جب ...ر مرگ پہ پڑے افتخار کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اس نے صابر علی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"کچھ کر صابر علی...... کچھ ایسا کر دے کہ میری بچی رلنے سے بچ جائے...... وہ چودھری بختیار ...وہ ہر روز چلا آتا ہے۔ اپنے دیئے گئے دال، آٹے کا احسان جتلاتا ہے اور ایک ہی بات کہہ کر ...جاتا ہے۔ وہ تو میری ہاں، ناں کا انتظار کئے بنا ہی رشتہ پکا کیے بیٹھا ہے۔ پر میں وہاں راضی نہیں، ...علی......! وہ جوان بچوں کا باپ...... اور میری شام روپ بہت ہی معصوم...... بھولی بھالی...... وہ ...ہرائن اور اس کا پورا خاندان...... وہ کیا چھوڑ دیں گے میری بچی کو...... نہیں کبھی نہیں...... وہ شام ...پ کو زہر دے کر کسی اندھیری کوٹھڑی میں دفنا دیں گے اور پنڈ میں کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی تو میرا یار ...میرا دوست ہے۔ اتنا تو کر سکتا ہے ناں میرے لئے......؟"

اس کی دھنسی ہوئی بے رونق آنکھوں میں بڑی امید تھی...... دوستی کا مان تھا...... اور صابر علی ...یئے بیٹھا رہا تھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ چودھری کے سامنے اٹھ کھڑا ہوتا تو گاؤں میں کیسے رہتا۔ ...لمحے کے لئے سوچا۔ شام روپ کو اپنے بیٹے سے بیاہ دے مگر پھر چودھری کے ہاتھوں جوان ...کا خون ہوتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے تو پورے گاؤں میں اپنی اور شام روپ کی شادی کی ...پھیلا رکھی تھی۔ اب اس کی منگ کسی اور سے بیاہی جاتی تو کیا وہ زندہ چھوڑ دیتا انہیں۔ عجب ...ل تھی مگر دوست کو ناامید کرنا اس سے بھی اوکھا تھا۔ بس سر جھکائے دبے دبے لفظوں میں تسلی کے ...بولتا رہا اور جب افتخار نے دوا کے زیر اثر چپ سادھ لی تب وہ اٹھ کر چلا آیا۔ بعد میں ایک دو ...اس سے ملنے گیا مگر وہ چپ چاپ چھت کی کڑیاں گنتا رہا۔ صابر علی نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ وہ ...ہی اندر کٹ کر رہ گیا۔ یار ایک دو روز کا مہمان تھا اور وہ تھا کہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"افتخار! تو فکر نہ کر...... سب ٹھیک ہو جائے گا......" وہ کھوکھلے انداز میں اس کو تسلی دیتا۔

"میں اب زندہ نہیں بچوں گا۔" افتخار کو یقین ہو چلا تھا۔

"ایسے بول منہ سے نہ نکال...... اللہ لمبی حیاتی دے گا تجھے۔" وہ سچ مچ تڑپ اٹھتا۔

"میری...... میری شام روپ رل جائے گی صابر علی......" وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر رو دیتا۔

"ارے میں ہوں نا...... اس کا چاچا...... وہ میری بیٹیوں جیسی ہے۔"

"نہیں ہے وہ تیری بیٹیوں جیسی...... اگر ہوتی تو تو اس کے لئے کچھ کرتا۔ مگر تو اس کے لئے ...نہیں کرے گا۔ تو کچھ نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں...... مجھے پتا ہے میری بچی...... میری معصوم ...ی......"

وہ تکیے پر سر پٹخ پٹخ کر رو دیا تو صابر علی سے سہا نہ گیا...... اسی وقت اٹھ کر وہ ماسٹر محسن کی بیٹھک میں چلا آیا۔ چند لمحے سوچ بچار کے بعد اس نے صاف اور سیدھی بات کی تھی۔

"دیکھ اس گاؤں میں اس وقت کوئی ایسا نہیں جو اس کی مدد کر سکے۔ میرا اپنا بیٹا موجود ہے مگر ماسٹر محسن تو جانتا ہے ہم لوگ پشتوں سے اس گاؤں کے رہنے والے...... باپ دادا کی قبریں یہاں ہیں...... گاؤں چھوڑ کر جائیں تو کہاں...... یہاں اپنی زمینیں ہیں کھیتی باڑی ہے...... اور تم ہو باہر کے آدمی...... کسی کے گھر میں رہ رہے ہو۔ آج نہیں تو کل اپنی بدلی کروا کر شہر میں نوکری کر سکتے ہو۔ آگے پیچھے تمہارے کوئی نہیں...... گھر بس جائے گا...... اور یتیم بچی کو سہارا دے کر ثواب بھی کماؤ گے۔ اس کے باپ کا کوئی بھروسہ نہیں...... آج ہے کل نہیں......" صابر علی اپنے دوست کے لئے آبدیدہ ہو گیا تھا۔

ماسٹر محسن ایف اے، سی۔ ٹی پاس...... یتیم خانے سے نکلا ہوا ایک بھلا مانس انسان کتنی ہی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تب ہی شام روپ بھاگی چلی آئی تھی۔ اپنی میلی سی اوڑھنی میں لپٹی لپٹائی...... صابر علی کو تلاش کرتی ہوئی۔

"صابر چاچا! ابا...... ابا تمہیں بلا رہے ہیں......" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا تھا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑی تھی جب ماسٹر محسن نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ سانولی سلونی کھیتوں میں اترتی سرمئی شام کی طرح اداس، بے کل، بڑی بڑی سیاہ گھور آنکھوں میں تیرتی ناامیدی...... کچھ چھن جانے کا خوف...... ماسٹر محسن نے دروازے سے باہر نکلتے صابر علی کا بازو تھام کر روکا تھا۔

"مجھے منظور ہے۔" اور اسی رات صابر علی ماسٹر محسن کے ساتھ افتخار کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

"یہ شام روپ کو اپنی عزت بنانے آیا ہے۔"

اس نے جھک کر افتخار کے کان میں سرگوشی کی تھی اور افتخار کی بیمار آنکھوں میں ایک دم چمک بھر گئی تھی۔ اس نے اپنی جمع پونجی نکال کر شام روپ کے حوالے کی تھی اسے جی بھر کے پیار کیا تھا اور محسن کو اپنے اعتبار کا واسطہ دیتے ہوئے شام روپ کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے انہیں ڈھیروں دعاؤں کے سائے تلے رخصت کر دیا تھا۔

صابر علی انہیں ساتھ لے کر شہر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ مسجد میں ان کا نکاح پڑھوا کر انہیں شہر کی طرف روانہ کر کے خود گاؤں چلا آیا تھا اور دو روز بعد ماسٹر محسن نے آ کر اپنی اور شام روپ کی خیریت کی اطلاع افتخار تک پہنچائی تو اس نے بڑے سکون سے آنکھیں موند لی تھیں اور اپنی آخری آرام گاہ

پہنچا تھا۔ محسن نے شہر میں کرائے کا مکان لے لیا تھا اور کچھ روز بعد بدلی کروا کر خود بھی گاؤں سے گیا تھا۔ پھر کئی سال تک ان دونوں کی کوئی خبر نہیں آئی تھی......" دروازہ پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ صابر علی بری طرح چونک کر مڑا اور پھر تیزی سے چلتے ہوئے دروازے تک پہنچا۔

"کون......؟"

"میں...... بشیراں......" سرگوشی میں آواز آئی تھی۔ صابر علی نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ تو بشیراں اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے واپس پلٹی تھی۔ صابر علی نے احتیاطاً باہر گھپ اندھیرے میں جھانکا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا شام روپ کے گھر میں داخل ہو گیا اور ابھی وہ دروازے کی کنڈی چڑھا کر پلٹا ہی تھا جب بشیراں کپڑے میں لپٹی کوئی چیز اٹھا کر اس کے سامنے آ کھڑی تھی۔ صابر علی نے چونکتے ہوئے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو بشیراں نے گہری سانس لیتے ہوئے بغیر کچھ کہے نظریں جھکا دی تھیں۔ کمرے سے شام روپ کی گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔



"لو ماسٹر محسن...... آج رب نے تیری آخری نشانی بھی مجھ سے چھین لی۔ اور اگر وہ میرے سامنے آ جائے تو پوچھوں کہ اس بھری دنیا میں وہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کرتا ہے......؟ ماں خود مجھے چھوڑ گئی تھی۔ باپ میری ماں کے غم میں اس دنیا سے چل بسا۔ شوہر نے محبت دی، چاہت سے نوازا، خوشیوں سے جھولی بھر دی اور جب بڑی دعاؤں اور منتوں مرادوں کے ساتھ میں اسے خوشی دینے کے قابل ہوئی تو اللہ نے اسے بھی چھین لیا...... آہ...... کیسے دن تھے وہ بھی...... مہکتے ہوئے...... چاند تاروں کی روشنیوں سے چمکدار۔"

اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے آہ بھری...... بیتے ہوئے دن خوش رنگ تتلیوں کی طرح اس کے آس پاس منڈلانے لگے تھے۔

بہت چھوٹا سا آنگن تھا جس میں بس وہ دونوں رہا کرتے تھے۔ شام کو کچے صحن میں پانی چھڑک کر وہ پنکھا چلا دیتی تو سارا گھر موگرے اور چنبیلی کی کلیوں سے مہکنے لگتا تھا۔ منڈیروں پر ایسی پیاری شام اترتی تھی ان دنوں جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ کھری چارپائی پر لیٹ کر خالی آسمان کو تکتے ہوئے وہ ہر شام محسن کا انتظار کیا کرتی۔ چھوٹا سا ریڈیو اپنے سرہانے رکھ چھوڑتی کبھی گانے سننے لگتی اور کبھی کوئل بن کر خود ہی پی کو پکارنے لگتی اور پھر جب دروازے کے باہر سائیکل کی گھنٹی بجتی تو وہ لپک جھپک اٹھ کر دروازہ کھول دیتی۔ محسن کا ہنستا ہوا چاند سا چہرہ نظر آتا تو پھر

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا نہ ہوتی اور وہ شام کو کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتا تھا۔ کبھی مٹھائی ...... کبھی
پھل ...... کبھی سموسے...... وہ سدا کا فٹ پاتھ اور دکانوں کے تھڑوں پر سونے والا۔ کبھی اس کے گھر
...... بھی اس کے گھر روکھی سوکھی کھانے والا ...... گھر گرہستی کا سکون ملا تو اس کا اور اپنے رب کا شکر
ادا کرتے نہ تھکتا۔

"مجھے تو جنت بھی یہیں مل گئی ہے اور جنت کی حور بھی۔" وہ کہتا اور یہ شرماتے نہ تھکتی اور ہنستی۔

ایک روز جب اس نے چادر کے پو میں منہ چھپاتے ہوئے اسے اپنی گود بھرنے کی خوشخبری سنائی تھی
تو وہ جیسے خوشی سے دیوانہ ہو گیا تھا اور اگلے روز وہ اس کے لئے ایک نیا سوٹ لانے کا وعدہ کر کے گیا
وہ آنکھوں میں کاجل لگائے ...... کلائیوں میں چوڑیاں بھرے اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی
تب وہ آیا تھا۔ لہو میں ڈوبا ...... زخموں سے چور...... آنکھیں بند کئے...... سانس روکے...... اور شام
روپ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی...... ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کائنات گردش کرتے کرتے تھم گئی
تھی اور اس نے سوچا تھا۔

"زندگی بس یہیں پہ ختم ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں ہوگا......" مگر زندگی نہیں ہوئی تھی۔ جاری
وساری رہی تھی۔ اس کی سانس آتی جاتی رہی۔ بھوک، پیاس اپنا احساس دلانے لگی، تب اسے معلوم
ہوا کہ زندگی کو جینا پڑے گا۔ جب تک یہ ہے...... مگر جینے کی کوئی صورت تو نظر نہ آتی تھی۔

مکان کرائے کا...... اجنبی لوگ ...... انجان شہر...... کچھ بھی تو اپنا نہ تھا...... بس ایک راستہ جانا
پہچانا تھا۔ آنکھیں بند کر کے اسی پہ قدم رکھ دیئے مگر جب راستہ اپنے اختیار کو پہنچا تو معلوم ہوا اپنا تو
یہاں بھی کچھ نہیں......

غیریت ہی غیریت...... حد درجہ اجنبیت......
کسی بزرگ نے ڈپٹ کر نہ پوچھا۔ "کہاں گئی تھی......؟"
کسی سہیلی نے رازداری کا وعدہ دے کر اس کا دکھ نہ بانٹا۔

بس کوڑے برسائے...... تیر کھینچ مارے...... اسے راہ میں آنے والا پتھر سمجھ لیا...... جدھر دل
چاہا ٹھوکر لگا دی۔

"اور کوئی مجھ سے پوچھتا تو سہی...... ٹوہ لگانے کے لئے نہیں...... درد بٹانے کے لئے تو پھر
میں بتاتی شوہر کے ساتھ گئی تھی۔ باپ کی رضا شامل تھی اس میں...... چودھری بختیار سے بچانا چاہا تھا
اس نے مجھے ...... پر کسی نے پوچھا ہی نہیں...... صرف سزا سنا دی۔"

وہ روتے روتے بے حال ہو جاتی اور جب وجود سے پھوٹتی خوشبو نے اسے دوسرا ہٹ کا

...... کبھی دلایا تو اس کا دل چاہا وہ سب کو بتائے...... اپنی خوشی میں شریک کرے مگر کس کو......؟ وہ تنہا
اس کے گھر میں پڑی دیوانوں کی طرح چھت کی کڑیاں گنتی رہتی اور پھر کچھ اور نہ سوجھا تو اسی کو اپنا
رب کا شکر بنا لیا جو ابھی اس دنیا میں آیا ہی نہ تھا۔ رات کے جس پہر بھی اس کی آنکھ کھلتی وہ اس سے
باتیں کرنے لگتی۔ اسی کے ساتھ ہنستی روتی، سسکتی، اپنا دکھ سکھ کہتی اور پھر اس کے تسلی بھرے

"مجھے پتا ہے تو آئے گا۔ مجھے سہارا دے گا۔ میرے لئے سب کے سامنے ڈٹ جائے گا۔"
بڑا مان تھا آنے والے پر...... بڑا غرور تھا...... بڑی امید تھی...... بہت انتظار تھا مگر پھر ہوا
......؟ اس کی خالی آنکھیں کچے صحن کے آخری کونے میں پڑی مٹی کی ڈھیری کو چھونے لگیں۔
"تو نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔ اپنی ماں کا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔ یہ بھی نہیں
کہ تیری ماں نے تیرے لئے کیا کچھ رکھ چھوڑا ہے۔ میں نے اس قبر جیسی کوٹھڑی کو تیرے لئے
بنایا تھا لوگوں کے گھروں میں چکی پیسی تھی۔ اپلے تھاپے تھے...... بوجھ اٹھائے تھے...... دھوپ
ہی تھی صرف تیرے لئے...... کہ تو دنیا میں آئے تو تیرا واسطہ بھوک سے نہ پڑے...... میں نے
لئے کپڑے بنائے ننھے منے...... چھوٹے چھوٹے ...... اور چاندی کے گھنگھروؤں والے
...... جو تیری نازک کلائیوں میں پڑتے تو ہر وقت کھنک کھنک کر تجھے ہنساتے رہیں۔ یہ
تیری چہکاروں سے گونجتی رہے۔ پر تو نے ماں کی کوئی آس پوری نہیں کی۔ تو کیوں دلاسے
تھا۔ جھوٹے سچے وعدے کیوں کئے تھے اپنے باپ کی طرح جو کہتا تھا عمر بھر تیرا ساتھ نہیں
وں گا۔ بڑا بے درد نکلا تو بھی...... باپ کے بغیر دل نہیں لگا تیرا...... پہنچ گیا نا اس کے پاس......
ماں کے بغیر رہ لے گا......؟"

اس نے شکوہ کناں آنکھوں سے مٹی کی اس ڈھیری کو دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی
تک آ گئی اور بڑے پیار سے ہاتھ پھیر پھیر کر اسے ہموار کرنے لگی۔

"پر اچھا ہی ہوا...... تو اس دنیا میں نہیں آیا...... اگر آ بھی جاتا تو یہ لوگ تجھے جینے تھوڑی
...... بڑے ظالم لوگ ہیں بڑے ہی ظالم...... جینے نہیں دیتے......" وہ رونا چاہ رہی تھی مگر
یں بالکل خشک تھیں۔

"تو ماں کی پروا مت کرنا...... رہ لے گی تیرے بغیر...... اسے عادت ہو گئی ہے نا تنہائی کی......
ایک کا ہاتھ تھامنے کی کبھی دوسرے کا...... اب بھی کوئی نہ کوئی آسرا مل ہی جائے گا۔ نہیں تو اپنا
تھام کر چل دوں گی کہ زندگی تو بتانی ہی پڑے گی نا...... جیسی بھی ہے......"

وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور نجانے کتنے دنوں سے بند دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی...... آتے جاتے چندلوگوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے یوں سرتا پا دیکھا تھا گویا وہ کوئی بدروح ہو...... بھلا یہ وہ پہلی سی شام روپ کب تھی؟ جو ہمیشہ سر جھکائے...... ڈری سی اپنی میلی اوڑھنی میں چھپی باہر نکلتی تھی اور ہوا کی طرح قریب سے گزر جایا کرتی تھی اور آج کے انداز میں ایسی لاپروائی، ایسی بے زاری تھی کہ دوپٹے کا پلو جو سر پہ تھا سو تھا باقی قدموں سے جا رہا تھا۔ بالوں کی بکھری ہوئی لٹیں...... زرد چہرہ اور اس پر بکھری بے نیازی رعونت یوں جیسے سب کچھ کھو کر انسان سرتا پا صبر بن گیا ہو۔ یوں جیسے اب کوئی چیز اس کے جذبات واحساسات پہ اثر کرنے والی نہ ہو۔

''ارے...... یہ شام روپ جھلی تو نہیں ہوگی......'' قریب سے گزرتی عورتیں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ وہ چپ چاپ اپنے پیروں سے دھول اڑھاتی، بازو پہلو میں لٹکائے چلی جا رہی تھی۔ جب کیکر کے پیڑ تلے اس نے بہت سے لوگوں کو جمع دیکھا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان کانوں کو ہاتھ لگاتے، توبہ استغفار پڑھتے۔ وہ یونہی چلتی ہوئی ان تک آ گئی۔

''قیامت کے آثار ہیں قیامت کے......''

''حد ہوگئی بے غیرتی کی......اب اس سے زیادہ ہم برداشت نہیں کریں گے۔''

''ارے میں کہتا ہوں اس کا منہ کالا کر کے گاؤں سے نکال باہر کریں......؟''

''ہرگز نہیں......اسے تو بیچ چوپال میں پتھر مارنے چاہئیں۔''

''مجھے نظر آ جائے تو میں بھی ابھی گولی سے اڑا دوں۔''

اپنی اپنی زبانیں...... اپنی اپنی غیرت وحمیت کا مظاہرہ...... وہ ان کھوکھلی آوازوں سے بے پرواہ ہو کر آگے بڑھی۔

''ارے...... ارے یہ دیکھو بدبخت...... بدکردار...... سارا کیا دھرا اسی کلوکا ہے۔ کیوں ری بے غیرت یہ کیا گل کھلایا ہے تو نے......'' کسی نے بازو سے گھسیٹ کر اسے بیچ ہجوم میں دھکا دیا تو سہار نہ پائی لڑکھڑا کر گر گئی تو بڑا سا کیکر کا کانٹا ہاتھ میں گھستا چلا گیا...... تکلیف کا احساس تک نہ ہوا کہ یہاں تو اس سے بڑھ کر تیکھے اور نوکیلے نشتروں نے اسے لہولہان کیا جا رہا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کانٹے کو باہر کھینچتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کرنے کے بعد کھولیں تو سب سے پہلے جو چیز اسے نظر آئی تھی اس نے اسے دنیا جہان کی حیرت میں غرق کر دیا تھا۔

کپڑے میں لپٹا نومولود بچہ...... سرخ وسپید رنگت والا...... سیاہ بال...... آنکھیں بند مگر رو رو کر

ہوئیں۔ اس کی آواز روتے روتے جیسے بند ہوگئی تھی اور اب وہ نیم جان سا سر ایک طرف پڑا تھا۔ یوں جیسے اس پوری کائنات سے ناراض ہو چلا ہو۔ کبھی کبھار اس کے جسم میں حرکت ہوتی اس کی ایڑیاں زمین پر گھسٹنے لگتیں...... وہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی بچے تک آئی...... جو نجانے کس وقت سے یونہی بے یارومددگار پڑا تھا۔ اس کے نرم روئی سے بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ ایک چیونٹی ٹانگ سے بری طرح چپکی ہوئی تھی۔

''ہاں صدقے......'' اس کے دل کو جیسے ہزاروں چیونٹیوں نے ایک ساتھ کاٹنا شروع کیا تھا۔ خون میں لتھڑی انگلیوں کو اپنی اوڑھنی سے صاف کر کے اس نے بچے کے شفاف بدن سے چیونٹی پکڑ کر کے مسلتے ہوئے سر اٹھا کر اس ہجوم کو دیکھا تھا جو اس پر پل پڑنے کے لئے تیار تھا۔ چیختے دھاڑتے ہوئے لوگ...... باچھوں سے کف اڑاتے...... گالیاں بکتے......

''عزت کے دعویدار...... غیرت کے ٹھیکے دار...... ارے تم میں کوئی انسان بھی ہے کہ نہیں؟'' آنکھوں کی حیرت بے یقینی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔

''میں نے پہلے دن ہی کہا تھا مگر مولوی صاحب...... میں آج ہی پنچایت بلاتا ہوں......'' چودھری بختیار سب سے آگے تھا۔ شام روپ نے جیسے کان بند کر لئے۔ وہ ایک انچ آگے سرکی...... جھکی اور پھر ایک لمحے کے لئے چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر چودھری بختیار کو دیکھا اور کر مسکرا دی۔

''ارے ڈھٹائی دیکھو اس کی...... میں کہتا ہوں کوئی کچھ کرتا کیوں نہیں...... جوتے لگاؤ اس کو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے......'' کسی نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مگر اس نے آرام سے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور بچے کو اٹھا کر گود میں لے لیا۔ آگ اگلتی زبانوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چودھری کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ کو ایک دم جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''یہ کیا کرنے جا رہی ہے۔'' کوئی سرگوشی ابھری تھی۔

''ایک بات تو بتاؤ چودھری......؟'' شام روپ کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ جس نے کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔

''تیری بیٹی ثریا بڑے دنوں سے نظر نہیں آ رہی......؟''

''کیا مطلب......؟''

''کہاں گئی ہے وہ......'' اس نے دوبارہ پوچھ لیا۔ چودھری اس غیر متوقع سوال پر الجھا الجھا سا

کھڑا تھا۔

'' وہ اپنی خالہ کے گھر رہنے گئی ہے نا......'' شام روپ اس کے بے حد نزدیک آ گئی تھی۔

'' ہاں گئی ہے...... تو پھر......؟'' چودھری بختیار اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

'' مجھے معلوم تھا...... چودھرائن نے تجھے یہ ہی بتایا ہے اور سب گاؤں والوں کو بھی۔
اب میری ایک بات مان...... ذرا گھر جا...... اور اپنی چودھرائن سے پوچھ کہ حویلی کی سب سے آ
کوٹھڑی میں پچھلے کئی مہینوں سے تالا کیوں پڑا ہے؟ وہاں صبح و شام روٹی پانی کس کے لئے جاتا
اور یہ بھی پوچھنا کہ چودھرائن کے ہاتھوں میں پہنی سونے کی دو چوڑیاں زلیخاں دائی کے ہاتھ
کیسے پہنچ گئیں......؟''

شام روپ کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی مگر اس سرگوشی میں ایک غراہٹ تھی۔ ایسی انتقام بھری
غراہٹ کہ جس نے چودھری کے بدن کا سارا لہو نچوڑ لیا تھا اور جو اتنی دھیمی تھی کہ چودھری کے
کوئی اور نہ سن سکا تھا۔

دیکھنے والوں نے تو بس یہ دیکھا کہ چودھری بختیار کے چہرے پہ پسینے کی دھاریں بہنے
لگیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پلٹا تھا مگر شام روپ کی تحکم بھری آواز نے اس کے قدم روک دیئے تھے۔

'' ایک اور بات سنتا جا چودھری بختیار...... اور یاد رکھ لے کر ہر بار چور چوری کے لئے نہیں
جاتا، کبھی کبھار مال خود بخود چور کے پاس جا پہنچتا ہے...... دروازے کھلے ہوں تو حویلی کی او
دیواروں پر نقب لگانے کی کوشش کون کرتا...... یہ لے جا......'' شام روپ نے سینے سے لپٹا کپڑا
نکال کر چودھری کے منہ پہ دے مارا تھا۔

'' یہ لے جا اور چودھرائن کو دے دینا...... شاید وہ یہ کپڑا مجھے دینا بھول گئی تھی۔'' اس کے کاٹ
دار لہجے نے چودھری بختیار کے جسم سے روح نکال کر اسے بے جان کر گیا تھا اور کچھ دیر بعد ہکا بکا
کھڑے لوگوں نے چودھری بختیار کو گرتے پڑتے حویلی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

شام روپ بچے کو اپنی اوڑھنی میں لپٹائے سیدھی مولوی صاحب کے پاس چلی آئی تھی۔

'' اس کے کان میں اذان دے دیں مولوی جی۔''

مولوی صاحب نے ایک کڑی نظر اس پر اور دوسری بچے پر ڈالی تھی۔

'' یہ بچہ میرا نہیں ہے مولوی جی...... معلوم نہیں کس کا ہے...... اس کے باپ کا نام معلوم ہوتا تو
یہ اس طرح بے یار و مددگار کیکر تلے پڑا اپنی قسمت کو نہ رو رہا ہوتا...... یہ بھی کسی گھر کی رونق ہوتا......
جیسے میرے گھر میں رونق ہو گئی ہے۔ میرا بچہ مٹی کی ڈھیری کی صورت ہی سہی میرے آنگن میں تو ہے۔

جی...... کسی کیکر تلے...... کسی کوڑے کے ڈھیر پہ تو نہیں پڑا تا...... اس بچے کی طرح......'' اس
بے ریا آنکھوں سے مولوی صاحب کو دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بچہ
میں لے لیا...... وہ بچے کو اذان سنانے کے لئے تیار تھے۔



شام روپ گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو بچہ بے ترتیب سے سانس لے رہا تھا۔
نے تاکید کی تھی '' یہ بھوک سے مر جائے گا...... اسے فوراً کچھ پلا دو......''
مگر اس نے آ کر بڑے اطمینان سے اسے اندر چارپائی پہ لٹایا تھا۔ الماری سے برتن نکال کر
پیالہ بھر کر رکھے ہوئے شہد میں انگلی ڈبوئی تھی اور بچے کو چٹا کر باہر نکل آئی تھی۔ نلکا چلا کر پانی
بھری تھی اور مٹی کی ڈھیری پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگی تھی۔ آنگن میں لگے درخت کی ٹہنیوں
پتے اتار کر اس ننھی سی قبر پر ڈالتے ہوئے اس کے لبوں سے آہ نکلی تھی اور حسرت بھری
اپنے دودھ بھرے پستانوں پر جم گئی تھیں۔ تب ہی کمرے سے رونے کرلانے کی مہین سی آواز
اپنے گھر میں بچے کی پہلی آواز......
جیسے کسی اجڑے نگر میں کوئی دیا روشن ہو گیا ہو۔ کتنا ترسی تھی وہ اس آواز کو سننے کے لئے۔ اس
میں بیقراری سی بھر گئی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ کمرے میں گئی اور اس نرم کومل پھول
کو ہاتھوں میں لے کر باہر آ گئی۔ اسے بڑی احتیاط سے ہاتھوں میں تھاما۔ ہاتھ کا چلو بنا بنا کر
کے بدن پہ ڈالا...... مٹی چھڑائی نہلایا دھلایا...... صاف ستھرا کیا...... بچہ رو رو کر بے حال ہوتا
ہنستے ہنستے روتی رہی۔ نہلانے کے بعد ٹرنک میں سے سفید براق تولیہ نکال کر بچے کو اس میں
اس کے بدن پہ خوشبودار پاؤڈر چھڑکا...... کلائیوں میں چاندی کے کنگن چڑھائے...... اسے
لٹا کر خود وضو کر کے آئی اور پھر چارپائی پہ بیٹھ کر بڑے اہتمام سے اسے گود میں لیا تھا۔
رو لے...... جی بھر کے رو لے...... اب تو میرے پاس جو آ گیا ہے...... مجھ ہی سے لاڈ
انا ساری عمر...... چل فکر نہ کر...... سارے لاڈ پورے کروں گی تیرے...... پورے کرنے
گے۔ تو اس دنیا میں آیا ہی بس میرے لئے ہے۔ تیرے جننے والے تو کبھی پلٹ کر تجھے
گے بھی نہیں...... لیکن پریشان نہ ہو...... میں ہوں نا تیرے لئے...... تجھے پیار کرنے کے
تجھے دودھ پلانے کے لئے، اس نے اپنی قمیض اٹھائی۔ عین اسی لمحے جیسے کوئی صحن کے
نے سے ہلکا تھا۔

''یوں مت ستا مجھے ...... میں کوئی تجھے بھولنے والی تھوڑی ہوں...... یاد رکھوں
کبھی نہ بھولوں گی تجھے ......کبھی نہ بھولوں گی......''

اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ بہتے آنسوؤں کو روکنے کے
اپنی توجہ گود میں پڑے بچے کی طرف مبذول کی تھی جو بڑے استحقاق سے اپنا خالی پیٹ
ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں بھی ہلا رہا تھا اور اس کے کڑوں میں لگے چاندی کے گھنگھروؤں
کوٹھڑی کی خالی فضاء بھرتی جا رہی تھی۔ شام روپ نے گہری سانس لیتے ہوئے پیار
سے بچے کو دیکھا تھا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگاتے ہوئے اس کے معصوم لمس
ہونے لگی تھی۔

(تمت بالخیر)